مرکز برائے فاصلاتی و آنلائن تعلیم، یونیورسٹی آف جموں، جموں

کلاس ایم۔اے

سمسٹر اول

مضمون : قصیدہ اور مرثیہ

کورس نمبر : 104

یونٹ : I-IV

سبق : 1-14

پروفیسر (ڈاکٹر) شہاب عنایت ملک

کورس کوآرڈی نیٹر، ایم اے اردو، سی،ڈی،او،ای

صدر شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں

ڈاکٹر پرشوتم پال سنگھ اسسٹنٹ پروفیسر

انچارج ٹیچر، اردو

سی،ڈی،او،ای، جموں یونیورسٹی، جموں

© جملہ حقوق محفوظ ہیں۔اس کتاب کا کوئی حصہ کسی شکل میں جموں یونیورسٹی کی تحریری اجازت کے بغیر شائع نہ کیا جائے۔

مضمون نگار:

1۔ **ڈاکٹر چمن لال بھگت**

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو جموں یونیورسٹی

2۔ **ڈاکٹر پرشوتم پال سنگھ اسسٹنٹ پروفیسر**

انچارج ٹیچر، اردو، سی، ڈی، او، ای، جموں یونیورسٹی، جموں۔

اڈیٹنگ / پروف ریڈنگ:۔

ڈاکٹر پرشوتم پال سنگھ

انچارج ٹیچر، اردو، سی، ڈی، او، ای، جموں یونیورسٹی، جموں۔

استقبالیہ پیغام

عزیز متعلّم!

میں آپ کا خیر مقدم ہے۔ سمسٹر اول کے کورس ''قصیدہ اور مرثیہ

یہ کورس اردو شاعری کی دو اہم اصناف قصیدہ اور مرثیہ کے جامع مطالعے کے لیے مرتب کیا گیا ہے۔ اس کے ذریعے آپ قصیدے کا تاریخی پس منظر اور فن، اردو قصیدے کے آغاز و ارتقا، اس کے اہم شعرا اور اردو قصیدے کے زوال کے اسباب سے واقف ہوں گے۔ بالخصوص سودا اور ذوق کی قصیدہ نگاری اور ان کے منتخب قصائد کے متنی مطالعے کے ذریعے اس صنف کے فنی و فکری امتیازات کو سمجھنے کا موقع ملے گا۔ کورس کے دوسرے حصے میں مرثیے کا تاریخی پس منظر اور فن، جنوبی ہند اور شمالی ہند میں اردو مرثیے کی روایت، اردو مرثیے کا سنہری دور، انیس و دبیر، شخصی مرثیے کے آغاز و ارتقا اور مرثیے کے زوال کے اسباب کا مطالعہ شامل ہے۔ اس کے ساتھ منتخب مراثی کے متنی مطالعے کے ذریعے آپ مرثیہ نگاری کی فنی خصوصیات، اسلوب اور ادبی اہمیت کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔

ہمیں امید ہے کہ اس کتاب کا بغور مطالعہ آپ کو قصیدہ اور مرثیہ کی تاریخی روایت، فنی خصوصیات اور اردو شاعری میں ان دونوں اصناف کے مقام و مرتبے کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوگا۔ آپ اسباق کو غور و فکر کے ساتھ پڑھیں، سرگرمیوں میں حصہ لیں اور مزید معلومات اور گہرے مطالعے کے لیے کتاب کے آخر میں موجود متعلقہ کتب سے بھی رجوع کریں۔

آپ کی علمی ترقی اور کامیابی کے لیے نیک خواہشات۔

ڈاکٹر پرشوتم پال سنگھ
اسسٹنٹ پروفیسر، اردو
مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم
جموں یونیورسٹی، جموں

Syllabus and Courses of Study in the Subject of Urdu under NON-CBCS Scheme (CDOE)

SEMESTER- I

COURSE CODE URD - 104

Examination to be held in May 2026,2027

Title : Qasida and Marsia قصیدہ اور مرثیہ
Duration of Examination: 2:30 hours

Credits: 4
Maximum Marks : 100
(a) Semester Exam: 70
(b) Internal Assessment :30

Objectives:

The purpose of this Course is not only to acquaint the students with the meaning of the genres concerned but also their thematic and formative development.

Syllabus shall be divided in 4 Units viz, Unit-I, Unit-II, Unit-III and Unit-IV. Unit-I and Unit-II shall deal with the criticism of the genres prescribed viz. Qasida and Marsia and Unit-III and IV shall deal with the textual study.

Unit wise detail of the syllabus is as under: -

Unit-I

۱۔ قصیدے کا تاریخی پس منظر اور فن

۲۔ اُردو قصیدے کا آغاز و ارتقاء

۳۔ اُردو قصیدے کے ارتقاء میں سودا اور ذوق کی خدمات

۴۔ اُردو قصیدے کے زوال کے اسباب

Unit-II

متن کی تدریس

۱۔ سودا۔ آیا عمل میں تیغ سے تیری وہ کارزار

۲۔ ذوق۔ واہ واہ کیا معتدل ہے باغِ عالم میں ہوا

Unit - III

۱۔ مرثیہ کا تاریخی پس منظر اور فن

۲۔ جنوبی ہند میں اُردو مرثیہ

۳۔ شمالی ہند میں اُردو مرثیہ

۴۔ اُردو مرثیے کا سنہری دور (انیس و دبیر کے حوالے سے)

۵۔ شخصی مرثیہ: تعریف، آغاز و ارتقاء

۶۔ مرثیے کے زوال کے اسباب

Unit - IV

متن کی تدریس

۱۔ انیس۔ بخدا فارسِ میدانِ تہور تھا حُر (ابتدائی پچاس بند)

۲۔ دبیر۔ کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے (ابتدائی پچاس بند)

Internal Assessment carry 30% marks in each course. The format of the Internal Assessment Assignments is given below:

There will be two Internal Assessments.

ASSIGNMENT 1: Long Answer Questions

Out of the two questions Given, the learner hass to attempt any one question in 800-1000 words. (15 marks)

Assignment 2: Short Answer Questions

the learner has to attempt all the two questions. Words Limt 350-450 words. (7.5x2=15)

Mode Of Examination:-

There Are four units in the course No:-104

Mode of the examination:-The term end examination shall carry 70% marks in each course the format of the question paper is given below.

Term End Examination would be of 70 marks. Two short type questions from Unit I and II having 7 marks each be asked. Two descriptive type questions from Unit III and IV of 14 marks each be asked. Two short type questions from Unit III and IV having 7 marks each be asked. 14 objectives type questions of 14 marks carrying 1 mark each be also asked from Unit III and IV.

امدادی کُتب Books Prescribed

۱۔ انتخابِ مراثی (انیس و دبیر)۔ مرتبہ رشید حسن خان۔ از مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ۔ دہلی

۲۔ انتخابِ قصائدِ اُردو۔ از ڈاکٹر ابو محمد سحر

۳۔ انتخابِ قصائد و مراثی۔ سودا، ذوق، انیس اور دبیر۔ ڈاکٹر چمن لعل بھگت۔ قاسمی کتب خانہ جموں

۴۔ اُردو میں قصیدہ نگاری۔ از ابو محمد سحر

۵۔ اُردو میں قصیدہ نگاری کی روایت۔ از محمود الٰہی

۶۔ موازانہ انیس و بیر از شبلی نعمانی

۷۔ اردو مرثیہ کا ارتقا۔ از ڈاکٹر مسیح الزمان۔

۸۔ اُردو قصیدہ نگاری۔ اُم ہانی اشرف

۹۔ اُردو مرثیہ نگاری۔ اُم ہانی اشرف

۱۰۔ انتخاب قصائد و مراثی مع فرہنگ (سودا، ذوق، انیس، دبیر)۔ ڈاکٹر چمن لال

فہرست

Unit-I

۱۔ قصیدے کا تاریخی پس منظر اور فن ______ 7

۲۔ اُردو قصیدے کا آغاز و ارتقاء ______ 25

۳۔ اُردو قصیدے کے ارتقاء میں سودا اور ذوق کی خدمات ______ 37

۴۔ اُردو قصیدے کے زوال کے اسباب ______ 53

Unit-II

متن کی تدریس

۵۔ سودا۔ آیا عمل میں تیغ سے تیری وہ کارزار ______ 62

۶۔ ذوق۔ واہ واہ کیا معتدل ہے باغِ عالم میں ہوا ______ 85

Unit - III

۷۔ مرثیہ کا تاریخی پس منظر اور فن ______ 109

۸۔ جنوبی ہند میں اُردو مرثیہ ______ 120

۹۔ شمالی ہند میں اُردو مرثیہ ______ 129

۱۰۔ اُردو مرثیے کا سنہری دور (انیس و دبیر کے حوالے سے) ______ 140

۱۱۔ شخصی مرثیہ: تعریف، آغاز وارتقاء ______ 151

۱۲۔ مرثیے کے زوال کے اسباب ______ 171

Unit - IV

متن کی تدریس

۱۳۔ انیس۔ بخدا فارسِ میدان تہور تھا حُر (ابتدائی پچاس بند) ______ 186

۱۴۔ دبیر۔ کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے (ابتدائی پچاس بند) ______ 220

سبق نمبر ا۔ قصیدے کا تاریخی پس منظر اور فن

ساخت

1.0: اغراض ومقاصد

1.1: تعارف

1.2: قصیدے کا فن

1.2.1: قصیدے کا تاریخی پس منظر

1.2.2: سرگرمی (آو! اپنی معلومات کو جانچیں)

1.3: عمومی جائزہ

1.4: آپ نے کیا سیکھا؟

1.5: فرہنگ

1.6: خود جانچ سوالات

1.7: مشقی سوالات

1.8: جواباتِ سرگرمی

1.8.1: مشقی سوالات کے جوابات

1.9: امدادی کتب

1.0۔اغراض ومقاصد

عزیز طلبہ اس سبق کو پڑھنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

۱۔ آپ قصیدے کی تعریف اور اس کی بنیادی خصوصات کو سمجھ سکیں گے۔

۲۔ آپ قصیدے کے تاریخی پس منظر سے واقف ہو جائیں گے۔

۳۔ آپ یہ جان سکیں گے کہ عربی، فارسی اردو ادب میں قصیدے کی روایت کس طرح پروان چڑھی۔

۴۔ آپ قصیدے کے ادبی اور فنی پہلوؤں کو سمجھنے کے قابل ہو جائیں گے۔

۵۔ آپ یہ بھی جان سکیں گے کہ قصیدہ کن مقاصد کے تحت لکھا جاتا تھا اور اس کا معاشرے سے کیا تعلق تھا۔

۶۔ آپ قصدے کے اہم اجزاء اور اندازِ بیان کو پہچان سکیں گے۔

۷۔ آپ اردو ادب میں قصیدہ نگاری کی اہمت اور اس کے ادبی مقام کو سمجھ سکیں گے۔

اس طرح یہ سبق آپ کو قصیدہ اور اس کے فن کے بارے میں بنیادی اور ضروری معلومات فراہم کرے گا ۔

1.1۔تعارف

عزیز طلبہ؛ جب آپ اردو ادب کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری کی مختلف اصناف ہیں، جیسے غزل، نظم، مرثیہ، مثنوی اور قصیدہ۔ ان میں سے قصیدہ اردو شاعری کی ایک قدیم اور اہم صنف ہے جس کی ابتدا عربی ادب سے ہوئی۔ عربی شاعری میں قصیدہ قبیلوں کی تعریف، بہادری کے کارناموں اور بادشاہوں یا سرداروں کی مدح کے لیے کہا جاتا تھا۔ بعد میں یہ صنف فارسی ادب میں داخل ہوئی اور فارسی شاعروں نے اسے مزید فنی خوبصورتی اور وسعت عطا کی۔ فارسی ادب کے اثر سے قصیدہ اردو زبان میں بھی رائج ہوا۔ اردو کے ابتدائی دور میں دکن کے شعرا نے قصیدے کو فروغ دیا، جبکہ بعد میں شمالی ہند کے شعرا نے اسے مزید ترقی دی۔ مرزا رفیع سودا، شیخ ابراہیم ذوق اور غالب جیسے شعرا نے قصیدہ نگاری میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ خاص طور پر مرزا رفیع سودا کو اردو کا عظیم قصیدہ گو شاعر سمجھا جاتا ہے۔ قصیدے کے ذریعے درباری زندگی، معاشرتی حالات اور مختلف شخصیات کی تعریف وتوصیف بیان کی جاتی تھی۔ قصیدہ ایک طویل نظم ہوتی ہے جس میں کسی شخصیت، بادشاہ، سرپرست یا کسی اہم موضوع کی تعریف وتوصیف بیان کی جاتی ہے۔ اس میں شاعر اپنے کمالِ فن، زبان کی

خوبصورتی، تشبیہات، استعارات اور مبالغہ آرائی کے ذریعے ممدوح کی شان بیان کرتا ہے۔

قصیدے کی ساخت عام طور پر مختلف حصوں پر مشتمل ہوتی ہے، جیسے تشبیب یا تمہید جس میں شاعر کسی منظر یا جذباتی کیفیت کا ذکر کرتا ہے، گریز جس کے ذریعے اصل موضوع کی طرف آتا ہے، اور مدح جس میں ممدوح کی تعریف بیان کی جاتی ہے۔ آخر میں اکثر دعا بھی شامل ہوتی ہے۔ اس طرح قصیدہ نہ صرف مدحیہ شاعری کی ایک اہم صنف ہے بلکہ اس میں زبان و بیان کی فنی مہارت اور شعری تخلیقی قوت بھی نمایاں طور پر ظاہر ہوتی ہے۔

1.2۔ قصیدے کا فن

عربی زبان کے لفظ ''قصیدہ'' کا اصلی ماخذ ''قصد'' ہے جس کے لغوی معنی ہیں 'ارادہ کرنا'۔ علاوہ ازیں مغز غلیظ یا گاڑھا گودا، موٹی جوان تندرست اونٹنی، راہ راست کا متعین کرنا، عصا، نیزہ پھینکنا وغیرہ بھی قصیدہ کے لغوی معنی مراد لیے جاتے ہیں۔ چنانچہ ان لغوی معنی کی روشنی میں یہ کہنا درست ہے کہ قصیدہ قصداً (ارادے سے) کہا جاتا ہے۔ تمام اصناف سخن میں اسے وہ امتیازی حیثیت حاصل ہے جو انسانی جسم میں دماغ کو ہے۔ اس لحاظ سے اسے مغز سخن بھی تصور کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ غزل جیسی ہر دلعزیز و دلفریب صنف سخن کو اپنی کوکھ سے جنم دینے کا شرف بھی قصیدے کو ہی حاصل ہے۔ قصیدہ فصیح و بلیغ اور پُر مغز یعنی عالمانہ ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا کیونکہ عرب کی سرزمین میں ہوئی اور عرب میں جس طرح اونٹنی سے فائدے (دودھ وغیرہ) اٹھائے جاتے تھے اسی طرح شاعر بھی مدح خوانی کے ذریعے ممدوح سے مال و متاع حاصل کرتا تھا۔ اسی طرح عصا رہنمائی، فضیلت اور بزرگی کی علامت ہے۔ گویا قصیدہ اصلاح و رہنما کا وسیلہ بھی تھا اور قوم پرستی کے جذبہ و جوش کو فروغ دینے کا طفیل بھی۔ اس کے علاوہ شاعر اس کی وساطت سے اپنی جاہ و منزلت کی دھوم بھی مچاتا تھا۔ نیزہ کے معنی چوں کہ قلم کی چھڑ کے بھی ہوتے ہیں۔ لہٰذا نیزہ پھینکنے سے جو ضرب عدو کو پہنچتی ہے وہی صدمہ مذموم کو بھی ہجو یہ قصیدے سے اٹھانا پڑتا ہے۔

مقبول بیگ بدخشانی کی مرتب کردہ لغت ''فارسی۔ اردو جدید فیروز اللغات'' میں قصیدہ کے معنی یوں درج ہیں:

''وہ نظم جو کسی کی تعریف و توصیف پر مشتمل ہو یا وعظ و نصیحت یا شکایت روزگار وغیرہ سے متعلق ہو۔''

الحاج مولوی فیروز الدین نے اپنی تالیف ''جامع اردو فیروز اللغات'' میں قصیدہ کے معنی کچھ اس طرح دیئے ہیں:

''نظم کی وہ قسم ہے جس میں کسی کی تعریف یا ہجو ہو۔ اس کے پہلے دونوں مصرعوں اور ہر شعر کے آخری مصرع میں قافئے کا التزام ہوتا ہے''

اسی طرح خواجہ الطاف حسین حالؔی نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''مقدمہ شعر وشاعری'' میں قصیدہ کو زندوں کی تعریف سے تعبیر کیا ہے۔ قصہ یہ کہ قصیدے کے مختلف لغوی معنی اور تعریف کے تناظر میں شاید یہ کہنا بجا ہے کہ اصطلاح شاعری میں قصیدہ اس صنف کا نام ہے جس میں کسی کی مدح یا ہجو کے ساتھ ساتھ شہر آشوب کے علاوہ دوسرے مضامین بھی بیان کیے جاتے ہیں۔قصیدے میں آمد (از خود خیال آنا) کے مقابلے میں آورد (تکلف و بناوٹ) کا حصہ زیادہ ہوتا ہے۔محض ان قصائد میں آمد کا عنصر زیادہ ہے جو مذہبی رہنماؤں اور فیاضوں کی تعریف میں لکھے گئے ہیں۔قصیدے کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور بقیہ ہر شعر کا دوسرا مصرعہ بنیادی شعر کے قافیے پر ہی ختم ہوتا ہے۔بعض قصائد کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ وہم ردیف ہوتے ہیں اور اس کے بعد ہر شعر کا دوسرا مصرعہ اسی قافیے و ردیف کا مرہونِ منت ہوتا ہے جس پر قصیدے کی بنیاد رکھی گئی ہوتی ہے۔اگر دیکھا جائے تو قصیدے کے لئے صرف قافیہ ضروری ہے ردیف نہیں۔قصیدے کا بنیادی شعر ''مطلع'' کہلاتا ہے۔مگر کچھ اشعار کے بعد درمیان میں دو یا دو سے زیادہ ''مطالع'' بھی ہوا کرتے ہیں۔دو مطلعے والے قصیدے کو ''ذو مطلعین'' اور متعدد مطلعوں والے قصیدے کو ''ذوالمطالع'' کہا جاتا ہے۔شاعر ابتدائیہ مطلع کے کچھ اشعار بعد بیچ میں اس لئے تازہ مطلع کہتا ہے تاکہ قصیدے میں ایک نیا جوش وولولہ اور لذت ولطف پیدا ہوسکے۔معنوی لحاظ سے قصیدے میں ہر شعر دوسرے شعر سے تعلق رکھتا ہے۔اسی طرح ہیئت کے اعتبار سے بھی قصیدے میں مطلع سے آخری شعر تک ردیف کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔مقطع کے معاملے میں قصیدہ گو آزاد ہوتا ہے۔وہ قصیدے کے درمیان یا آخر جہاں چاہے مقطع استعمال کرسکتا ہے۔قصیدے میں اشعار کی کم از کم اور زیادہ سے زیادہ تعداد کے بارے میں متضاد نظریے ملتے ہیں بقول ابُو محمد سحر:

''قصیدے میں اشعار کی کم سے کم تعداد کسی نے سات، کسی نے بارہ، کسی نے پندرہ، کسی نے بیس، کسی نے اکیس اور کسی نے پچیس بتائی ہے۔زیادہ سے زیادہ اشعار کے لئے عام خیال ہے کہ کوئی حد نہیں، لیکن بعض اہل قلم نے ان کی تعداد سو، ایک سو بیس اور ایک سو ستر لکھی ہے..........سوداؔ کے شاگرد کے ایک ہجویہ قصیدے میں آٹھ سو سے زیادہ اشعار ہیں اور شاطرؔ مدراسی کا قصیدہ ''اعجاز عشق'' ۱۳۹۶۱ اشعار پر مشتمل ہے۔''

(''اردو میں قصیدہ نگاری'' مطبع مقامی پریس لکھنؤ، ۱۹۸۹ء، ص ۱۰۔۱۱)

ڈاکٹر ایم کمال الدین یوں رقمطراز ہیں:

''قصیدہ میں کم از کم تین اشعار کا ہونا ضروری ہے۔زیادہ سے زیادہ کی کوئی قید نہیں۔کم سے کم تعداد کسی نے سات

بتائی ہے۔کسی نے بارہ۔کسی نے پندرہ۔بعضوں نے اس کی تعداد کم از کم تیرہ اور زیادہ سے زیادہ اٹھارہ بتائی ہے۔

کم سے کم تعداد اشعار اکیس اور پچیس بھی مذکور ہے۔‘‘

(’’قصیدہ کا فن اور اردو قصیدہ نگاری‘‘ دربھنگہ بک ہاؤس،۱۹۸۸ء،ص ۱۸)

محمد عبداللہ خان خویشگی ’’فرہنگ عامرہ‘‘ (کاک آفسیٹ پرنٹرس دہلی،۲۰۱۱ء،ص ۴۸۴) میں لکھتے ہیں:

’’پندرہ شعروں سے زیادہ میں کسی کی تعریف‘‘

مندرجہ بالا نظریات کی روشنی میں یہ کہنا برحق ہے کہ قصیدے میں اشعار کی کم از کم اور زیادہ سے زیادہ تعداد کی اگر چہ ایک حد مقرر ہے لیکن پابندی نہیں کی گئی۔قصیدے کی عام طور پر دو قسمیں: ’’تمہیدیہ‘‘ اور ’’خطابیہ‘‘ ہوتی ہیں۔تمہیدیہ قصیدے میں قصیدہ گو ممدوح کی تعریف یا ہجو سے قبل بطور تمہید تشبیب اور گریز کے اجزا کو شامل کرتا ہے،جبکہ خطابیہ قصیدے کی شروعات مدح سے ہوتی ہے۔گویا اس میں تشبیب اور گریز کا فقدان ہوتا ہے۔علاوہ ازیں قصیدے کی ایک قسم ’’دُعائیہ‘‘ بھی بتائی گئی ہے جس میں قصیدہ گو تشبیب اور گریز سے اجتناب کرتے ہوئے قصیدے کا آغاز دعا سے کرتا ہے اور اختتام مدحیہ اشعار پر کرتا ہے۔

موضوع کے اعتبار سے قصیدے کی چار قسمیں: مدحیہ،ہجویہ، وعظیہ اور بیانیہ ہیں۔مدحیہ قصیدے میں کسی شخص (سلطان،امیر و بزرگ دین) کی تعریف کی جاتی ہے۔مدحیہ قصیدے دو طرح کے ہوتے ہیں یعنی بزرگ دین کی مدح والے قصیدے اور سلاطین و امراء کی مدح والے قصیدے۔ہجویہ قصیدے میں کسی شخص کی برائی یا مصائب زمانہ کا ذکر و شکایت کی جاتی ہے۔اسی طرح وعظیہ قصیدہ پند و نصائح کے موضوعات پر مشتمل ہوتا ہے اور بیانیہ قصیدے میں مختلف حالات و کیفیات کے تذکرہ کے علاوہ شہر آشوب مثلاً کسی شہر کی بربادی،گردش زمانہ، زمانہ کی ناقدری وغیرہ کا بیان کیا جاتا ہے۔اس کے علاوہ قصیدے کا عنوان بھی ہوتا ہے، جیسے تضحیک روزگار، بحر بیکراں، باب الجنت، کوہ دو پیکر وغیرہ وغیرہ۔بعض اوقات قصیدے کو قافئے کے آخری حرف کی مناسبت سے بھی جانا جاتا ہے۔مثلاً اگر قصیدے کے قافیے کا آخری حرف ’ک‘ ہے تو ’’کافیہ‘‘، اگر ’گ‘ ہے تو ’’گافیہ‘‘ اور اسی اگر ’ل‘ ہے تو ’’لامیہ‘‘ قصیدہ کہلاتا ہے۔

قصیدے کی تمہید میں بہاریہ، عشقیہ، حالیہ، فخریہ وغیرہ مختلف مضامین پیش کیے جاتے ہیں۔بہاریہ قصیدے کی تمہید کا موضوع بہار کے مضامین اور عشقیہ قصیدے کی تمہید کا موضوع حسن و عشق کے مضامین پر مبنی ہوتا ہے۔اسی طرح حالیہ قصیدے کی تمہید میں قصیدہ گو اپنے ذاتی حالات و کیفیات اور زمانے کی شکایات کا ذکر کرتا ہے جبکہ فخریہ قصیدے کی تمہید میں شاعر اپنے فنی کمالات کا تذکرہ بڑی مہارت سے کرتا ہے۔

قصیدے کی ابتدا چوں کہ عرب سے ہوئی اور عربی شعرا کا یہ قاعدہ تھا کہ وہ قصیدے کی شروعات عشقیہ اشعار سے کرتے تھے۔ان عشقیہ اشعار کو''تشبیب (شباب کا تذکرہ)'' یا ''نسیب (حسن نسوانی کا ذکر)'' کہا جاتا تھا۔اس کے بعد کسی طرح بات سے بات نکال کر ممدوح کا ذکر چھیڑتے جیسے ''تخلیص (تخلص یا مخلص)'' کا نام دیا جاتا۔پھر ''تحمید (مدح)'' میں ممدوح کی تعریف کرنے کے بعد دعا پر قصیدے کا خاتمہ کرتے جو ''حسن المقطع'' کہلاتا۔قصیدے کے ارکان کو اصطلاحی ناموں یعنی مطلع، تخلص اور مقطع سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔عرب سے قصیدہ جب فارس (ایران) میں آیا تو فارسی شعرا بالخصوص رودکی نے تخلیص کو''گریز'' کا نام دے کر قصیدے کے چار اجزائے ترکیبی: تشبیب، گریز، مدح اور دعا قرار دیئے۔ اہل قلم اردو نے اس معاملے میں فارسی ہی کی تقلید کی۔

تشبیب: قصیدے کی تمہید ہی تشبیب کہلاتی ہے۔اور اس کی ابتدائی واہم کڑی بھی ہے۔فارسی اور اردو شعرا نے تشبیب کو عشقیہ مضامین کے حصار سے نکال کر اس میں معرکۂ حسن وعشق، موسم بہار وخزاں کی کیفیات، دنیا کی ناپائیداری وبے ثباتی، زمانے کی شکایت وآسمان کا شکوہ، وعظ ونصیحت، شاعری کی تعریف وفن شعر سے بحث، خواب کا بیان وخوشی کو مجسم قرار دے کر اس کے سراپا کا بیان وغیرہ موضوعات کو اہمیت دی۔علاوہ ازیں علم نجوم ومنطق، فلسفہ وحکمت، اخلاق وتصوف، شعر وموسیقی وغیرہ مضامین کو بھی سمویا گیا۔غرض یہ کہ کر قصیدے کو معنوی اورموضوعاتی اعتبار سے کافی وسعت دی۔قصیدے میں تشبیب کی نفسیاتی اہمیت مسلم ہے۔قصیدہ گو کا اصل مقصد چوں کہ اپنے ممدوح کی مدح وتوصیف کر کے اس سے اپنا مطلب حاصل کرنا ہوتا ہے۔اس کے لئے وہ ممدوح کا رجحان اپنی اور مبذول کرانے اور اس کے دل میں اپنے تئیں ہمدردی پیدا کرنے کے لئے ایک ایسا جذباتی ماحول تیار کرتا ہے جو مدح پر آنے تک قائم رہتا ہے۔نفسیاتی ہم آہنگی نہ صرف شاعر کو ایک کڑی سے دوسری کڑی تک آسانی سے منتقل ہونے میں مدد دیتی ہے بلکہ قصیدے میں تسلسل وروانی برقرار رکھنے میں بھی معاون ثابت ہوتی ہے۔علاوہ ازیں قصیدہ گو کو اپنے باطنی جذبات وخیالات اور احساسات وتجربات کو ابھارنے کا موقع بھی فراہم کرتی ہے اور ساتھ ہی ممدوح کی نفسیات وذہن پر گہرا اثر بھی ڈالتی ہے۔تشبیب ایک ایسا نفسیاتی عمل ہے جس کا موضوع انتخاب کرتے وقت شاعر کو اپنی ذاتی پسند کو مدنظر رکھنے کے ساتھ ہی ساتھ ممدوح کی داخلی وخارضی کیفیات کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔عرب کے عالموں نے اگرچہ تشبیب کے اشعار کے لئے یہ پابندی عائد کی تھی کہ ان کی تعداد مدح کے اشعار سے کم ہونی چاہئے لیکن بہت قصیدہ نگاروں نے اس پر دھیان دیا۔

مرزا محمد ابوظفر جو مغلیہ تاجدار اکبر شاہ ثانی کے بیٹے اور دہلی کے آخری مغل بادشاہ تھے اپنے ولی عہد میں ایک بار سخت علیل ہوئے۔طویل علالت کے بعد جب صحت یاب ہوئے تو اکبر شاہ ثانی نے جشن غسل منایا۔ذوقؔ نے اس موقع پر ایک قصیدہ بعنوان'' درتہنیت جشن صحت

مرزا محمد ابوظفر'' کہا تھا جس کی تشبیب بہاریہ ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

واہ وا کیا معتدل ہے باغ عالم میں ہوا　　مثل نبض صاحب صحت ہے ہر موج صبا

بھرتی ہے کیا کیا مسیحائی کا دم بادِ بہار　　بن گیا گلزار عالم رشک صد دارالشفا

ہے گلوں کے حق میں شبنم مرہم زخم جگر　　شاخ بشکستہ کو ہے باراں کا قطرہ مومیا

ہوگیا موقوف یہ سودا کا بالکل احتراق　　لالہ بے داغ سیہ پانے لگا نشو ونما

ہوگیا زائل مزاج دہر سے یاں تک جنوں　　بید مجنوں کا بھی صحرا میں نہیں باقی پتا

ہوتا ہے لطف ہوا سے اس قدر پیدا لہو　　برگ میں ہر نخل کے سرخی ہے جوں برگ حنا

(بحوالہ ''انتخاب قصائد و مراثی مع فرہنگ'' مرتبہ: ڈاکٹر چمن لال بھگت، ص ۱۴۷)

گریز: گریز کے لغوی معنی ہیں فرار، بھاگنا، اجتناب، پرہیز وغیرہ گویا قصیدہ میں تشبیب کے بعد اصل مقصد کی طرف متوجہ ہونا۔ اس کو یہ قصیدے کی روح بھی تصور کیا گیا ہے۔ چوں کہ تشبیب اور مدح موضوع کے لحاظ سے قصیدے کے دو مختلف حصے ہیں اور ان دونوں کو ملانے والا حصہ ''گریز'' کہلاتا ہے۔ گریز میں قصیدہ گو اپنی تمام فنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ایسے شعر یا اشعار کا انتخاب کرتا ہے جس یا جن میں بات میں بات پیدا کرنے کی تاثیر ہو۔ یہ ایک ایسا فن ہے جس میں ایک بات دوسری بات سے قدرتی طور پر نکلتی ہوئی دل میں اترتی ہے۔ لہٰذا یہ کہنا درست ہوگا کہ گریز بات میں بات نکل آنے کا فن ہے یہ قصیدے کے اجزائے ترکیبی میں سب سے زیادہ اختصار والی کڑی بھی ہے اور ربط وتسلسل پیدا کرنے والا جز بھی۔ قصیدے میں گریز ایک ایسا عمل ہے جو اس کی فنی بنیاد کو استوار کرتا ہے۔ اسی مقام سے شاعر تشبیب کے پسندیدہ ماحول سے نکل کر اصل موضوع (مدح) کی طرح رجوع کرتا ہے۔ قصیدے کے ارکان میں گریز کی حیثیت ایک پل کی مانند ہے۔ اس کڑی میں قصیدہ گو اپنے جذبات واحساسات اور تجربات وخیالات کو بنیادی خیال کی طرف منتقل کرتا ہے۔ گریز پر اظہار خیال کرتے ہوئے ابو محمد سحر لکھتے ہیں:

''تشبیب کے بعد شاعر کسی تقریب سے ممدوح کا ذکر چھیڑتا ہے۔ اس کو گریز کہتے ہیں۔ بعض اوقات اس کو دو سرکش بیلوں کو ایک جوئے میں جوتنے سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کا سبب یہ ہے کہ یہ حصہ تشبیب اور مدح کے بے ربط اجزا میں ربط پیدا کرتا ہے۔ گریز کا سب سے بڑا حسن یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تشبیب کہتے کہتے شاعر مدح کی طرف اس

طرح گھوم جائے جیسے بات میں بات پیدا ہوگئی ہو۔گریز کی یہ وہ خوبی ہے جس کی وجہ سے وہ قصیدے کا مہتمم بالشان حصہ اور شاعر کے کمال کا معیار سمجھتا جاتا ہے۔گریز ایک شعر سے بھی کیا جاتا ہے۔اوراس کے لئے ایک سے زائد اشعار بھی کہے جاتے ہیں۔''

(ابو محمد سحر ''اردو میں قصیدہ نگاری''،ص۱۹)

سوؔدا نے قصیدہ ''باب البحت''، جو حضرت علی کی منقبت میں تحریر کیا ہے کہ میں ابو محمد سحر کے مطابق گریز کے لئے یہ ایک شعر کہا ہے۔

ہے مجھے فیض سخن اس کی ہی مدّاحی کا
ذات پر جس کی مُبرہن کُنہ عزّ وجل

(بحوالہ ''اردو میں قصیدہ نگاری،ص۱۹)

قصیدہ ''در تہنیت جشن صحت مرزا محمد ابوظفر'' میں بھی ذوقؔ نے ایک ہی شعر سے گریز کیا ہے شعر ملاحظہ ہو:

واقعی کس طرح سے صحت نہ اک عالم کو ہو
جب کہ ہو اس کو نوید غسل صحت جاں فزا

(بحوالہ ''انتخاب قصائد ومراثی مع فرہنگ''،ص۱۴۸)

مدح: قصیدے کی تیسری اور اصلی کڑی مدح ہے جس کے لغوی معنی تعریف، توصیف، ستائش، ثنا وغیرہ ہیں۔عام اصطلاح میں یہ قصیدے کا وہ حصہ ہے جس میں شاعر ممدوح کی تعریف کرتا ہے۔ یہ دراصل قصیدے کا نقطۂ عروج ہے جس میں شاعر اپنی اعلیٰ تخلیقی ولسانی صلاحیتوں کا اظہار کرتا ہے۔اس میں قصیدہ گو کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ جس طرح چاہے ممدوح کی ثنا کرسکتا ہے بشرطیکہ وہ اس (ممدوح) کے رتبہ سے علاقہ رکھتی ہو۔مدح کے دو ذیلی حصے ہوتے ہیں: ''مدح غائب'' اور ''مدح حاضر''۔گریز کے فوراً بعد بالواسطہ ممدوح کی تعریف والے اشعار مدح غائب کے زمرے میں رکھے جاتے ہیں۔اس سلسلے میں ذوق کے قصیدہ ''در تہنیت جشن صحت مرزا ابو محمد ظفر'' کے یہ اشعار دیکھئے:

وہ ولی عہد زماں مرزا محمد بوظفر — اس کی قوت گر ضعیفوں کو بنادے اقویا
تقویت کا یہ اثر ہو عام جو ہیں برگ زرد — ہوں مقوی دل وجاں مثل اوراق طلا
شادئ صحت سے اس کی آج ہو کر شاد شاد — تہنیت خوانی میں ہیں سرگرم سب مدحت سرا

میں بھی اس رشکِ چمن محفل میں وہ مطلع پڑھوں　　　بلبلِ تصویر سن کر بول اٹھے مرحبا

(بحوالہ ''انتخاب قصائد ومراثی مع فرہنگ''، ص ۱۴۸)

سوؔدا قصیدہ ''در مدح نواب عماد الملک آصف جاہ نظام الملک بہادر'' میں چار اشعار سے گریز کیا ہے۔

کر کے دریافت یہ مجھ سے کہا اس نے کہ مگر　　　سمع میں تیرے یہ مژدہ نہیں پہنچا اب تک

آج اس شخص کی ہے سالگرہ کی شادی　　　کہ بہ صورت ہے وہ انسان و بہ سیرت ہے ملک

یعنی نواب سلیماں فرو نام آصف جاہ　　　عہد میں جس کے یہ غیور بزرگ و کوچک

کسی کے آگے کوئی ہاتھ پسارے کیا دخل　　　مٹھی باندھے ہوئے پاتا ہے تولد کودک

(بحوالہ ''انتخاب قصائد ومراثی مع فرہنگ''، ص ۹۶)

اسی طرح مدح حاضر میں تازہ مطلع کے بعد شاعر بلا واسطہ ممدوح کی طرف مخاطب ہو کر اشعار کہتا ہے۔ ذوق کے مذکورہ قصیدہ کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

مژدۂ جاں بخش صحت ہے تراماء الحیات　　　جس سے جوں سیماب کشتہ مردہ دل زندہ ہوا

ہے بقائے عمر سے تیری بقاے عمر خلق　　　ذات ہے تیری جہاں میں چشمۂ آب بقا

قطرہ افشانی سے آبِ غسل صحت کی ترے　　　ہوں دُرِ خوش آب پیدا اس قدر قوت فزا

ہوویں استعمال یاقوتی میں وہ موتی اگر　　　بخشے پیران کہن کو نوجوانوں کے قوا

جسم کو مل مل کے دھویا تو نے جس دم وقت غسل　　　گرد کلفت کو دل عالم سے گویا دھو دیا

دل عدوے سنگ دل کا تھا شقاوت سے جو سخت　　　زیر پا پامال ہوتا تھا برنگ سنگ پا

خُردۂ گل کو صبا لائی تصدق کے لئے　　　دے گیا ابر بہاری نذر دُرِّ بے بہا

شادیٔ صحت کا تیری کیا کہوں عالم کہ آج　　　جوش عشرت سے یہ عالم بن گیا عشرت سرا

(بحوالہ ''انتخاب قصائد ومراثی مع فرہنگ''، ص ۱۴۸، ۱۴۹)

مدح میں قصیدہ گو نہ صرف ممدوح کی تعریف اور اس کے ذاتی اوصاف بیان کرتا ہے بلکہ اس کی عظمت و حشمت، عدل و انصاف، حق

پرستی وروحانی کرامات، دیانتداری وقابلیت، بردباری وغیرت مندی، اخلاق وعادات، بندگی وریاضت، جنگی مہارت وکارنامے وغیرہ کا تذکرہ مبالغہ آرائی سے کرنے کے ساتھ ساتھ رزم گاہ کے واقعات وحالات کا نقشہ بھی بڑی چابکدستی سے کھینچتا ہے۔اس کے علاوہ فوج، تیر، کمان، تلوار، توپ، بندوق، بھالا، اونٹ، ہاتھی، گھوڑے وغیرہ کی تعریف بھی اسی روز بیانی اور مبالغہ سے کی جاتی ہے۔

قصیدہ ''درمدح شجاع الدولہ ودرفتح کردن بہ حافظ رحمت خاں'' میں اودھ کے تیسرے نواب شجاع الدولہ اور آخری روہیلہ سردار حافظ رحمت خاں کی جنگ کے واقعات کا خاکہ کھینچتے ہوئے سوداؔ یوں فرماتے ہیں:

تھی سامنے ہمارے جو فوج ہر اولی | ہوں گے وہ دس ہزار تلک پیادہ وسوار
سنتے ہیں اب ہر ایک سے اس فوج کی یہی | سرکردہ تھے سمیت فرنگی کے پانچ چار
محبوب اور بسنت ولطافت تھے یک طرف | یک سو تھا میر سید علی مستعد کار
لیکن انہوں کو آدمی کہیے کہ دیو و دد | ان کا قدم وغا میں یہ پایا ہم استوار
ایدھر سے بان و رہکلا و توپ متصل | پڑتی تھی پر وہ بڑھتے ہی آتے تھے سرگزار
بڑھ بڑھ کے آخرش وہ لگے توپیں داغنے | اس پلّے پر جہاں سے جزائر کی ہووے مار
لیکن میں تجھ سے کیا کہوں اے یار اس گھڑی | دکھلائی تھی اجل نے عجب طرح کی بہار
تھی کرتیاں تلنگوں کی مانند لالہ زار | تھا دود توپ ابرسیاہ تگرگ بار
توپیں جو داغتے تھے فتیلوں سے آن آن | رنجک مثال برق چمکتی تھی باربار
گجنال مثل رعد کے کڑکے تھی دم بہ دم | آواز شُترنال تھی طاؤس کی جھنکار
بارود وگولہ توپ میں تھا یا وہ باد تھی | جن نے کہ قوم عاد اڑائی تھی جوں غبار
فرصت کسو نے اتنی نہ پائی کہ وہ کرے | بندوق وتیغ وتیر سے جا ان میں کار زار
ہر ایک جا یہی نظر آیا ہر ایک کو | گھوڑا اِدھر جو تڑپے ہے اُدھر پڑا سوار
اڑتے تھے یوں پیادے کہ تودے کو روئی کے | ندّاف کا کمانچہ جوں دے ہے انتشار

(بحوالہ ''انتخاب قصائد ومراثی مع فرہنگ''، ص۱۱۸، ۱۱۹)

مدعا ودُعا: قصیدہ کی چوتھی اور آخری کڑی مدعا ودعا ہے۔ اس میں قصیدہ گو اپنی ذاتی کیفیات ومقاصد کا بیان کرتے ہوئے قصیدہ گوئی کا صلہ چاہتا ہے۔ وہ ممدوح کی صحت وتندرستی، عمر درازی، مال ومتاع میں اضافہ اور جاہ وجلال میں ترقی کی دعا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ممدوح کے اہل وعیال، یار دوست اور رشتہ داران کی لمبی عمر اور خوشحالی کے لئے بھی دعا کی جاتی ہے۔ اس کے بعد شاعر ممدوح کے دشمنوں وبدخواہوں کے لیے بددعا دے کر قصیدے کا خاتمہ کرتا ہے یعنی قصیدہ پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ اس سلسلے میں سوداؔ کے قصیدہ ''در مدح نواب عماد الملک آصف جاہ نظام الملک بہادر'' کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

اس کے مصرف کے جو دیہات ہیں بس ان میں سے — اپنے مداح کو بھی کردے مقرر صحنک

تو ہی ٹک دل میں کر اب عرض کا مری انصاف — جائے کس در پہ کہو پہنچ کے ایسے در تک

جبہہ سائی ہے پرکھ یاں زر انساں کے لئے — آستاں کا ہے تیرے سنگ بہ از سنگِ محک

ختم کر اب تو دعائیہ پہ سوداؔ یہ کلام — آمین کہنے کو گئے باب اجابت پہ ملک

یا الٰہی جو یہ تیرا ہے چراغ دولت — تا ابد اس سے منور رہے قندیل فلک

تا قیامت رہے مسجود ملائک وہ جگہ — مسند جاہ کی تیرے بچھے جس پر توشک

جو ترا دوست ہو اب آئینہ گیتی پر — اس کی تمثال کبھی ہونے نہ پاوے منفک

کاتب دست قضا شکل عدو کی تیرے — صفحۂ ہستی سے جوں حرف غلط کردے حک

(بحوالہ ''انتخاب قصائد ومراثی مع فرہنگ''، ص ۹۸)

مولانا عبدالسلام ندوی بھی اپنی معرکتہ آلاراء کتاب ''شعر الہند (حصہ دوم)'' میں رقمطراز ہیں:

''قصیدہ کا خاتمہ قصیدہ کا ایک رُکن ہے، اور سب کے اخیر میں اسی کی صدا کانوں میں باقی رہ جاتی ہے، اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس قدر محکم ہو کہ اس پر اضافہ ناممکن ہو، اور اس کے بعد اس سے بہتر شعر نہ آنے پائے، اور چونکہ پہلا شعر کُنجی ہے، اسی لئے آخری شعر کو بھی اس کا قفل ہونا چاہئے۔'' (مطبع معارف اعظم گڈھ میں طبع ہوا، ۱۹۳۹ء، ص ۳۴۴)

مذکور بالا اجزائے ترکیبی کے علاوہ قصیدے میں جن خصوصیات کا ہونا ضروری قرار دیا جاتا ہے ان میں مشکل قافیہ وسنگلاخ زمین، مقفّیٰ ومسجع زبان، شاندار وزور دار الفاظ، لہجہ پُر رعب وپُرشکوہ، مبالغہ آرائی وتخیل آفرینی کی آمیزش، قصیدہ گو کا رجائی رجحان، صنائع بدیع وعلمی

اصطلاحات کا دلکش و جائز استعمال، ترکیب کی بلند آہنگی، موضوعات کی فروانی وغیرہ شامل ہیں۔قصیدے کے اجزائے ترکیبی ظاہری طور پر جداگانہ حیثیت رکھنے کے باوجود باطنی ہم آہنگی رکھتے ہیں۔ان اجزا میں باطنی ربط قائم کرنے کے لئے شاعر کو اپنے کمال ہنر کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔اس کے علاوہ قصیدہ گو کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ زبان پر دسترس رکھتا ہو۔

1.2.1۔قصیدے کا تاریخی پس منظر:

قصیدہ گوئی کا آغاز عرب کی سرزمین سے ہوا عرب میں قصیدے کے ابتدائی نقوش اگرچہ بعض اہل قلم حضرات کے مطابق تیسری صدی عیسوی سے ملنے لگتے ہیں لیکن کوئی مصدقہ جانکاری فراہم نہیں ہوتی۔البتہ اکثر مشترقین محققین وناقدین الزیرا ابولیلیٰ المہلہل عدی (Al-Zeir Abu Layla Almuhallil Adi) اور امرؤالقیس جندح (Imru-al-Qays Jandah) کو ابتدائی عربی قصیدہ گویوں میں شمار کرتے ہیں۔قصیدے کو عربی شعروادب میں اس لئے اہمیت حاصل تھی کیوں کہ حجاز کے قصبہ طائف کے قریب عُکاظ (Ukaz) کے بازار میں ہر سال لگنے والے میلے (مذہبی نوعیت کا میلا) میں مذہبی تقریبات کے علاوہ اور بھی کئی طرح کے مقابلے ہوا کرتے تھے۔ان مقابلوں میں ایک مقابلہ شاعری کا بھی ہوا کرتا تھا۔جس قصیدہ گو کا کلام (قصیدہ) زیادہ پسند کیا جاتا، وہ اس عہد کے سب سے بڑے اعزاز کا حقدار ہوتا۔اس دور کا سب سے بڑا اعزاز کیا تھا؟اس طرف اشارہ کرتے ہوئے محمود الٰہی لکھتے ہیں:

> ’’طائف کے قریب عُکاظ کے بازار میں شعرا ہر سال جمع ہوتے تھے اور اپنے اپنے قصیدے سناتے تھے۔جو قصیدہ سب سے اچھا تسلیم کیا جاتا، اسے آب زر سے لکھ کر خانۂ کعبہ میں آویزاں کرایا جاتا تھا۔‘‘
>
> (محمود الٰہی،’’اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ‘‘، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۹۵ء، ص ۰۷)

ظہور اسلام سے قبل عرب میں جن قصیدہ نگاروں کو شہرت نصیب ہوئی ان میں امرؤالقیس کے علاوہ الحارثؔ بن حلزۃ الشکری (Al Harith ibn Hillizaal-Yashkuri)، طرفہؔ بن العبد (Tarafa ibn Al Abd)، زہیرؔ ابن ابی سلمیٰ (Zuhayir ibn Abi Sulma)، عمرو بن کلثوم (Amr ibn Kulthum)، عنترہؔ (Antarah)، لبیدؔ ابن ربیعہ (Labid ibn Rabiah) وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔ظہور اسلام کے بعد کچھ عرصے کے لئے زمانۂ جاہلیت کے قصیدے کی روایت دب گئی اور شعرا نے مذہبی گرفت میں رہ کر حضرت محمدؐ کی شان میں قصیدے کہے۔اس سلسلے میں حسانؔ (Hassan)، کعبؔ (Ka'b) وغیرہ شعرا کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔اسی طرح جمیلؔ، اخطلؔ، جریرؔ، فرزدقؔ وغیرہ کا شمار خلافت راشدہ (حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ کا دور حکومت) کے دور

کے بعد والے شہرت یافتہ عربی قصیدہ نگاروں میں ہوتا ہے۔جبکہ ابونواسؔ، ابوتمامؔ، ابودلامہؔ، مروانؔ، متنبّیؔ وغیرہ عباسیہ دور کے نمائندہ عربی شعرا ہیں۔

ساسانی شہنشاہیت (قدیم شاہان ایران کا ایک خاندان جس کا بانی بہمن کا بھائی ساسان (Sasan) تھا اور اس خاندان نے ۲۲۴ء تا ۶۵۱ء ایران پر حکومت کی) کے خاتمے کے بعد ایرانیوں نے نہ صرف اسلام قبول کر لیا تھا، بلکہ ان کے رہن سہن اور رسم ورواج میں بھی کافی تبدیلی آ گئی تھی۔دراصل فارسی قصیدہ گوئی کا ابتدائی بیج اسی زمانے سے پھوٹنے لگتا ہے۔بقول ڈاکٹر خورشید انور:

> ''فتح الفتوح کے بعد عباسی خلافت کے ماتحت ظاہری دربار میں جو زبان وادب پروان چڑھا وہ بھی عربی ہی تھا۔ چونکہ متاخرین شعرائے عرب کی پختہ روایت موجود تھی۔اس لئے اس کے زیر اثر اور انہیں خطوط پر فارسی قصیدہ کا آغاز ہوا، عربی اثرات کا ہی یہ واضح ثبوت ہے کہ فارسی میں جس عروضی ڈھانچے یا ہیئت میں شاعری کی گئی وہ بھی صنف قصیدہ ہی تھی۔''
>
> (ڈاکٹر ثریا خانم، مرتبہ ''ادبی مجلہ''، ۲۰۱۴ء، شعبۂ اُردو فارسی راجستھان یونیورسٹی، ص ۶۸)

فارسی شعرا نے عربی قصیدہ نگاروں کی تقلید کرنے کے علاوہ اپنے اسلوب وفکر کی آمیزش سے مقامی رنگ بھر کر بھی فارسی قصیدے کو کافی تقویت بخشی۔ابوالعباس مروزیؔ (Abal Abbas Marwazi)، فیروزؔ مشرقی (Fayrouz Mashriqi) اور محمدؔ بن وصیف (Muhammad bin Wasif) وغیرہ کو بعض فارسی اہل قلم اگرچہ ابتدائی فارسی قصیدہ گویوں میں شمار کرتے ہیں، لیکن تحقیقی شواہد کی روشنی میں رودکیؔ (Rudaki) کو فارسی قصیدے کا بانی اور پہلا صاحب دیوان فارسی شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔رودکیؔ کے علاوہ اس دور میں جن شعرا نے فارسی قصیدے کو پروان چڑھایا ان میں منصور حلاجؔ (Munsour Hallaj)، ابو القاسم فردوسیؔ طوسی (Abul Qasam Ferdoussi Tusi)، ابومنصور دقیقیؔ (Abu Munsur Daqiqi) اور کسائی مروزیؔ (Kisai Marvazi) وغیرہ کے نام شامل ہیں۔اسی طرح ابوالقاسم حسن عنصریؔ (Abul Qasim Hasan Unsuri)، عیوقیؔ (Ayyaqi)، منوچہریؔ (Manuchehri)، فرخیؔ سیستانی (Farukhi Sistani) وغیرہ غزنوی (Ghaznavi) دور کے اہم قصیدہ نگار شعرا تھے

عہد سلجوقی (Seljuqi) میں فارسی قصیدے کو ترقی دینے میں ناصر خسروؔ (Nasir Khusraw) نے اہم کردار ادا کیا۔اس دور کے بعد جن فارسی شعرا نے فارسی میں فن قصیدہ گوئی کو عروج بخشا ان میں خاقانیؔ (Khaqani)، انوریؔ (Anvari)، شیخ سعدیؔ (Sheikh Saadi)، عرفیؔ (Orfi)، قاآنیؔ (Qaani) وغیرہ کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

قصیدے کی روایت جو فارسی کے ذریعے اردو میں داخل ہوئی نے اردو کی دوسری اصناف کی طرح دکن میں ہی آنکھ کھولی۔ حالاں کہ دکن کی سرزمین قصیدے جیسی صنف سخن کے لئے نہ تو ہموار تھی اور نہ ہی شعرا کے مزاج کو بھاتی تھی، کیوں کہ وہاں شعرا کا ایک گروہ بادشاہوں کا تھا اور دوسرا گروہ صوفیانہ طبیعت کا مالک تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان دونوں گروہوں نے قصیدے کہے ہیں۔ بہمنی سلاطین کے عہد میں کہا جاتا ہے کہ شیخ آذری، مشتاق اور لطفی نے قصیدے لکھے ہیں مگر اس سلسلے میں کوئی تحقیقی ثبوت نہیں ملتا۔ لہٰذا یہ کہنا درست ہوگا کہ دکن کی سرزمین میں اردو قصیدے کا باقاعدہ آغاز بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد ہی ہوتا ہے۔

1.2.2: سرگرمی (آو! اپنی معلومات کو جانچیں)

1۔ اردو قصیدہ کس زبان سے اردو میں آیا؟

الف۔ ترکی　ب۔ عربی　ج۔ سنسکرت　د۔ پنجابی

2۔ اردو کے مشہور قصیدہ نگار کون تھے؟

الف۔ سودا　ب۔ اقبال　ج۔ حالی　د۔ سبھی

3۔ قصیدے کے آغاز کو کیا کہتے ہیں؟

الف۔ مطلع　ب۔ مقطع　ج۔ تشبیب　د۔ رباعی

4۔ قصیدے کا بنیادی مقصد کیا تھا؟

الف۔ کہانی سنانا　ب۔ تعریف وتوصیف ج۔ مزاح　د۔ مرثیہ خوانی

5۔ اردو قصیدے کو فنی بلندی کس شاعر نے دی؟

الف۔ میر　ب۔ غالب　ج۔ سودا　د۔ ذوق

1.3: عمومی جائزہ

اردو قصیدہ ایک اہم شعری صنف ہے جس کی بنیاد عربی ادب میں ملتی ہے۔ عربی شاعری میں قصیدہ ایک طویل نظم کے طور پر رائج تھا جس

میں شاعر اپنے قبیلے، بادشاہ یا کسی اہم شخصیت کی تعریف کرتا تھا۔ فارسی ادب نے اس صنف کو مزید وسعت دی اور فارسی شعرا نے قصیدے کو فنی اعتبار سے مضبوط بنایا۔ جب فارسی زبان برصغیر میں پہنچی تو قصیدے کی روایت بھی اردو ادب میں شامل ہوگئی۔ اردو کے ابتدائی دور میں دکنی شعرا نے قصیدہ نگاری کی، لیکن اس صنف کو اصل ترقی دہلی اور لکھنو؟ کے شعرا نے دی۔ اردو قصیدے کے نمایاں شعرا میں سودا کا نام سرفہرست ہے۔ سودا نے اپنے قصائد میں فصاحت، بلاغت، مبالغہ اور بلند آہنگی پیدا کی۔ ان کے قصائد زبان و بیان کا اعلیٰ نمونہ سمجھے جاتے ہیں۔ میر تقی میر نے بھی قصیدہ نگاری کی مگر ان کی اصل شہرت غزل گوئی میں ہے۔ غالب کے قصائد میں فلسفہ، فکر اور بلند خیالی پائی جاتی ہے۔ ذوق، مومن اور دیگر شعرا نے بھی اس صنف کو فروغ دیا۔

قصیدہ عام طور پر تین حصوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلے حصے کو تشبیب کہتے ہیں جس میں حسن، عشق، فطرت یا موسم کا ذکر ہوتا ہے۔ دوسرے حصے میں اصل مدح بیان کی جاتی ہے جس میں بادشاہ، امیر یا کسی شخصیت کی تعریف کی جاتی ہے۔ تیسرے حصے میں دعا، نصیحت یا شاعر اپنا مدعا بیان کرتا ہے۔ درباری دور میں قصیدہ بادشاہوں کو خوش کرنے اور انعام حاصل کرنے کے لیے لکھا جاتا تھا۔ اس وجہ سے بعض اوقات مبالغہ آرائی بھی کی جاتی تھی۔ بعد میں حالی، اقبال اور دیگر جدید شعرا نے قصیدے میں اصلاحی اور قومی موضوعات شامل کیے۔ انہوں نے قصیدے کو محض تعریف تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے قوم کی بیداری اور اخلاقی تربیت کا ذریعہ بنایا۔ جدید دور میں قصیدے کی مقبولیت نسبتاً کم ہوئی کیونکہ غزل، نظم اور آزاد نظم زیادہ مقبول ہوگئیں۔ اس کے باوجود اردو قصیدہ اپنی ادبی اہمیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔ قصیدہ اردو زبان کی فصاحت، بلاغت، تشبیہات اور شعری حسن کا بہترین نمونہ ہے۔ اس صنف نے اردو ادب کو زبان کی خوبصورتی اور اظہار کی وسعت عطا کی۔ اردو قصیدہ نہ صرف تاریخی اہمیت رکھتا ہے بلکہ ادبی سرمایہ بھی شمار کیا جاتا ہے۔

1.4: آپ نے کیا سیکھا؟

اس سبق کے مطالعے سے طلبہ نے اردو قصیدے کی تاریخ اور ارتقا کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ انہوں نے جانا کہ قصیدہ عربی ادب سے فارسی کے ذریعے اردو میں آیا۔ طلبہ نے قصیدے کے بنیادی اجزا جیسے تشبیب، مدح اور دعا کو سمجھا۔ انہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ سودا اردو کے سب سے بڑے قصیدہ نگار تھے جنہوں نے اس صنف کو فنی بلندی عطا کی۔ طلبہ نے مختلف شعرا جیسے میر، غالب، ذوق، حالی اور اقبال کے قصیدہ نگاری میں کردار کو جانا۔ اس سبق سے یہ بات واضح ہوئی کہ قصیدہ صرف تعریف تک محدود نہیں تھا بلکہ بعد میں اس میں اصلاحی اور قومی

موضوعات بھی شامل ہوئے۔طلبہ نے اردو قصیدے کی زبان،فصاحت اور بلاغت کی اہمیت کو سمجھا اور اردو ادب میں اس صنف کے مقام سے آگاہی حاصل کی۔

1.5:فرہنگ

قصیدہ	:	تعریفی نظم
فصاحت	:	صاف اور عمدہ زبان
بلاغت	:	مؤثر اندازِ بیان
تشبیب	:	قصیدے کا ابتدائی حصہ
مدح	:	تعریف
مبالغہ	:	بڑھا چڑھا کر بیان کرنا
ارتقا	:	ترقی
فلسفہ	:	دانائی کی باتیں
اصلاحی	:	بہتری سے متعلق
بلاغی	:	ادبی خوبصورتی والا
روایت	:	پرانی رسم
صنف	:	قسم
شعری	:	شاعری سے متعلق
دربار	:	بادشاہ کی مجلس
توصیف	:	تعریف
اخلاقی	:	اچھے کردار سے متعلق

قومی : قوم سے متعلق

وسعت : پھیلاؤ

نمونہ : مثال

ادبی : ادب سے متعلق

1.6: خود جانچ سوالات

1 اردو قصیدہ کس زبان سے آیا؟

2 قصیدے کے ابتدائی حصے کو کیا کہتے ہیں؟

3 سودا کی قصیدہ نگاری کی کیا خصوصیت تھی؟

4 قصیدے کا بنیادی مقصد کیا تھا؟

5 حالی اور اقبال نے قصیدے میں کیا تبدیلی پیدا کی؟

1.7: مشقی سوالات

1 اردو قصیدے کا تاریخی پس منظر بیان کریں۔

2 قصیدے کے مختلف اجزا کی وضاحت کریں۔

3 سودا کی قصیدہ نگاری پر نوٹ لکھیں۔

4 اردو قصیدے کی ادبی اہمیت بیان کریں۔

5 حالی اور اقبال کے قصیدوں کی خصوصیات بیان کریں۔

1.8: جواباتِ سرگرمی

1۔ ب۔عربی

2۔ د۔سبھی

3۔ ج۔تشبیب

4۔ ب۔تعریف وتوصیف

5۔ ج۔سودا

1.8.1:مشقی سوالات کے جوابات

1 اردو قصیدہ عربی ادب سے فارسی کے ذریعے اردو میں آیا۔اس صنف کو اردو میں دکن اور پھر دہلی ولکھنو؟ کے شعرا نے فروغ دیا۔

2 قصیدے کے تین اہم اجزا ہوتے ہیں: تشبیب، مدح اور دعا۔تشبیب آغاز ہوتا ہے، مدح میں تعریف کی جاتی ہے اور آخر میں دعا یا نصیحت شامل ہوتی ہے۔

3 سودا اردو کے عظیم قصیدہ نگار تھے۔ان کے قصائد زبان کی قوت،فصاحت، بلاغت اور مبالغہ آرائی کے سبب مشہور ہیں۔

4 اردو قصیدہ زبان و بیان کی خوبصورتی،فصاحت اور ادبی شان کا اہم نمونہ ہے۔اس نے اردو ادب کو وسعت دی۔

5 حالی اور اقبال نے قصیدے میں قومی،اخلاقی اور اصلاحی موضوعات شامل کیے اور اسے محض درباری تعریف سے بلند مقام عطا کیا۔

1.9:امدادی کتب

1۔اردو قصیدہ نگاری — ڈاکٹر محمد کمال الدین

2۔اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ — ڈاکٹر محمود الٰہی

3 ۔انتخاب قصائد اردو — مغیث الدین فریدی

4 ۔مرثیہ اور مرثیہ نگار — ڈاکٹر شاداب ردولوی

5 ۔اردو مرثیہ — سید علی عباس حسینی

6 ۔میر انیس اور دبیر — شبلی نعمانی

سبق نمبر 2 اردو قصیدے کا آغاز وارتقا

ساخت

2.0: اغراض ومقاصد

2.1: تعارف

2.2: اردو قصیدے کا آغاز وارتقا

2.2.1 : سرگرمی (آو! اپنی معلومات کو جانچیں)

2.3: عمومی جائزہ

2.4: آپ نے کیا سیکھا؟

2.5: فرہنگ

2.6: خود جانچ سوالات

2.7: مشقی سوالات

2.8: جواباتِ سرگرمی

2.8.1: مشقی سوالات کے جوابات

2.9: امدادی کتب

2.0: اغراض ومقاصد

عزیز طلبہ اس سبق کا بنیادی مقصد آپ کو اردو قصیدے کی تاریخ، آغاز اور ارتقاء سے روشناس کرانا ہے تاکہ آپ اس اہم صنفِ ادب کی ادبی وفنی حیثیت کو بہتر انداز میں سمجھ سکیں۔ قصیدہ اردو شاعری کی ایک قدیم اور باوقار صنف ہے جس نے مختلف ادوار میں نمایاں ترقی کی۔ اس سبق کے ذریعے آپ کو یہ جاننے کا موقع ملے گا کہ قصیدہ عربی زبان سے فارسی اور پھر اردو ادب میں کس طرح منتقل ہوا اور اس نے اردو شاعری میں کیا مقام حاصل کیا۔ اس سبق کا ایک اہم مقصد آپ میں قصیدے کی فنی خصوصیات سے آگاہی پیدا کرنا ہے۔ آپ یہ سمجھ سکیں گے کہ قصیدے میں مدح، تشبیہ، استعارات، مبالغہ آرائی اور زبان و بیان کی شان وشوکت کو کیوں اہمیت دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ قصیدے کے مختلف اجزا جیسے تمہید، گریز، مدح اور دعا کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہوں گی۔

اس سبق کے مطالعے سے آپ اردو کے اہم قصیدہ گو شعرا جیسے سوؔدا، ذوقؔ، غالبؔ اور دیگر شعرا کی ادبی خدمات سے واقف ہوں گے۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ اردو قصیدہ صرف مدح سرائی تک محدود نہیں بلکہ اس میں سیاسی، سماجی اور تہذیبی عناصر بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ سبق آپ میں ادبی ذوق پیدا کرنے، زبان و بیان کی خوبصورتی کو سمجھنے اور کلاسیکی اردو ادب سے دلچسپی بڑھانے میں معاون ثابت ہوگا۔ اس کے ذریعے آپ تنقیدی اور تحقیقی صلاحیتوں کو بھی فروغ دے سکیں گے اور اردو ادب کے ارتقائی سفر کو بہتر انداز میں جان سکیں گے۔

2.1: تعارف

اردو شاعری کی مختلف اصناف میں قصیدہ ایک اہم اور باوقار صنفِ سخن کی حیثیت رکھتا ہے۔ قصیدہ عربی زبان سے اردو میں منتقل ہوا اور اس نے فارسی ادب کے ذریعے اردو شاعری میں اپنی مضبوط بنیاد قائم کی۔ ابتدا میں قصیدہ بادشاہوں، امرا، وزرا اور اہلِ اقتدار کی مدح وستائش کے لیے لکھا جاتا تھا، مگر وقت گزرنے کے ساتھ اس میں معاشرتی، اخلاقی، مذہبی اور تہذیبی عناصر بھی شامل ہوتے گئے۔ اردو قصیدے نے اپنے ارتقائی سفر میں کئی ادبی ادوار دیکھے اور مختلف شعرا نے اسے اپنے منفرد اسلوب اور فنی مہارت سے نئی جہتیں عطا کیں۔ قصیدے کی اصل روح مدح سرائی ہے، لیکن اس میں تشبیہات، استعارات، مبالغہ آرائی، منظر نگاری اور لفظی حسن کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اردو قصیدے کا آغاز دکن سے ہوا جہاں ابتدائی شعرا نے فارسی روایت کو اپناتے ہوئے قصائد تخلیق کیے۔ بعد ازاں دہلی اور لکھنو؟ کے دبستانوں میں قصیدہ گوئی کو عروج حاصل ہوا۔ میر تقی میر، سودا، ذوق، غالب اور دیگر شعرا نے قصیدے کو فنی بلندیوں تک پہنچایا۔ خصوصاً مرزا محمد رفیع سودا کو اردو کا سب سے بڑا قصیدہ گو شاعر مانا

جاتا ہے جنہوں نے قصیدے میں زورِ بیان، طنز، شوکت اور زبان کی پختگی پیدا کی۔

قصیدہ صرف تعریف و توصیف تک محدود نہیں رہا بلکہ اس نے اپنے دور کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی حالات کی عکاسی بھی کی۔ اس صنف میں شعرا نے اپنے فن کا اظہار بڑے شاندار انداز میں کیا۔ قصیدے کی ہیئت میں تمہید، گریز، مدح اور دعا کے اجزا شامل ہوتے ہیں۔ اس کی زبان شاندار، بلند آہنگ اور پرشکوہ ہوتی ہے۔ اردو قصیدے کے ارتقاء کا مطالعہ ہمیں اردو ادب کی تہذیبی تاریخ، شعری روایت اور لسانی ترقی کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ صنف اردو شاعری کے کلاسیکی حسن کی نمائندہ ہے اور آج بھی ادبی حلقوں میں اپنی اہمیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔ قصیدہ نہ صرف شعری مہارت کا مظہر ہے بلکہ اردو ادب کی فکری اور فنی روایت کا ایک قیمتی سرمایہ بھی ہے۔

2.2: اردو قصیدے کا آغاز وارتقا

اردو قصیدے کے ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے ابتدا میں ہمیں کوئی کامیاب قصیدہ نگار نہیں ملتا۔ صا اس زمانے میں مثنوی اور غزل گو شعراء زیادہ کامیاب رہے) حالانکہ اردو کے سامنے ابتداء سے ہی فارسی کے قصائد نمونے کے طور پر موجود تھے۔ لیکن چند وجوہات کی بنا پر اردو میں قصیدہ نگاری آگے نہیں بڑھ پائی۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ اس وقت اردو زبان ابتدائی حالت میں تھی اور قصیدے کے لئے وسیع زبان درکار ہوتی ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اردو شاعری کا آغاز دکن میں ہوا۔ وہاں ابتدا میں دو طرح کے شعراء تھے۔ ایک بادشاہ اور دوسرے درویش اور صوفیاء۔ اب بادشاہ قصیدہ کس کے لئے لکھتا اور درویش اور صوفی کسی کی خوشامد کیوں کر کرتے۔ ابتدائی دور کے جن شعراء نے نعت اور منقبت کی صورت میں قصیدے تحریر کئے ان میں قطب شاہ، غواصیؔ، شاہیؔ اور نصرتیؔ شامل ہیں۔ ولیؔ کے قصائد بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ لیکن ایک تو زبان کی تنگ دامانی اور دوسرے شاعر کی درویشانہ فطرت کی وجہ سے قصیدے میں وہ اثر پیدا نہیں ہوا جو فارسی قصیدے کا طرۂ امتیاز تھا۔ ولیؔ کے قصائد میں دکنی الفاظ کے بے تحاشہ استعمال ہوا ہے۔ مثال دیکھئے:

عشق میں لازم ہے اوّل ذات کوں فانی کرے
ہو فنانی اللہ دائم یا د یزدانی کرے
یاد کے گُلزار پر دو نین کر ابرِ بہار
پیچ کھا سینے میں دِل کروں سنبلستانی کرے

لیکن اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد قصیدے کے عہدزریں کا آغاز ہوتا ہے۔ یعنی سوؔدا کا درد۔ سوؔدا بڑے زہین اورنابغہ روز گار تھے۔ انہوں نے جوڑ قصائد لکھے ہیں ن سے ان کی صلاحیت ، زہانت اوراستادی جھلکتی ہے۔ سوؔدا نے فارسی قصائد سے ترغیب حاصل کی اورفارسی قصیدوں پرقصیدے بھی لکھے ۔اس کی دووجوہات ہوسکتی ہیں۔ایک تو یہ کہ فارسی قصائد سے استفادہ کرنا چاہتے تھے اورفارسی کی تقلیدکو باعث فخرسمجھتے تھے۔اوردوسری یہ کہ سوؔدااپنی استادی دکھانا چاہتے تھے۔ سوؔدا نے انورؔی، خاقاؔنی اورعرؔفی کے قصیدوں کے جواب میں قصیدے لکھ کراس بات کوثابت کردیا کہ وہ ایک کامیاب قصیدہ نگارہیں۔مثال کے طورپرقصیدہ جس کا مطلع ہے۔

اُٹھ گیا بہمن ودے کا چمنستاں سے عمل

تیغ اُردی نے کیا ملکِ خزاں مُستاصل

انؔور کے مشہورقصیدے کے جواب میں اوراُسی زمین میں ہے۔

جرمِ خورشید چو از حوت در آیا بہ حمل

اشہب روز کند ادہم شب را ارجل

اِسی طرح خاقانی کے اس قصیدے پرجس کا مطلع ہے۔

ایں کز جہاں علامتِ انصاف شد نہاں

اے دل کرا نہ کن زمیاں خانۂ نہاں

سوؔدا نے بھی اِس بحرکواورانھیں قوافی کواپنے ایک قصدے میں استعمال کیا ہے

منکر خدا سے کیوں نہ حکیموں کی ہو زباں

جب شہرہ سے مرے ہوملا اِس قدر جہاں

اس طرح سوؔدا نے مشہورقصائد پرقصائد لکھ کراپنی طباعی ،مشاقی ، الطافت اوراستادی کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔اگرہم ان کی اس روش کوتقلید ہی پرمحمول کریں تو بھی ہمیں ان کی داددینی ہوگی۔ سوؔدا کی قوت تخیل ایک آندھی یاطوفان سے کم نہیں۔ان کے قصیدیمیں بڑازوراورندرت بیان اورشگفتگی ہوتی ہے۔مثال کے طورپران کے ایک مشہورقصیدے سےتشبیب کے چنداشعارکودیکھئے کہ کس طرح نئے نئے خیالات امڈے چلے آتے ہیں۔صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ آورد نہیں بلکہ آمد ہے۔

اُٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل

تیغ اُردی نے کیا ملک خزاں مستاصل

قوتِ نامیہ لیتی ہے نباتات کا عرض

ڈال سے پات تلک پھول سے لے کرتا پھل

واسطے خلعتِ نوروز کے ہر باغ کے بیچ

آپ جو قطعی لگی کرنے روش پر مخمل

سوؔدا کے بعد ان کے ہم عصروں میں میرؔ کا درجہ بہ حیثیت شاعر بہت بلند ہے لیکن میرؔ نے جو قصیدے لکھے ہیں وہ بڑے پھیکے نظر آتے ہیں۔ ان میں قصیدے کے شان اور طمطراق نہیں ہے۔ ان کے قصائد پر ان کی افسردہ طبیعت کا گہرا اثر ہے۔ غزل کے لئے سوز چاہئے، اس لئے وہ غزل گوئی میں بہت کامیاب ہوئے لیکن قصیدہ گوئی جوش بیان اور زندہ دلی کی متقاضی ہے۔ میرؔ اپنی طبیعت سے مجبور تھے۔ وہ اپنی طبیعت کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی افسردگی اور شکست خاطری کی بازگشت ان کے قصائد میں بھی سنائی دیتی ہے میرؔ کے ایک مشہور قصیدے کا مطلع ہے۔

جو پہنچے قیامت تو آہِ فغاں ہے

مرے ہاتھ میں دامنِ آسماں ہے

اس قصیدے میں شروع سے آخر تک اسی درد و غم کا اظہار ہے جو ان کی غزل کی خصوصیت تسلیم کی جاتی ہے۔ وہی مزاج اور وہی لہجہ یہاں بھی ملتا ہے۔ میرؔ کے بعد انشاؔ اور مصحفیؔ کا دور آتا ہے۔ ان دونوں نے میرؔ سے بہتر قصیدے لکھے ہیں لیکن انہیں بھی کامیاب قصیدہ نگار تسلیم نہیں کیا گیا اور وہ قصیدہ نگاروں کی ردیف میں کوئی ممتاز مقام نہیں حاصل کر سکے۔ انشاؔ علم و فضل، زبان دانی اور ذہانت میں سوؔدا سے کم نہیں تھے لیکن وہ بھی اپنی طبیعت کے ہاتھوں بے بس اور مجبور تھے۔ ان کی غیر سنجیدہ طبیعت نے ان کی شاعری کو کافی نقصان پہنچایا۔ یہی سبب ہے کہ وہ قصیدہ گوئی میں سوؔدا سے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اب رہا مصحفیؔ کا معاملہ تو ان کی شاعری کا مزاج براست ہے جو قصیدہ گوئی کے لئے موزوں نہیں۔

ادھر لکھنؤ میں آتشؔ اور ناسخؔ غزل کے میدان میں کافی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ لیکن انہوں نے قصیدے کی جانب کوئی دھیان ہ نہیں دیا۔ دہلی میں ذوقؔ، غالبؔ اور مومنؔ نے قصیدہ نگاری کی طرف توجہ کی۔ گو ان شعراء نے بہت کم قصیدے کہے ہیں اور ان کی شہرت صنف غزل کی

وجہ سے زیادہ ہے پھر بھی ان شعراء حضرات نے جو قصیدے لکھے ان میں ایک نئی شان اور نیا انداز دیکھنے کو ملتا ہے۔قصیدہ نگاری میں سوؔدا کے بعد اگر کوئی اس فن کا ماہر نظر آتا ہے تو وہ ذوقؔ کی ذات ہے۔ذوقؔ نے سوؔدا کے بعد قصیدہ گوئی میں کافی شہرت اور کامیابی حاصل کی۔کیونکہ ان کی ذات میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ایک اچھے قصیدہ نگار کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔

قصیدے کی کامیابی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ اس کے چاروں اجزا میں ایک خوشگوار ربط ہو اور گریز مختصر ہو۔ذوقؔ اس ذمہ داری سے آسانی سے عہدہ برا ہو گئے ہیں۔ذوقؔ بھی خاقاؔنی کی طرح بہت سے علوم کے حوالے اور اصطلاحات ملتے ہیں۔اصطلاحات کے استعمال سے ان کے قصائد میں کہیں کہیں ثقالت پیدا ہو گئی ہے۔اگر قاری ان علوم کے بارے میں تھوڑی بہت واقفیت نہیں رکھتا ہو تو نہ صرف تفہیم میں مشکلات پیش آئیں گی بلکہ بہت سے اشعار سمجھنے سے قاصر رہ جائے گا۔ذوقؔ چونکہ کچھ سنجیدہ اور شائستہ تھے اس لئے ان کے قصائد میں اس جوش وخروش کا فقدان ہے جو سوؔدا کے یہاں ملتا ہے۔غالبؔ کو قدرت نے ایک ذہین اور اعلیٰ دماغ دیا تھا۔غالبؔ نے قصیدہ نگاری کی طرف خاص توجہ نہیں دی۔انہوں نے صرف چار قصائد کہے ہیں۔ان میں سے دو حضرت علی کی منقبت میں ہیں اور دو بہادر شاہ ظفر کی تعریف میں۔لیکن یہ قصائد اپنا جواب آپ ہیں۔ان قصیدوں کی روشنی میں ان کی استادی کا پتہ چلتا ہے۔انہوں نے مدحیہ قصیدے میں بڑا زور صرف کیا ہے۔مومنؔ نے بھی قصیدہ کی صنف کو برتا۔مومنؔ نازک خیالی میں غالبؔ سے بھی سبقت لے گئے ہیں۔انہوں نے بادشاہوں کی مدح سرائی سے حتیٰ الامکان احتراز کیا ہے۔مومنؔ کے قصائد کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے قصاید میں فارسی کی دلکش تراکیب اور لطیف بندشیں ملتی ہیں۔

اس دور کے ساتھ ہی قصیدے کا زوال شروع ہوا کیونکہ قصیدہ نگاروں کی حوصلہ افزائی تو درباروں سے ہوتی تھی۔جب دربار ہی ختم ہو گئے تو پھر قصیدہ کس کے لئے لکھا جائے اور کون لکھے؟ لیکن اس کے بعد ہی قصیدے میں انقلاب آیا۔اب شعراً بجائے امراء کی تعریف اور مدح کہنے کے بزرگان دین کی طرف مائل ہوئے۔چنانچہ ذوقؔ کے بعد جو ممتاز قصیدہ نگار نظر آتے ہیں وہ محسنؔ کاکوروی ہیں۔انہوں نے جتنے بھی قصیدے لکھے ہیں وہ سب کے سب نعت کی شکل میں ہیں۔اس کے دو اسباب ہیں۔ایک تو یہ کہ دربار ختم ہو چکا تھا اور دوسرے محسنؔ نے طبیعت ویسی ہی پائی تھی۔محسنؔ کو بھی اس امر کا احساس تھا کہ وہ قصیدوں نگاروں کی آخری صف میں تھے۔چنانچہ انہوں نے ایک جگہ اس کا اظہار بھی کیا ہے۔

اس کو ان سب کے قصائد سے مطابق کرلیں
نہیں کمتر بھی، اگر ان سے نہیں ہے افضل

دورِ آخر مرے حصے میں دیا ساقی نے
پی گیا اس سے مئے ناب کی ساری بوتل

یہ حقیقت ہے کہ ان کے حصے میں دورآخر آیا تھا۔عزیزؔ لکھنوی،منیرؔ شکوہ آبادی نے بھی چند اچھے قصیدے کہے ہیں۔لیکن یہ شعراء قصیدے کے گرتے ہوئے ایوان کو نہیں سنبھال سکے۔اور قصیدہ زوال پذیر ہوتا چلا گیا۔

2.2.1 : سرگرمی(آو! اپنی معلومات کو جانچیں)

1۔ اردو قصیدے کی اصل زبان کون سی ہے؟

الف)اردو ب)فارسی ج)عربی د)ترکی

2۔ اردو کا سب سے بڑا قصیدہ گو شاعر کس کو کہا جاتا ہے؟

الف)میر ب)غالب ج)سودا د)اقبال

3۔ قصیدے کا بنیادی موضوع کیا ہوتا ہے؟

الف)عشق ب)مدح سرائی ج)فطرت د)تصوف

4۔ قصیدے کا کون سا حصہ اصل تعریف پر مشتمل ہوتا ہے؟

الف)تمہید ب)گریز ج)دعا د)مدح

5۔ اردو قصیدے کو عروج کس دبستان میں حاصل ہوا؟

الف)دکن ب)پنجاب ج)دہلی و لکھنو د)سندھ

2.3:عمومی جائزہ

قصیدہ اردو شاعری کی ایک قدیم، اہم اور باوقار صنفِ سخن ہے جس کی ابتدا عربی ادب سے ہوئی۔عربی زبان میں قصیدہ زیادہ تر بادشاہوں، سرداروں اور بہادر شخصیات کی تعریف کے لیے لکھا جاتا تھا۔بعدازاں فارسی شعرانے اس صنف کو مزید وسعت دی اور اسے فنی اعتبار

سے ترقی دی۔ فارسی ادب کے اثرات کے تحت قصیدہ اردو شاعری میں داخل ہوا اور جلد ہی ایک مقبول صنف بن گیا۔

اردو قصیدے کا ابتدائی دور دکن سے وابستہ ہے جہاں شعرا نے فارسی طرز کو اپناتے ہوئے قصائد تخلیق کیے۔ اس کے بعد دہلی اور لکھنو؟ میں قصیدہ گوئی نے نمایاں ترقی کی۔ خصوصاً دہلی کے شعرا نے زبان و بیان کی پختگی اور فکری گہرائی پیدا کی جبکہ لکھنو؟ کے شعرا نے اس میں رنگینی، صنعت گری اور لفظی حسن شامل کیا۔ اس طرح قصیدہ مختلف ادبی دبستانوں میں ترقی کرتا ہوا ایک مکمل اور باوقار صنف بن گیا۔ قصیدے کا بنیادی مقصد کسی شخصیت کی تعریف و توصیف کرنا ہوتا ہے، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس میں سماجی، سیاسی، اخلاقی اور تہذیبی موضوعات بھی شامل ہو گئے۔ قصیدہ صرف مدح سرائی نہیں بلکہ اپنے عہد کی تہذیب اور حالات کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ اس میں شاعر اپنی فنی مہارت، زبان کی قوت اور تخیل کی وسعت کا اظہار کرتا ہے۔

قصیدے کی ہیئت میں چند اہم اجزا شامل ہوتے ہیں جن میں تمہید، گریز، مدح اور دعا شامل ہیں۔ تمہید میں شاعر کسی منظر، موسم یا کیفیت کا ذکر کرتا ہے۔ گریز کے ذریعے اصل موضوع کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ مدح میں اصل تعریف بیان کی جاتی ہے جبکہ آخر میں دعا پیش کی جاتی ہے۔ قصیدے کی زبان شاندار، بلند آہنگ اور پُرشکوہ ہوتی ہے۔ اردو قصیدے کے ارتقاء میں کئی اہم شعرا نے کردار ادا کیا۔ مرزا محمد رفیع سودا کو اردو کا سب سے بڑا قصیدہ گو شاعر سمجھا جاتا ہے۔ ان کے قصائد میں زورِ بیان، طنز، شوکت اور زبان کی پختگی نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ ذوق، غالب اور دیگر شعرا نے بھی قصیدہ نگاری میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ غالب نے قصیدے میں فکری گہرائی پیدا کی جبکہ ذوق نے زبان کی صفائی اور روانی کو اہمیت دی۔ وقت کے ساتھ قصیدے کی مقبولیت میں کمی ضرور آئی، لیکن اس کی ادبی اہمیت آج بھی برقرار ہے۔ قصیدہ اردو ادب کی کلاسیکی روایت کا نمائندہ ہے اور اس کے مطالعے سے اردو شاعری کے فنی، فکری اور تہذیبی پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ صنف اردو زبان کی وسعت، شعری حسن اور ادبی عظمت کی علامت ہے۔

2.4: آپ نے کیا سیکھا؟

اس سبق کے مطالعے سے طلبہ نے اردو قصیدے کی تاریخ، آغاز اور ارتقاء کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ انہوں نے جانا کہ قصیدہ عربی زبان سے فارسی کے ذریعے اردو ادب میں داخل ہوا اور مختلف ادوار میں ترقی کرتا رہا۔ طلبہ کو قصیدے کی فنی خصوصیات، اس کے اجزا اور اسلوبِ بیان سے آگاہی حاصل ہوئی۔

طلبہ نے یہ بھی سیکھا کہ قصیدے کا بنیادی مقصد مدح سرائی ہے، لیکن اس میں معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی عناصر بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس سبق کے ذریعے انہیں اردو کے اہم قصیدہ گوشعرا جیسے سودا، ذوق اور غالب کی ادبی خدمات کا علم ہوا۔اس کے علاوہ طلبہ میں کلاسیکی اردو ادب کو سمجھنے، زبان و بیان کی خوبصورتی کو محسوس کرنے اور ادبی ذوق پیدا کرنے کی صلاحیت بھی پروان چڑھی۔

2.5: فرہنگ

ارتقاء : ترقی

صنفِ سخن : شاعری کی قسم

مدح : تعریف

تمہید : ابتدائی حصہ

گریز : اصل موضوع کی طرف آنا

مبالغہ : بڑھا چڑھا کر بیان کرنا

تشبیہ : کسی چیز کو دوسری چیز سے ملانا

استعارہ : مجازی معنی میں استعمال

شوکت : عظمت

بلاغت : فصاحت

دبستان : ادبی مکتبہ ؟ فکر

فنی : ہنر سے متعلق

تہذیب : ثقافت

روایت : پرانی رسم یا طریقہ

عکاسی : اظہار

منظر نگاری: منظر کا بیان

قصیدہ گو : قصیدہ لکھنے والا شاعر

پرشکوہ : شان دار

فکری : خیالات سے متعلق

لسانی : زبان سے متعلق

2.6: خود جانچ سوالات

1۔ قصیدہ کس زبان سے اردو میں آیا؟

2۔ قصیدے کا بنیادی مقصد کیا ہے؟

3۔ اردو کے سب سے بڑے قصیدہ گو شاعر کون ہیں؟

4۔ قصیدے کے اہم اجزا کون کون سے ہیں؟

5۔ قصیدے کی زبان کیسی ہوتی ہے؟

2.7: مشقی سوالات

1۔ اردو قصیدے کے آغاز پر تفصیل سے روشنی ڈالیں۔

2۔ قصیدے کی فنی خصوصیات بیان کریں۔

3۔ سودا کی قصیدہ نگاری پر نوٹ لکھیں۔

4۔ اردو قصیدے کے ارتقاء کا جائزہ پیش کریں۔

5۔ قصیدہ اپنے دور کے حالات کی کس طرح عکاسی کرتا ہے؟

2.8: جواباتِ سرگرمی

1۔ ج) عربی

2۔ ج) سودا

3۔ ب) مدح سرائی

4۔ د) مدح

5۔ ج) دہلی ولکھنو؟

2.8.1: مشقی سوالات کے جوابات

1۔ اردو قصیدے کا آغاز عربی ادب سے ہوا۔ فارسی ادب کے ذریعے یہ اردو میں داخل ہوا۔ ابتدا میں اس کا مقصد بادشاہوں اور امرا کی تعریف کرنا تھا، بعد میں اس میں مختلف موضوعات شامل ہو گئے۔

2۔ قصیدے کی فنی خصوصیات میں بلند آہنگ زبان، مدح سرائی، تشبیہات، استعارات، مبالغہ آرائی، منظر نگاری اور شاندار اسلوب شامل ہیں۔

3۔ سودا اردو کے سب سے بڑے قصیدہ گو شاعر ہیں۔ ان کے قصائد میں زبان کی پختگی، طنز، زورِ بیان اور شوکت نمایاں نظر آتی ہے۔

4۔ اردو قصیدہ دکن سے شروع ہوا اور دہلی ولکھنو؟ میں ترقی کی منازل طے کرتا ہوا ایک مکمل صنف بن گیا۔ مختلف شعرا نے اس میں فنی اور فکری وسعت پیدا کی۔

5۔ قصیدہ اپنے دور کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ اس میں بادشاہوں، درباروں، معاشرتی اقدار اور ثقافتی روایات کا ذکر ملتا ہے۔

2.9: امدادی کتب

1۔ اردو قصیدہ نگاری — ڈاکٹر محمد کمال الدین

2۔ اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ — ڈاکٹر محمود الٰہی

3 ۔انتخاب قصائد اردو — مغیث الدین فریدی

4 ۔مرثیہ اور مرثیہ نگار — ڈاکٹر شاداب ردولوی

5 ۔اردو مرثیہ — سید علی عباس حسینی

6 ۔میر انیس اور دبیر — شبلی نعمانی

سبق نمبر 3 اردو قصیدے کے ارتقا میں سوؔدا اور ذوقؔ کی خدمات

ساخت

3.0: غراض و مقاصد

3.1: تعارف

3.2: اردو قصیدے کے ارتقا میں سوؔدا کی خدمات

3.2.1: اردو قصیدے کے ارتقا میں ذوقؔ کی خدمات

3.2.2.: سرگرمی (آو! اپنی معلومات کو جانچیں)

3.3: عمومی جائزہ

3.4: آپ نے کیا سیکھا؟

3.5: فرہنگ

3.6: خود جانچ سوالات

3.7: مشقی سوالات

3.8: جواباتِ سرگرمی

3.8.1: مشقی سوالات کے جوابات

3.9: امدادی کتب

3.0 : اغراض ومقاصد

اس سبق کا بنیادی مقصد آپ کو اردو قصیدے کی اہمیت، اس کے تاریخی ارتقاء اور اس کی فنی خصوصیات سے روشناس کرانا ہے۔اس کے ذریعے آپ یہ سمجھ سکیں گے کہ قصیدہ اردو ادب کی ایک قدیم اور باوقار صنف ہے جس نے مختلف ادوار میں زبان و ادب کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔اس سبق میں خاص طور پر مرزا محمد رفیع سودا اور شیخ ابراہیم ذوق کی خدمات کا مطالعہ کرایا جاتا ہے تاکہ آپ ان دونوں شعرا کے اسلوب، فکری رجحانات اور ادبی خصوصیات کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔اس سبق کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ آپ اردو قصیدے کے فنی عناصر جیسے مدح، تشبیہ، استعارات، صنعتوں اور زبان و بیان کی اہمیت کو جان سکیں۔سودا کے قصائد کے ذریعے آپ کو قصیدے کی بلند آہنگی، شوکتِ الفاظ اور طنزیہ انداز سے آگاہ کیا جاتا ہے جبکہ ذوق کے قصائد کے ذریعے زبان کی صفائی، سادگی اور محاوراتی حسن کا شعور پیدا کیا جاتا ہے۔اس مطالعے سے آپ میں تنقیدی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور وہ مختلف شعری اسالیب کا تقابلی جائزہ لینے کے قابل بنتے ہیں۔

یہ سبق آپ کے اندر اردو زبان و ادب سے دلچسپی پیدا کرنے میں بھی مددگار ثابت ہوتا ہے۔اس کے ذریعے آپ اردو کی کلاسیکی روایت، درباری تہذیب اور شعری اقدار سے واقف ہوتے ہیں۔مزید برآں طلبہ یہ سیکھتے ہیں کہ کس طرح مختلف شعرا نے اپنے دور کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی حالات کو شاعری میں پیش کیا۔اس طرح یہ سبق نہ صرف ادبی شعور کو فروغ دیتا ہے بلکہ زبان کی فصاحت و بلاغت کو سمجھنے میں بھی معاون ثابت ہوتا ہے۔

3.1:تعارف

اردو ادب کی شعری اصناف میں قصیدہ ایک نہایت اہم اور قدیم صنفِ سخن ہے جس نے مختلف ادوار میں اپنے فنی اور فکری اوصاف کے ذریعے ادبی دنیا میں نمایاں مقام حاصل کیا۔قصیدہ بنیادی طور پر مدحیہ شاعری کی وہ صنف ہے جس میں کسی بادشاہ، امیر، وزیر، مذہبی یا سماجی شخصیت کی تعریف وتوصیف کی جاتی ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ اس میں شاعر اپنے تخیل، زبان و بیان، تشبیہات، استعارات اور فنی مہارت کا بھی بھرپور اظہار کرتا ہے۔اردو قصیدے کی ابتدا فارسی ادب کے زیرِ اثر ہوئی اور ابتدا میں اس کا دائرہ محدود تھا، لیکن رفتہ رفتہ اس نے اردو زبان میں ایک مستقل اور توانا صنف کی حیثیت اختیار کر لی۔اردو قصیدے کے ارتقاء میں متعدد شعرا نے اہم کردار ادا کیا، مگر مرزا محمد رفیع سودا اور شیخ ابراہیم ذوق کی خدمات کو بنیادی اور فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے۔

سودا نے اردو قصیدے کو وہ وقار، وسعت اور فنی عظمت عطا کی جس کی مثال اس سے پہلے اردو ادب میں کم ملتی ہے۔ انہوں نے قصیدے کو محض خوشامدانہ شاعری تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس میں زبان کی شگفتگی، طنز و مزاح، زورِ بیان اور فکری گہرائی پیدا کی۔ سودا کے قصائد میں بلند آہنگی، شوکتِ الفاظ اور دلکش منظر نگاری نمایاں نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنے قصائد میں سیاسی، سماجی اور اخلاقی موضوعات کو بھی شامل کیا، جس کی وجہ سے ان کے قصائد محض درباری مدح تک محدود نہ رہے بلکہ ایک عہد کی تہذیبی اور سماجی تصویر بن گئے۔ سودا کے یہاں فارسی رنگ نمایاں ہونے کے باوجود زبان میں روانی اور سادگی موجود ہے۔ ان کے قصائد اردو قصیدے کے فنی معیار کی معراج تصور کیے جاتے ہیں۔

شیخ ابراہیم ذوق نے اردو قصیدے کو ایک نئی لطافت، سلاست اور زبان کی صفائی عطا کی۔ ذوق بنیادی طور پر دہلی کی کلاسیکی روایت کے نمائندہ شاعر تھے۔ ان کے قصائد میں درباری شان کے ساتھ ساتھ زبان کی پاکیزگی اور محاورے کی صحت نمایاں ہے۔ ذوق نے قصیدے میں تکلف اور مبالغے کے بجائے سادہ مگر پراثر اسلوب اختیار کیا۔ ان کے یہاں صنعتوں کا استعمال فطری انداز میں ملتا ہے اور ان کی شاعری میں زبان و بیان کی ایسی مہارت دکھائی دیتی ہے جس نے اردو قصیدے کو ایک نیا ادبی وقار بخشا۔ ذوق کے قصائد دربارِ مغلیہ کی تہذیب، آداب اور زبان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ انہوں نے قصیدے کو فنی توازن، شائستگی اور زبان کی درستی کے ذریعے ترقی دی۔ سودا اور ذوق دونوں نے اپنے اپنے انداز میں اردو قصیدے کی روایت کو مضبوط کیا۔ سودا نے قصیدے میں عظمت، خطابت اور جوش پیدا کیا جبکہ ذوق نے اس میں سادگی، شائستگی اور زبان کی نفاست شامل کی۔ ان دونوں شعرا کی خدمات نے اردو قصیدے کو محض درباری صنف کے بجائے ایک مکمل ادبی فن بنا دیا۔ ان کے بعد آنے والے شعرا نے انہی روایات سے استفادہ کیا اور قصیدے کی صنف مزید ترقی کرتی گئی۔ اس طرح اردو قصیدے کے ارتقاء میں سودا اور ذوق کی خدمات سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

3.2: اردو قصیدے کے ارتقا میں سوؔدا کی خدمات

دہلی میں جب اردو شاعری کا آغاز ہوا تو تقریباً تمام اصناف سخن میں شاعروں نے طبع آزمائی کی۔ لیکن اولین طبقے کے شعراء کے قصائد دستیاب نہیں۔ حاتؔم اور آبرؔو کے دور کے چند قصائد ضرور ملے ہیں لیکن ان کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ انہیں شعراء کے ہیں جن سے کہ وہ منسوب ہیں۔ دوسرے یہ نہایت ادنیٰ اور معمولی ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ قصیدہ نگاری کے لئے موزوں دور نہیں تھا۔ ایک اور وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ دور ایہام گوئی کا دور تھا اور غزل کے لئے مخصوص تھا۔ ایسے میں یہ کہنا نہایت دشوار ہے کہ سوؔدا کے

پیش نظر کن اردو شعرا کے قصائد رہے ہوں گے۔ قیاس یہی ہے کہ قصیدہ نگاری میں سوؔدا کی رہنمائی کسی قدیم اردو قصیدے سے نہیں ہوئی بلکہ اس کے پیش نظر اساتذہ فارسی کے قصائد تھے۔ فارسی اساتذہ میں سوؔدا نے خاقاؔنی، عرؔفی اور انورؔی کے رنگ کو پسند کیا۔ چنانچہ اس کی شہادت خود اس کے قصائد میں موجود ہے۔ عرؔفی کا ایک مشہور قصیدہ لامیہ ہے جو اکبری دربار کے ممتاز امیر میر ابوالفتح کی مدح میں تحریر ہوا ہے۔ جس کا مطلع ہے۔

چہرہ پرداز جہاں رخت کشد چوں بہ حمل
شب شود نیم رخ و روز شود مستقبل

سوؔدا نے اِس قصیدے پر اپنا مشہور لامیہ قصیدہ کہا ہے جس کا مطلع یہ ہے

اُٹھ گیا بہمن ودے کا چمنستان سے عمل
تیغ اردی نے کیا ملکِ خراساں مستاصل

سودا نے اپنے کلام میں عرؔفی کا ذکر بھی کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرؔفی کے قصائد ضرور اس کے مطالعے میں رہے ہوں گے اور ان کا اثر بھی سوؔدا کی طبیعت پر کافی حد تک پڑا ہوگا۔ ہجو نگاری سوؔدا کی شاعرانہ خصوصیات میں سے ایک ہے۔ ہجو نگاری میں اس نے انورؔی کی تقلید کی ہے۔ انورؔی کا ایک صیدہ گھوڑے کی ہجو میں ملتا ہے۔ سوؔدا نے بھی ایسا ہی ایک قصیدہ ''تضحیک روزگار'' لکھا ہے جو بہت مشہور ہے۔ اس طرح یہ بات عیاں ہو جاتی ہے سوؔدا نے اساتذہ فارسی کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہوگا اور ان کی خصوصیات کا اثر بھی سوؔدا کے قصائد پر پڑا ہوگا۔ قدرت اللہ شوق نے لکھا ہے کہ سوؔدا نے خاقاؔنی و عرؔفی کو قصیدہ نگاری میں پس پشت ڈال دیا۔ سوؔدا نے اپنے قصیدوں کے نام بھی رکھے ہیں۔ جن میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ حضرت علیؓ کو منقبت میں ایک قصیدہ ہے:

سنگ کو اپنے لیے کرتا ہے پانی آسماں
اس کا نام ''بحرِ بیکراں'' ہے۔
کرتو سوؔدا اب قصیدے کو دعائیہ پہ ختم
گوخطاب اِس کو دیا تونے بحرِ بیکراں

۲۔ ایک اور قصیدہ حضرت علیؓ کی منقبت میں ہے:

اُٹھ گیا بہمن ودے کاچمنستان سے عمل

اِس کا نام ’’باب الجنّت‘‘ ہے۔

۳۔ سیف الدولہ کی تعریف میں ایک قصید ہے۔ ع

برجِ حمل میں بیٹھ کے خاور کا تاجدار

اِس کا نام ’’رزمیۂ بہار‘‘ ہے۔

۴۔ گھوڑے کی ہجو میں ایک مشہور قصیدہ ہے۔ ع

ہے چرخ جب سے ابلغ ایام پر سوار

اِس کا نام ’’تضحیکِ روزگار‘‘ ہے۔

ہمارے قدیم اساتذہ تنقید نے قصیدے کو جانچنے کا ایک معیار مقرر کر دیا ہے جس کو مدنظر رکھ کر ہمارے شعراء قصیدہ نگاری کرتے ہیں۔قصیدے کی کامیابی کے لئے اجزائے کیبی کا خیال رکھنا ضروری ہے۔سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ مطلع کس پایہ کا ہے۔وہی مطلع کامیاب سمجھا جاتا ہے جس میں کوئی نئی بات بیان کی گئی ہوتا کہ ممدوح کلام سننے کے لےءمتوجہ ہو جائے۔خیال کی ندرت، بیان کی جدت اور زبان کی شگفتگی اور برجستگی اگر مطلع میں نہ ہو تو وہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔سوداؔ کے ہاں یہ خصوصیت دیکھنے کو ملتی ہے کہ ان کے قصائد کے مطلع نہایت بلند اور شگفتہ ہیں۔مثال کے طور پر ’’باب الجنت‘‘ کا مطلع دیکھئے۔

اُٹھ گیا بہمن ودے کا چمنستان سے عمل
تیغ اردی نے کیا ملکِ خراساں مستاصل

دو اور مطلعے ملاحظہ ہوں۔

صباحِ عید ہے اور یہ سخن ہے شہرۂ عام
حلال دختر رز بے نکاح دروزہ حرام

اور

ہوا کے فیض سے ایسا ہے سبز باغِ جہاں

شبیہ سنبل تر سے ہے موجِ رنگ رواں

تشبیب جس کے معنی شباب کے تذکرے کے ہیں دوسری ضروری چیز ہے۔اس کونسیب بھی کہتے ہیں۔سوؔدا نے اپنے قصیدوں کی تمہیدوں میں موسم بہاروخزاں، ایام شباب، شکایت گردوں، اورذکرمحبوب کا بیان لکھا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ حکیمانہ خیالات اوراخلاقی صداقتوں کا بھی اظہار کیا ہے۔قصیدہ ’’باب الجنت‘‘ کی تشبیب بہاریہ ہے جس میں سوؔدا نے تخیل اورمبالغے کا کمال دکھایا ہے اور جو یوں شروع ہوتا ہے۔

سجدۂ شکر میں ہے شاخِ ثمردار ہر ایک

دیکھ کر باغِ جہاں میں کرمِ عزّ وجل

ان کے قصائد میں موسم بہار کی خیالی تصویریں بڑی ہنرمندی سے کھینچی ہیں اوراس میں تشبیہہ واستعارہ اورمبالغہ واغراق کا رنگ بھر دیا ہے۔بعض تشبیہوں میں عاشقانہ ورندانہ مضامین بھی باندھے ہیں اوربعض تمہیدیں بہاریہ اورعاشقانہ دونوں قسم کے مضامین ہیں۔بعض قصیدوں میں غزلیں بھی داخل کردی ہیں جن کا مدعامحض عاشقانہ ورندانہ مضامین کونشاط انگیز بنانا ہے۔یہ غزلیں بھی اسی شان کی ہیں جواس کا عام رنگ تغزل ہے۔تشبیب قصیدہ نگار کے کمال کی کسوٹی ہے۔سوؔدا نے اس کے مضامین وموضوعات میں تنوع پیدا کیا اورداخلی وخارجی شاعری سے کام لیا ہے اورلفظی، بیانی اور وعرضی مہارت کا کمال دکھایا ہے۔قصیدے کی روح گریز ہے۔یہ تشبیب اور مدح کوملاتی ہے۔تشبیب ومدح کے مضامین مختلف ہوتے ہیں لیکن شاعر کا کمال یہی ہوتا ہے کہ وہ دونوں میں ایساربط پیدا کردے کہ ممدوح تشبیب کے فوراًبعد مدح کے سننے کا مشتاق ہوجائے۔سوؔدا اس گر سے بھی خوب واقف تھے اوراس کے لکھنے میں بڑی استادی دکھائی ہے۔قصیدہ ’’باب الجنت‘‘ کی بہاریہ تشبیب کے بعد اپنے سخن کی رنگینی وشیرینی کا ذکر کیا ہے اوراس کا سبب حضرت علی کی مداحی کو بتایا ہے۔یہی گریز کا مقام ہے:

ہے مجھے فیضِ سخن اُس کی ہی مداحی کا

ذات پر جس کے مبرہن کنہ عزوجل

گریز کے بعد مدح کی نوبت آتی ہے۔اس میں شاعرممدوح کے اوصاف کا بیان کرتا ہے۔مدح عام طور پرمبالغہ آرائی کے سوااور کچھ نہیں ہوتی۔بلکہ یہاں تک ہوتا ہے کہ ایک احمق اورغافل کودانش منداور بیدارمغز، جاہل کوعالم وفاضل، ظالم کوانصاف پسنداور کمینے کوسخی ظاہر کیا جاتا ہے۔سوؔدا کے قصیدے بھی اس خامی سے مبرا نہیں۔تاہم یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کے ممدوحین مدح کے مستحق نہیں تھے۔یہ یاد

رکھنا چاہئے کہ مبالغہ ہماری شاعری، خصوصاً قصیدے کی جان سمجھا جاتا ہے۔ وہ مدح بالکل بے لطف اور سپاٹ خیال کی جاتی ہے جس میں مبالغے کی چاشنی نہ ہو۔ سوؔدا نے بھی مبالغہ کا استعمال ضرور کیا لیکن ایک قابِل برداشت حد تک۔ خصوصاً بزرگوں کی شان میں جو قصیدے کہے ہیں ان میں ان کی عظمت و بزرگی کا خاص خیال رکھا ہے۔ اور سلاطین و امراء کے عدل و انصاف، شجاعت و دلیری اور تدبر و سیاست وغیرہ کا مناسب الفاظ میں بیان کیا ہے۔

حضرت علی کے عدل و انصاف کا ذکر کس جدت آمیز پیرائے میں ہیں:۔

ہیبتِ عدل یہ تیری ہے کہ ہر دشت میں شیر
واسطے درد سو آہو کے گھسے ہے صندل
سامنے بز کے یہ کیا دخل کہ نکلے آواز
گرگ کے پوست کو منڈھوا کے بجائیں جو دہل

مدح کے بعد حسن طلب کی باری آتی ہے۔ اس میں شاعر اپنا مقصد بیان کرتا ہے۔ سوؔدا کے حسن طلب کا ایک نمونہ دیکھئے:۔

کس واسطے کہ مجھ کو اتنا ہی چاہئے ہے
جامہ ہو ایک بر میں کھانے کو نیم ناں ہو
سوتو زیادہ اس سے تیرا کرم ہے مجھ پر
کفران نعمت اوپر قادر نہ یہ زباں ہو
اتنی ہی آرزو ہے کچھ عمر جو ہو باقی
مصرف جہاں میں اس کا تیرے قدم کے یاں ہو

اس طرح سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سوؔدا کو قصیدہ نگاری میں غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ اس نے قصیدے میں متنوع مضامین و موضوعات کو داخل کیا اور داخلی و خارجی شاعری کا کمال دکھایا۔ حکیمانہ خیالات اور اخلاقی تعلیمات کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سوؔدا کا رنگ لاجواب اور سب سے جدا ہے اور اب چونکہ زمانے کا مذاق بدل گیا ہے اس لئے توقع نہیں کہ آئندہ بھی اس کا کوئی جواب پیدا ہو۔

3.2.1: اردو قصیدے کے ارتقا میں ذوقؔ کی خدمات

ذوقؔ تاریخی اعتبار سے اگر چہ انؔشا کے بعد آئے لیکن ادبی لحاظ سے انہیں سوؔدا کے بعد اردو کا سب سے بڑا قصیدہ نگار سمجھا جاتا ہے۔ ''آب حیات'' کے مصنف مولانا آزاد کا بیان ہے:

> ''نظم اردو کی نقاشی میں مرزائے موصوف نے قصیدے پر دست کاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ان کے بعد شیخ موصوف کے سوا کسی نے اس پر قلم نہیں اٹھایا۔اور انہوں نے مرقع کو ایسی اونچی محراب پر سجایا کہ جہاں تک کسی کا ہاتھ نہیں پہنچتا ۔انوریؔ،ظہوریؔ،عرفیؔ، فارسی کے آسمان پر بجلی ہو کر چمکتے ہیں لیکن کے (ذوقؔ کے) قصیدوں نے اپنی کڑک دمک سے ہند کی زمین کو آسمان پر کر دکھایا۔''

ذوقؔ نے اپنی قدرت زبان اور مہارت فن سے قصیدے کی زمین کو آسمان کر دکھایا اور مرقع کو ایسی اونچی مہراب پر سجایا جہاں تک کسی کا ہاتھ نہیں پہنچتا،مگر اس کی وسعت میں کوئی اضافہ نہیں کر پائے۔خود اپنے پیش رو سوؔدا کے مقابلے میں ذوقؔ کے قصائد کا دائرہ بہ اعتبار مضامین کو موضوعات محدود نظر آتا ہے۔دو ایک ناتمام قصیدوں کے چند اشعار کے سوا ان کا کوئی قصیدہ حمد، نعت یا منقبت میں نہیں ملتا۔انہوں نے دربار شاہی میں پڑھے جانے والے مدحیہ قصائد کے علاوہ کسی اور موضوع پر قلم نہیں اٹھایا۔موضوعات مدح کی طرح ان کے ممدوحین کی تعداد بھی محدود ہے۔ان کے تمام قصائد اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ہیں۔دہلی کے دربار سے باہر بھی ان کا کوئی ممدوح نہیں۔وہ اپنے وقت کے بہترین قصیدہ نگار سمجھے جاتے تھے۔دہلی سے باہر ان کے قدر دان موجود تھے اور دربار میں ان کی قدر دانی و عزت افزائی،خطاب وخلعت کے سوا جہاں تک مالی منفعت کا سوال ہے چنداں قابل توجہ نہ تھی۔نہ تو انہوں نے کسی اور دربار کی طرف رخ کیا اور نہ یہ کمپنی کے ارباب اقتدار میں سے کسی کو اپنا ممدوح بنایا۔

ذوقؔ قصیدے نگاری کی طرف کیونکہ مائل ہوئے؟اس سوال کا جواب یہی نظر آتا ہے کہ وہ ابتدائے جوانی سے آخری عمر تک دربار شاہی سے وابستہ رہے۔اس درباری فضا میں جہاں سخن وارانِ باکمال کا اجتماع ہوتا تھا اپنی علمی لیاقت اور فن کارانہ صلاحیت کے جوہر دکھانے کے خیال سے بھی انہوں نے متہم بالشان قصیدے لکھے۔ بہادر شاہ ظفر سے دلی رابستگی اور جذبۂ عقیدت نے بھی ان سے قصیدے لکھوائے ۔ذوقؔ نے موضوع کے عدم وسعت کے باوجود اپنی قوت فکر، وسعت مطالعہ،مہارت زبان اور قدرت بیان کے سہارے اپنے قصیدوں میں بڑی جدت طرازی اور ندرت کاری کا مظاہرہ کیا۔

ذوقؔ کے ابتدائی زمانے کے قصائد میں تکلیف، مبالغہ اور آورد نسبتاً کم ہے۔اس کے بجائے ایک فطری اپج، شگفتگی، جوش اور روانی ملتی ہے۔تمہید و تشبیب میں علمی اصطلاحات، تلمیحات اور حکیمانہ خیالات کا اظہار اس زمانے میں بہت نمایاں ہو گیا۔آخری دور میں ایک خاص جوش متانت اور پختگی ان کے کلام میں نظر آتی ہے۔اسی دور میں انہوں نے اپنا مشہور قصیدہ ''شب کو میں اپنے سربستر خواب راحت'' تحریر کیا۔غزل گوئی کی طرح ہی ذوقؔ نے قصیدہ نگاری میں بھی لاجواب مطلع کہے۔اپنے قصائد کا آغاز اکثر بڑے شاندار مطلعوں سے کیا ہے۔ان کے ایک مشہور قصیدے کا مطلع ہے۔

زہے نشاط اگر کیجیے اسے تحریر

عیاں ہو خامہ سے تحریر نغمہ جائے صریر

غالب نے ''صریر خامہ'' کو ''نوائے سروش'' کہا تھا جو مضامین غیب کی ترجمان ہوتی ہے۔ذوقؔ کا یہ مطلع بھی اسی کیفیت فکر و نشاط کا آئینہ دار ہے۔ایک اور مطلع دیکھئے کس قدر برجستہ و بے ساختہ ہے:

ہے آج جو یوں خوشنما نورِ سحر رنگِ شفق

پرتو ہے س خورشید کا نورِ سحر رنگِ شفق

تشبیب:

اردو قصائد میں فارسی قصائد کے معیار کو شروع ہی سے سامنے رکھا گیا اور بیشتر مضامین تشبیب میں فارسی قصیدہ نگاروں کی تقلید کی گئی۔تقلید سب نے کی مگر اپنی استعداد علمی کے مطابق اس میں جدت تازگی اور تنوع پیدا کرنے کی کوشش کی۔اس میدان میں سوداؔ بلاشبہ سب سے آگے ہیں لیکن ذوقؔ ان سے زیادہ پیچھے بھی نہیں۔ان کی یہ بہاریہ تشبیب ملاحظہ ہو:

صبح سعادت نور ارادت تن بہ ریاضت دِل بہ تمنا

جلوۂ قدرت عالم وحدت چشم بصیر محوِ تماشا

مرغ خوش الحال برسریستاں ہر گُل بستاں خورم و خنداں

گوش شقائق محوِ سرودو دیدۂ نرگس مست تمنّا

یہ تشبیب ذوقؔ کی عالمانہ تخیل پسندی، فن کارانہ صورت گری اور استادانہ جوش ترکیبی کی ایک عمدہ مثال ہے۔اس میں صوت

وصدا کا اتار چڑھاؤ، ضائع بدائع کی رنگ آمیزی، لفظوں کا رکھ رکھاؤ ترجیح وتقسیم کس قدر سامعہ نواز ہے۔شاعرانہ تصویر کشی کو ان کے فن وفکر کا بہترین نمونہ کہا جاسکتا ہے۔اس شاعرانہ تصویر کشی میں کیمرے کی آنکھ اور مصور کے موقلم دونوں کی کارفرمائی نظر آتی ہے اور تصویر کھینچنے والے کے تصورات وتاثرات بہار کے جابجا نقش آرائی ورنگ آمیزی کی ہے۔رسمی موضوعات اور روایتی مضامین کے علاوہ جن میں ذوقؔ نے بڑی رنگ آمیزی اور جابجا خون جگر کی آمیزش نے بڑی لالہ کاری کی ہے،بعض تشبیہوں میں خیال کے نئے پہلو اور بیان کے نئے پیرائے پیش کئے ہیں۔

قصیدے کے اجزائے ترکیبی کے لحاظ سے بھی ان کی تشبیہیں بڑی متوازن اور پسندیدہ ہیں۔تعداد اشعار کے لحاظ سے بھی ان کی تشبیب ، مدح سے نہیں بڑھتی جسے قصیدہ نگاری کی خوبیوں میں سے ایک تصور کیا جاتا ہے گریز: ذوقؔ گریز کے موقع پر بات کا پہلو اس طرح بدلتے ہیں جیسے خود بات سے بات پیدا ہوگئی ہو۔ایک قصیدے میں بطور تشبیب اپنی روشنی طبع اور خاطر نازک کا ذکر کیا ہے۔پھر زمانے کی سختیوں اور آسمان کے سنگ ستم کا ذکر چھیڑ دیا اور یہاں سے بڑی لطافت کے ساتھ گریز کا پہلو اختیار کرلیا۔

مگر تردد ایام کیوں کروں اے چرخ
نہیں رہا تری گردش سے کچھ مجھے سروکار
لے آیا آج مقدم اِس آستاں پہ مجھے
کہ سجدہ کرتے ہیں جھک جھک کے جس پہ لیل ونہار

مدح: ذوقؔ نے اپنی مداح خوانی وستائش گری میں ان تمام روایتی معیاروں اور علامتوں کو پیش نظر رکھا ہے جو سلاطین اومراء کی مدح کے لئے فارسی قصیدہ نگاری میں ضروری خیال کی جاتی ہیں۔چنانچہ قصائد ذوقؔ میں ان کے ممدوحین کی ذات بھی جملہ صفات شاہانہ اور اوصاف عالیہ کا مجموعہ نظر آتی ہے۔حالانکہ حقیقت میں ذوقؔ کے ممدوحین اپنا جاہ جلال کھو چکے تھے اور مال ودولت بھی تقریباً کھو چکے تھے لیکن روایتی طور پر ان مغل بادشاہوں کے ساتھ عظمت دیرینہ کا وہی تصویر وابستہ تھا۔ذوقؔ چونکہ دربار سے وابستہ تھے اس لئے یہ فطری ہی تھا کہ انہوں نے مدح سرائی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ایک مثال دیکھئے:

کون وہ؟ ظل خدا شاہ محمد اکبر
جس کی ہمت سے دوں دریوزہ گر ارباب ہمم
جس کے باعث سے منور ہے چراغ خورشید

جس کی دولت سے ہے آراستہ بزم عالم
اس کی دینداری کے نقارے کی اللہ رے صدا
از عجم تا بہ عرب اور عرب تا بہ عجم

بہادر شاہ ظفر کی شان وشوکت اور قہر ومہر کے بارے میں یہ اشعار دیکھئے:

آئے طوفان جو تیرے کا طغیانی پر
کشتی نوح بھی امداد کو ہو گرداب صفت
وہ تیری تیغ کی برش ہے کہ سایہ جس کا
کردے ایک دم میں ہیولی سے مفارق صورت

حسن طلب: ذوقؔ کے قصائد کا خاتمہ حسن طلب پر نہیں بلکہ دعا پر ہوتا ہے۔انہوں نے اپنے قصائد کے خاتمے پر اس بات کا خیال رکھا ہے کہ مقطع کو حسن الخاتمہ بنانے کے لئے مختلف پیرایہ ہائے بیان اختیار کئے جائیں۔ایک قصیدے میں مدح کرتے کرتے اس امر کا بیان کیا ہے کہ ممدوح کے اوصاف مجھ سے بیان نہیں ہو سکتے اس لئے دعا پر ختم کرتا ہوں۔تشبیب، گریز اور مدح کی طرح خاتمہ کلام میں بھی رنگارنگی وتنوع موجود ہے۔ذوقؔ کی قصیدہ نگاری کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ ذوقؔ کے یہاں جہاں علمیت پسندی اور تخیل پرستی ہے، پرکاری وفن کاری ہے، وہاں اثریت وشعریت اور سادگی وصفائی سے بھی ان کے قصائد محروم نہیں۔اور سوداؔ کے بعد قصیدہ نگاری کے میدان میں وہی نظر آتے ہیں۔

3.2.1 سرگرمی

1 اردو قصیدے کو عروج بخشنے والے بڑے شاعر کون تھے؟

2 مرزا سودا کا اصل نام کیا تھا؟

3 ذوق کس مغل بادشاہ کے استاد تھے؟

4 سودا کے قصائد میں کون سی خصوصیت نمایاں ہے؟

5 ذوق کی شاعری میں کس چیز کو خاص اہمیت حاصل ہے؟

3.3 عمومی جائزہ

قصیدہ اردو ادب کی ایک اہم صنفِ سخن ہے جس کی بنیاد فارسی ادب سے متاثر ہو کر رکھی گئی۔ ابتدا میں قصیدہ صرف بادشاہوں اور امرا کی تعریف تک محدود تھا، مگر وقت کے ساتھ اس میں فنی وسعت اور فکری گہرائی پیدا ہوئی۔ اردو قصیدے کے ارتقاء میں مرزا محمد رفیع سودا اور شیخ ابراہیم ذوق نے غیر معمولی خدمات انجام دیں اور اس صنف کو ادبی اعتبار سے بلند مقام تک پہنچایا۔ مرزا محمد رفیع سودا اٹھارویں صدی کے عظیم شاعر تھے جنہوں نے اردو قصیدے کو ایک نئی شان عطا کی۔ ان کے قصائد میں زورِ بیان، بلند آہنگی، شوکتِ الفاظ اور فصاحت و بلاغت نمایاں نظر آتی ہے۔ سودا نے قصیدے کو محض خوشامدانہ شاعری نہیں رہنے دیا بلکہ اس میں سماجی شعور، طنز و مزاح اور فکری عناصر شامل کیے۔ ان کے یہاں منظر نگاری کی بڑی قوت پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے ممدوح کی تعریف اس انداز سے کرتے ہیں کہ قاری پر ایک پرشکوہ فضا قائم ہو جاتی ہے۔ سودا کے قصائد میں فارسی الفاظ اور تراکیب کا استعمال بہت زیادہ ہے، مگر اس کے باوجود زبان میں روانی اور تاثیر موجود ہے۔

سودا کی ایک بڑی خصوصیت ان کا طنزیہ انداز ہے۔ انہوں نے اپنے عہد کی معاشرتی خرابیوں، سیاسی انتشار اور اخلاقی زوال کو اپنے اشعار میں نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے قصائد محض مدحیہ شاعری نہیں بلکہ ایک تاریخی اور تہذیبی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں جذبات کی شدت اور تخیل کی بلندی نمایاں ہے۔ اردو قصیدے کو فنی اعتبار سے جو استحکام سودا نے دیا، وہ بعد کے شعرا کے لیے مشعلِ راہ بنا۔ شیخ ابراہیم ذوق انیسویں صدی کے معروف شاعر تھے اور مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے استاد بھی تھے۔ ذوق نے اردو قصیدے کو زبان کی صفائی، محاورے کی صحت اور سادگی عطا کی۔ ان کے قصائد میں تکلف کم اور فطری پن زیادہ ہے۔ انہوں نے قصیدے میں ایسی شائستگی پیدا کی جو دہلی کی تہذیبی روایت کی نمائندہ ہے۔ ذوق کے یہاں صنعتوں اور تشبیہوں کا استعمال نہایت متوازن انداز میں ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں درباری ماحول کی جھلک بھی نمایاں نظر آتی ہے۔

ذوق کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے قصیدے کو عام فہم اور دلکش بنایا۔ ان کے اشعار میں زبان کی ایسی روانی پائی جاتی ہے جو قاری کے دل پر فوری اثر ڈالتی ہے۔ انہوں نے مبالغہ آرائی کے بجائے حقیقت پسندانہ انداز اختیار کیا۔ ذوق کے قصائد میں اخلاقی مضامین اور نصیحت آموز پہلو بھی ملتے ہیں۔ ان کے اسلوب نے اردو زبان کی تہذیبی شائستگی کو فروغ دیا۔ سودا اور ذوق دونوں نے اردو قصیدے کو اپنے اپنے انداز میں ترقی دی۔ سودا نے اس میں عظمت، خطابت اور فکری وسعت پیدا کی جبکہ ذوق نے زبان کی سادگی، محاورے کی صحت اور فنی توازن کو فروغ دیا۔ سودا

کے قصائد میں جوش وخروش اور بلند خیالی ہے جبکہ ذوق کے یہاں نرمی، شائستگی اور سادگی پائی جاتی ہے۔ان دونوں شعرا نے اردو قصیدے کی روایت کو مستحکم کیا اور آنے والے شعرا کے لیے نئی راہیں متعین کیں۔اردو قصیدہ اگر آج ایک باوقار اور مکمل صنفِ ادب کے طور پر پہچانا جاتا ہے تو اس میں سودا اور ذوق کی خدمات بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ان دونوں شعرا نے نہ صرف قصیدے کی فنی خوبیاں اجاگر کیں بلکہ اردو زبان کی ادبی عظمت میں بھی اضافہ کیا۔ان کا کلام آج بھی اردو ادب کے طلبہ اور محققین کے لیے رہنمائی کا اہم ذریعہ ہے۔

3.4 آپ نے کیا سیکھا

اس سبق کے مطالعے سے طلبہ نے اردو قصیدے کی تعریف، اس کی اہمیت اور اس کے تاریخی ارتقاء کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔انہوں نے جانا کہ قصیدہ اردو ادب کی ایک اہم صنف ہے جس کی ابتدا فارسی ادب کے زیرِ اثر ہوئی اور بعد میں اردو شعرا نے اسے ایک مستقل ادبی حیثیت عطا کی۔طلبہ نے یہ بھی سیکھا کہ قصیدہ صرف تعریف وتوصیف تک محدود نہیں بلکہ اس میں فنی مہارت، زبان کی خوبصورتی اور فکری عناصر بھی شامل ہوتے ہیں۔طلبہ نے مرزا محمد رفیع سودا کی خدمات کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ سمجھا کہ انہوں نے اردو قصیدے میں زورِ بیان، طنز ومزاح، بلند آہنگی اور فکری گہرائی پیدا کی۔اسی طرح شیخ ابراہیم ذوق کے مطالعے سے طلبہ نے زبان کی صفائی، محاورے کی صحت، سادگی اور شائستگی کی اہمیت کو جانا۔انہوں نے دونوں شعرا کے اسالیب کا تقابلی جائزہ لیا اور یہ محسوس کیا کہ اردو قصیدے کی ترقی میں دونوں کی خدمات یکساں اہم ہیں۔اس سبق سے طلبہ میں اردو ادب کی کلاسیکی روایت کو سمجھنے کا شعور پیدا ہوا۔انہوں نے یہ بھی سیکھا کہ شاعری کے ذریعے کسی دور کی تہذیب، معاشرت اور سیاسی حالات کو کس طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔اس طرح یہ سبق طلبہ کے ادبی ذوق، تنقیدی شعور اور زبان دانی میں اضافے کا سبب بنا۔

3.5 مشکل الفاظ کے معنی

ارتقاء = ترقی

صنفِ سخن = شاعری کی قسم

مدح = تعریف

فصاحت = زبان کی صفائی

بلاغت = مؤثر اندازِ بیان

شوکت = عظمت

بلند آہنگی = پرجوش انداز

تشبیہ = کسی چیز کو دوسری چیز سے ملانا

استعارہ = مجازی معنی میں استعمال

صنعت = شعری خوبی

تخیل = تصور

روانی = بہاؤ

مبالغہ = بڑھا چڑھا کر بیان کرنا

محاورہ = روزمرہ زبان کا جملہ

شائستگی = تہذیب

تہذیب = ثقافت

معاشرت = سماجی زندگی

فکری = خیالات سے متعلق

تنقیدی = اچھائی برائی جانچنے والا

وقار = عزت وعظمت

3.6 خود جانچ سوالات

1 اردو قصیدہ کیا ہے؟

2 سودا کی شاعری کی نمایاں خصوصیات کیا ہیں؟

3 ذوق نے اردو قصیدے میں کیا خدمات انجام دیں؟

3 سودا اور ذوق کے اسلوب میں کیا فرق ہے؟

4 اردو قصیدے پر فارسی ادب کے کیا اثرات ہیں؟

3.7 مشقی سوالات

1 اردو قصیدے کے ارتقاء پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

2 سودا کی قصیدہ نگاری کی خصوصیات بیان کیجیے۔

3 ذوق کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

4 سودا اور ذوق کے قصائد کا تقابلی جائزہ پیش کیجیے۔

5 اردو قصیدے کی فنی خصوصیات بیان کیجیے۔

3.8 جوابات سرگرمی

1 اردو قصیدے کو عروج بخشنے والے بڑے شاعر سودا اور ذوق تھے۔

2 مرزا سودا کا اصل نام مرزا محمد رفیع تھا۔

3 ذوق مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے۔

4 سودا کے قصائد میں زورِ بیان اور طنزیہ انداز نمایاں ہے۔

5 ذوق کی شاعری میں زبان کی صفائی اور محاورے کی صحت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

3.8.1 مشقی سوالات کے جوابات

1 اردو قصیدے کے ارتقاء میں فارسی ادب کا بڑا اثر رہا۔ ابتدا میں یہ صنف درباری شاعری تک محدود تھی لیکن سودا اور ذوق نے اسے فنی عظمت عطا کی۔ سودا نے زورِ بیان، طنز اور بلند آہنگی پیدا کی جبکہ ذوق نے زبان کی صفائی اور سادگی کو فروغ دیا۔

2 سودا کی قصیدہ نگاری کی اہم خصوصیات میں بلند آہنگی، شوکتِ الفاظ، طنز و مزاح، منظر نگاری اور فکری گہرائی شامل ہیں۔ انہوں نے قصیدے کو محض تعریف تک محدود نہیں رکھا۔

3 ذوق نے اردو قصیدے میں سادگی، محاورے کی صحت، زبان کی شائستگی اور فنی توازن پیدا کیا۔ ان کے قصائد دہلی کی تہذیبی روایت کے آئینہ دار ہیں۔

4 سودا اور ذوق دونوں عظیم قصیدہ نگار تھے۔ سودا کے یہاں جوش، خطابت اور بلند خیالی پائی جاتی ہے جبکہ ذوق کے یہاں سادگی، نرمی اور زبان کی صفائی نمایاں ہے۔

5 اردو قصیدے کی فنی خصوصیات میں مدح، تشبیہ، استعارہ، صنعتوں کا استعمال، بلند آہنگی، زبان کی خوبصورتی اور تخیل کی بلندی شامل ہیں۔

3.9: امدادی کتب

1۔ اردو قصیدہ نگاری	—	ڈاکٹر محمد کمال الدین
2۔ اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ	—	ڈاکٹر محمود الٰہی
3۔ انتخاب قصائد اردو	—	مغیث الدین فریدی
4۔ مرثیہ اور مرثیہ نگار	—	ڈاکٹر شاداب ردولوی
5۔ اردو مرثیہ	—	سید علی عباس حسینی
6۔ میر انیس اور دبیر	—	شبلی نعمانی

سبق نمبر 4: اردو قصیدے کے زوال کے اسباب

ساخت

4.0: اغراض ومقاصد

4.1: تعارف

4.2: اردو قصیدے کے زوال کے اسباب

4.2.1 : سرگرمی (آو! اپنی معلومات کو جانچیں)

4.3: عمومی جائزہ

4.4: آپ نے کیا سیکھا؟

4.5: فرہنگ

4.6: خود جانچ سوالات

4.7: مشقی سوالات

4.8: جواباتِ سرگرمی

4.8.1: مشقی سوالات کے جوابات

4.9: امدادی کتب

4.0: اغراض ومقاصد

اس سبق کا بنیادی مقصد آپ کو اردو قصیدے کی ادبی حیثیت، تاریخی اہمیت اور اس کے زوال کے اسباب سے آگاہ کرنا ہے۔ طلبہ یہ جان سکیں گے کہ قصیدہ اردو ادب کی ایک اہم صنف ہے جس نے کئی صدیوں تک شعری روایت پر اثر ڈالا۔ اس سبق کے ذریعے طلبہ قصیدے کی تعریف، خصوصیات اور فنی عناصر کو سمجھ سکیں گے۔ انہیں معلوم ہوگا کہ قصیدہ صرف تعریف وتوصیف تک محدود نہیں تھا بلکہ اس میں زبان و بیان کی خوبصورتی اور فنی مہارت بھی شامل تھی۔ اس سبق کے مطالعے سے آپ اردو قصیدے کے ارتقا اور مختلف ادوار میں اس کی ترقی کا جائزہ لے سکیں گے۔ وہ یہ سمجھ پائیں گے کہ کس طرح سیاسی، سماجی اور تہذیبی تبدیلیوں نے قصیدے کی مقبولیت کو متاثر کیا۔ طلبہ درباری نظام کے خاتمے، مغربی تعلیم کے اثرات، جدید ادبی تحریکوں اور نئے شعری رجحانات کے اثرات کا مطالعہ کریں گے۔ اس سے ان میں تنقیدی شعور پیدا ہوگا اور وہ ادبی اصناف کے عروج وزوال کے اسباب کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔ اس سبق کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ آپ اردو ادب کی مختلف اصناف کا تقابلی مطالعہ کر سکیں اور یہ جان سکیں کہ بدلتے ہوئے حالات ادب کو کس طرح متاثر کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ طلبہ میں زبان و ادب سے دلچسپی پیدا کرنا، ادبی شعور بیدار کرنا اور تحقیقی اندازِ فکر پیدا کرنا بھی اس سبق کے اہم مقاصد ہیں۔

4.1: تعارف

اردو ادب کی شعری اصناف میں قصیدہ ایک نہایت اہم اور قدیم صنفِ سخن ہے۔ قصیدے کی ابتدا عربی ادب سے ہوئی اور پھر فارسی ادب کے ذریعے اردو ادب میں داخل ہوئی۔ ابتدا میں قصیدے کا مقصد بادشاہوں، امیروں، نوابوں اور مذہبی شخصیات کی تعریف وتوصیف کرنا تھا۔ اردو کے ابتدائی شعرا نے بھی اسی روایت کو اپنایا اور قصیدے کو اظہارِ فن کا ایک مؤثر ذریعہ بنایا۔ قصیدہ نہ صرف مدح وستائش کا آئینہ دار تھا بلکہ اس میں زبان و بیان کی چاشنی، لفظی صنعتیں، تشبیہات، استعارات اور شعری محاسن بھی نمایاں ہوتے تھے۔ میر تقی میر، سودا، ذوق اور غالب جیسے شعرا نے قصیدے کو فنی بلندی عطا کی۔ خصوصاً مرزا محمد رفیع سودا کو اردو کا سب سے بڑا قصیدہ نگار کہا جاتا ہے۔

قصیدے کی ہیئت عام طور پر طویل ہوتی تھی اور اس میں تشبیب، مدح، دعا اور گریز جیسے اجزا شامل ہوتے تھے۔ قصیدہ درباری ماحول کی نمائندگی کرتا تھا، اس لیے اس میں شاہانہ انداز اور پرشکوہ زبان استعمال کی جاتی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ جب ہندوستان میں سیاسی، سماجی اور تہذیبی تبدیلیاں آئیں تو قصیدے کی مقبولیت میں کمی آنے لگی۔ مغلیہ سلطنت کے زوال، درباروں کے خاتمے اور انگریزی حکومت کے قیام نے

قصیدے کی کی بنیادوں کو کمزور کر دیا۔ نئے دور کے تقاضوں نے ادب کو حقیقت نگاری، اصلاحِ معاشرہ اور عوامی مسائل کی طرف مائل کیا، جس کے باعث غزل، نظم اور افسانہ زیادہ مقبول ہو گئے۔

قصیدے کے زوال کے اسباب میں سب سے اہم سبب سرپرستی کا خاتمہ تھا، کیونکہ قصیدہ زیادہ تر درباری شاعری پر منحصر تھا۔ جب دربار ختم ہوئے تو قصیدہ نگاروں کی حوصلہ افزائی بھی کم ہو گئی۔ اس کے علاوہ جدید تعلیم، مغربی اثرات، سادگی پسند تحریک اور نئے ادبی رجحانات نے بھی قصیدے کو پیچھے دھکیل دیا۔ اگرچہ آج قصیدہ اپنی سابقہ شان و شوکت برقرار نہیں رکھ سکا، لیکن اردو ادب میں اس کی تاریخی اور فنی اہمیت ہمیشہ مسلم رہے گی۔ قصیدہ اردو شاعری کی ایک عظیم روایت ہے جس نے زبان و بیان کو وسعت دی اور شعری حسن کو نئی جہتیں عطا کیں۔

4.2:ا: اردو قصیدے کے زوال کے اسباب

صنف قصیدہ کے زوال کے اسباب کی نشاندہی سے قبل اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ قصیدے عروج کے کیا اسباب رہے ہیں تو زوال کے اسباب کو سمجھنا زیادہ آسان ہو جائے گا۔ صنف قصیدہ جو اصلاً عربی النسل ہے وہاں یہ صنف سابقت کے سبب پروان چڑھی۔ کیونکہ عربی قصائد میں اصل موضوع حسن و عشق کے ساتھ ساتھ خاندانی وقار و تمکنت، قبائلی فضلیت، شاعرا چشمک اور جنگ و جدال کا بیان ہوتا تھا۔ جنگ و جدال کے ذکر میں رجز اہم پہلو تھا اور عرب میں رجز کو خاصی اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ قصیدے کے اس پہلو کے سبب اس کی مقبولیت میں روز افزوں اضافہ ہوا۔ چنانچہ عہد جاہلیت اور اس کے بعد کے تمام قصیدوں میں خواہ وہ صدر اسلام کا دور ہو یا اموی یا عباسی عہد ہو، قصیدے کے اسی لہجے اور موضوع کو اہمیت حاصل رہی۔

عربی سے جب یہ صنف فارسی میں آئی تو یہ تمام روایتیں تو من وعن نہ آسکیں مگر اسلوب اور لب و لہجے کے اعتبار سے یہی خوبیاں فارسی قصائد میں موود رہیں۔ البتہ اب موضوع اور روئے سخن تبدیل ہو گیا۔ فارسی کی طرح اردو میں بھی موضوع اور روئے سخن شاہان وقت اور امراء و نوابین رہے۔ انہیں کی مدح و ستائش میں سارا زور صرف کیا گیا۔ کیونکہ اس قصیدے کہنے کا مقصد محض حصول زر اور حصول وقار ٹھہرا۔ چنانچہ عمدہ قصیدے لکھنے اور ممدوح کو زیادہ سے زیادہ محفوظ کر کے بیش از بیش صلہ و انعام کے حصول کے مقصد سے شعراء کے درمیان اعلیٰ اور فن کارانہ سابقت شروع ہوئی۔ نتیجے کے طور پر دقیق موضوع مے چونکہ زیادہ تنوع نہیں اسی لئے تشبیب کے مضامین میں زیادہ فن کاری دکھائی جانے لگی اور اصل موضوع یعنی مدح یا ہجو میں مبالغہ اور غلو کا استعمال حد رجہ ہونے لگا۔ مگر قصیدہ گویوں کا کمال یہ ہے کہ غلو بھی سامعین یا قارئین کو اچھا لگنے لگا۔ جب

تک شاہان دورشان وشوکت کے ساتھ برقرار رہا،شعراء قصیدہ کہتے اور صلہ واکرام سے نوازے جاتے۔

مگر شہنشاہیت کے خاتمے اور زوال کے ساتھ ساتھ اس صنف کا بھی روال شروع ہوگیا۔کیونکہ اب ممدوح میں صلہ واکرام اور عنایات وبخشش کی سکت نہیں رہی تو شعراء نے بھی اس صنف سے کنارہ اختیار کرنا شروع کر دیا۔اردو میں قصیدے کے زوال کو دیکھیں تو شجاع الدولہ سے لے کر آصف الدولہ تک اور شاہ عالم سے بہادر شاہ ظفر تک کا پورا دور اندرونی طور پر مفلوک الحالی کا دور ہے۔اس لئے اس عہد کے بڑے قصیدہ نگار مثلاً سوداؔ،اور ذوقؔ نے کسی طرح یہ روایت قائم رکھی مگر سوداؔ نے صلہ واکرام سے بے نیاز ہوکر بزرگان دین کی منقبت اور نعتیہ قصائد کہنے شروع کردئے۔دہلی میں قصیدے کا زوال غدر کے بعد سے ہوتا ہے اور لکھنؤ میں چونکہ حالات مختلف تھے اس لئے وہاں نہ ہی اس صنف کو دہلی کی طرح عروج حاصل ہوسکا اور نہ نوابین وامراء کی علمی استعداد اور صلاحیت کے مواقف تھا۔چنانچہ یہاں بہت جلد ہی قصیدہ زوال پذیر ہوگیا۔البتہ قصائد کے مقابلے یہاں مرثیہ کی صنف نے زیادہ ترقی حاصل کی۔

دوسری سب سے وجہ سرسید تحریک کے زیراثر عقلیت پر زور دینے کی روایت ہے۔اس تحریک کے زیراثر ادب کے تمام پہلوؤں پر غور وفکر کی روایت شروع ہوئی اور حالی نے تو باضابطہ ادب کو زندگی کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ۔چنانچہ انہوں نے دیگر اصناف کے ساتھ ساتھ صنف قصیدہ پر بھی سخت تنقید کی اور مبالغہ اور غلو کو لغو بتا کر زندگی کے لئے غیر سودمند کہا اور حالات بھی ایسے تھے کہ اب ادب میں تخیل پروازی اور ذہنی علو کی جگہ عصری مصائل کو اہمیت دی جانے لگی ۔ان تمام وجوہات کے سبب صنف قصیدہ بالخصوص مدحیہ اور ہجویہ قصائد کی روایت کمزور پڑنے لگی ۔البتہ چند فن کاروں نے نعتیہ قصائد کے ذریعے اس صنف کو آگے بڑھانے کی کوشش کی اور اب قصیدہ صرف اسی شکل میں موجود ہے۔ اور آگے کے امکانات بھی محدود ہو چکے ہیں۔

4.2.1 : سرگرمی (آو! اپنی معلومات کو جانچیں)

1۔ اردو قصیدے کا سب سے بڑا قصیدہ نگار کس کو کہا جاتا ہے؟

الف) غالب ب) سودا ج) میر د) ذوق

2۔ قصیدے کا بنیادی مقصد کیا تھا؟

الف) مزاح نگاری ب) عشق کا اظہار ج) مدح وستائش د) اصلاحِ معاشرہ

3۔ قصیدے کے زوال کا ایک اہم سبب کیا تھا؟

الف) صنعت کاری ب) درباروں کا خاتمہ ج) جدید سائنس د) زبان کی کمی

4۔ اردو قصیدہ کس ادب سے متاثر ہو کر اردو میں آیا؟

الف) ہندی ادب (ب) انگریزی ادب (ج) عربی و فارسی ادب (د) ترکی ادب

5۔ جدید دور میں کون سی صنف زیادہ مقبول ہوئی؟

الف) قصیدہ (ب) رباعی (ج) نظم (د) مرثیہ

4.3: عمومی جائزہ

قصیدہ اردو ادب کی ایک قدیم اور اہم صنفِ سخن ہے جس کی بنیاد عربی ادب میں ملتی ہے۔ فارسی ادب نے اس صنف کو وسعت دی اور اردو شعرا نے اسے مزید ترقی دی۔ قصیدے کا بنیادی مقصد بادشاہوں، امیروں، مذہبی رہنماؤں اور اہم شخصیات کی تعریف وتوصیف کرنا تھا۔ اس میں شاعر اپنی فنی مہارت، زبان دانی اور شعری صلاحیت کا بھرپور اظہار کرتا تھا۔ قصیدے میں الفاظ کی شان وشوکت، صنعتوں کا استعمال، تشبیہات اور استعارات کی فراوانی نمایاں ہوتی تھی۔ اردو میں سودا، ذوق، غالب اور دیگر شعرا نے قصیدہ نگاری میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ قصیدے کے مختلف اجزا ہوتے تھے جن میں تشبیب، مدح، گریز اور دعا شامل ہیں۔ تشبیب میں حسن وعشق یا قدرتی مناظر کا بیان کیا جاتا تھا، اس کے بعد مدح میں کسی شخصیت کی تعریف کی جاتی تھی۔ قصیدہ زیادہ تر درباری ماحول سے وابستہ تھا، اس لیے اس میں شاہانہ رنگ غالب رہتا تھا۔ درباروں

میں شعرا کو انعامات اور مراعات دی جاتی تھیں، جس کی وجہ سے قصیدہ نگاری کو فروغ حاصل ہوا۔

وقت کے ساتھ ہندوستان میں سیاسی اور سماجی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ مغلیہ سلطنت کمزور ہوئی اور انگریزی حکومت قائم ہوگئی۔ اس تبدیلی کے نتیجے میں درباری نظام ختم ہونے لگا۔ چونکہ قصیدہ دربار سے وابستہ صنف تھی، اس لیے اس کی اہمیت بھی کم ہوتی گئی۔ جدید تعلیم اور مغربی افکار نے ادب میں حقیقت نگاری اور اصلاحی رجحانات کو فروغ دیا۔ شعرا نے عوامی مسائل، قومی جذبات اور سماجی اصلاحات کی طرف توجہ دی۔ اس وجہ سے نظم اور غزل جیسی اصناف زیادہ مقبول ہوئیں۔ قصیدے کے زوال کا ایک اہم سبب اس کی مبالغہ آمیز تعریف بھی تھی۔ جدید دور کے قارئین حقیقت پسند ادب کو ترجیح دینے لگے اور قصیدے کی مصنوعی تعریف و توصیف کو پسند نہیں کیا۔ اس کے علاوہ سادگی پسند تحریک نے بھی مشکل زبان اور بھاری بھرکم اسلوب کی مخالفت کی۔ نتیجتاً قصیدہ رفتہ رفتہ ادبی منظرنامے سے پیچھے ہٹتا گیا۔ اگرچہ آج قصیدہ اپنی پرانی مقبولیت کھو چکا ہے لیکن اردو ادب میں اس کی تاریخی اور فنی اہمیت برقرار ہے۔ قصیدہ اردو شاعری کی ایک شاندار روایت ہے جس نے زبان و بیان کو وسعت دی اور اردو ادب کو شعری حسن سے مالا مال کیا۔ اس صنف کا مطالعہ اردو ادب کی تاریخ اور شعری ارتقا کو سمجھنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔

4.4: آپ نے کیا سیکھا؟

اس سبق کے مطالعے سے آپ نے اردو قصیدے کی تعریف، تاریخ اور اہمیت کو سمجھا۔ انہوں نے جانا کہ قصیدہ اردو ادب کی ایک اہم صنف ہے جو عربی اور فارسی ادب کے اثرات سے اردو میں آئی۔ طلبہ نے قصیدے کے اجزا جیسے تشبیب، مدح، گریز اور دعا کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ انہیں معلوم ہوا کہ قصیدہ زیادہ تر درباری شاعری تھی اور اس کا مقصد بادشاہوں اور امیروں کی تعریف کرنا تھا۔ طلبہ نے قصیدے کے زوال کے اسباب کا بھی مطالعہ کیا۔ انہوں نے جانا کہ درباروں کے خاتمے، جدید تعلیم، مغربی اثرات، حقیقت نگاری اور نئے ادبی رجحانات نے قصیدے کی مقبولیت کو کم کر دیا۔ اس سبق سے طلبہ میں ادبی شعور پیدا ہوا اور انہوں نے یہ سیکھا کہ سماجی اور سیاسی تبدیلیاں ادب پر گہرا اثر ڈالتی ہیں۔ اس کے علاوہ طلبہ نے اردو ادب کی مختلف اصناف کے تقابلی مطالعے کی اہمیت کو بھی سمجھا۔

5.5: فرہنگ

قصیدہ	:	تعریفی نظم
مدح	:	تعریف

تشبیب	:	ابتدائی حصہ
گریز	:	ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی طرف جانا
استعارہ	:	مجازی معنی
تشبیہ	:	کسی چیز کو دوسری چیز سے ملانا
صنفِ سخن	:	ادبی قسم
فنی	:	ہنر سے متعلق
مبالغہ	:	بڑھا چڑھا کر بیان کرنا
زوال	:	تنزلی
ارتقا	:	ترقی
تہذیب	:	ثقافت
شاہانہ	:	بادشاہوں جیسا
روایت	:	پرانی رسم
اصلاح	:	بہتری
حقیقت نگاری	:	سچی تصویر کشی
رجحان	:	میلان
شعری محاسن	:	شاعری کی خوبیاں
دربار	:	بادشاہ کی مجلس
وسعت	:	پھیلاؤ

5.6: خود جانچ سوالات

1 اردو قصیدے کی تعریف بیان کریں۔

2 قصیدے کے اہم اجزا کون کون سے ہیں؟

3 قصیدے کے زوال کا سب سے بڑا سبب کیا تھا؟

4 اردو کے مشہور قصیدہ نگاروں کے نام لکھیں۔

5 جدید دور میں قصیدہ کیوں غیر مقبول ہوا؟

5.7: مشقی سوالات

1 اردو قصیدے کی تاریخی اہمیت بیان کریں۔

2 قصیدے کے زوال کے اسباب تفصیل سے لکھیں۔

3 قصیدے کے فنی محاسن پر روشنی ڈالیں۔

4 سودا کی قصیدہ نگاری کا جائزہ پیش کریں۔

5 جدید دور میں قصیدے کی حیثیت پر مضمون لکھیں۔

5.8: جواباتِ سرگرمی

1۔ ب) سودا

2۔ ج) مدح و ستائش

3۔ ب) درباروں کا خاتمہ

4۔ ج) عربی و فارسی ادب

5۔ ج) نظم

5.8.1: مشقی سوالات کے جوابات

1 اردو قصیدہ ایک قدیم صنفِ سخن ہے جس نے اردو ادب کو فنی وسعت عطا کی۔ اس صنف نے زبان و بیان کو نکھارا اور شعرا کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع دیا۔

2 قصیدے کے زوال کے اسباب میں درباروں کا خاتمہ، جدید تعلیم، مغربی اثرات، حقیقت نگاری اور نئے ادبی رجحانات شامل ہیں۔

3 قصیدے کے فنی محاسن میں بلند آہنگی، تشبیہات، استعارات، صنعتوں کا استعمال اور زبان کی شان و شوکت شامل ہیں۔

4 سودا اردو کے عظیم قصیدہ نگار تھے۔ انہوں نے قصیدے میں زبان کی قوت، طنز اور فنی مہارت کا بہترین مظاہرہ کیا۔

5 جدید دور میں قصیدہ اپنی مقبولیت کھو چکا ہے، لیکن اردو ادب میں اس کی تاریخی اور فنی اہمیت آج بھی برقرار ہے۔

5.9: امدادی کتب

1۔ اردو قصیدہ نگاری — ڈاکٹر محمد کمال الدین

2۔ اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ — ڈاکٹر محمود الٰہی

3 ۔ انتخاب قصائد اردو — مغیث الدین فریدی

4 ۔ مرثیہ اور مرثیہ نگار — ڈاکٹر شاداب ردولوی

5 ۔ اردو مرثیہ — سید علی عباس حسینی

6 ۔ میر انیس اور دبیر — شبلی نعمانی

سبق نمبر 5: آیا عمل میں تیغ سے تیری وہ کارزار (سوداؔ)

ساخت

5.0: اغراض ومقاصد

5.1: تعارف

5.2: آیا عمل میں تیغ سے تیری وہ کارزار (متن)

5.2.1: متن کی تدریس

12.2.2 : سرگرمی (آو! اپنی معلومات کو جانچیں)

5.3: عمومی جائزہ

5.4: آپ نے کیا سیکھا؟

5.5: فرہنگ

5.6: خود جانچ سوالات

5.7: مشقی سوالات

5.8: جواباتِ سرگرمی

5.8.1: مشقی سوالات کے جوابات

5.9: امدادی کتب

5.0:اغراض ومقاصد

اس سبق کا بنیادی مقصد آپ کو قصیدہ " آیا عمل میں تیغ سے تیری وہ کارزار" کے متن، مفہوم اور ادبی اہمیت سے روشناس کرانا ہے۔ آپ اس سبق کے ذریعے قصیدے کی صنفی خصوصیات اور اس کے فنی عناصر کو سمجھ سکیں گے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ قصیدہ اردو ادب کی ایک اہم صنف ہے جس میں مدح، شجاعت اور عظمت کا بیان کیا جاتا ہے۔س سبق کے مطالعے سے آپ شاعر کے اندازِ بیان، زبان کی فصاحت و بلاغت اور شعری محاسن سے واقف ہوں گے۔ وہ تشبیہ، استعارہ، مبالغہ اور دیگر ادبی صنعتوں کے استعمال کو پہچان سکیں گے۔ اس کے علاوہ آپ قصیدے میں پیش کیے گئے جنگی مناظر اور بہادری کے جذبات کو بھی محسوس کر سکیں گے۔س سبق کا ایک اہم مقصد آپ میں اردو ادب سے دلچسپی پیدا کرنا اور کلاسیکی شاعری کی اہمیت کو اجاگر کرنا بھی ہے۔ آپ میں تنقیدی اور تخلیقی صلاحیتیں پیدا ہوں گی اور وہ اشعار کی تشریح اور مفہوم نگاری کی مشق کر سکیں گے۔ اس سبق کے ذریعے آپ زبان کی خوبصورتی اور ادبی اظہار کی قوت کو سمجھنے کے قابل ہوں گے۔

5.1:تعارف

اردو ادب میں قصیدہ ایک اہم اور قدیم صنفِ سخن کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس صنف کا بنیادی مقصد کسی شخصیت کی مدح و ستائش، بہادری، سخاوت اور عظمت کا بیان کرنا ہوتا ہے۔ اردو قصیدے نے فارسی ادب سے اثر قبول کیا اور بعد میں اردو شعرا نے اسے اپنی فنی مہارت سے عروج بخشا۔ قصیدے میں الفاظ کی شان و شوکت، بلند آہنگی، تشبیہات، استعارات اور مبالغے کا استعمال نمایاں ہوتا ہے۔ اردو کے مشہور قصیدہ نگاروں میں مرزا محمد رفیع سودا کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے قصیدہ نگاری کو فنی اعتبار سے نئی بلندی عطا کی۔ قصیدہ آیا عمل میں تیغ سے تیری وہ کارزار" بھی اردو قصیدہ نگاری کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس قصیدے میں شاعر نے جنگ، بہادری اور شجاعت کی منظر کشی نہایت مؤثر انداز میں کی ہے۔ شاعر اپنے ممدوح کی تلوار کی طاقت، جنگی مہارت اور دشمنوں پر اس کے رعب و دبدبے کو نہایت شاندار اسلوب میں پیش کرتا ہے۔ قصیدے کے اشعار میں جوش، ولولہ اور قوتِ بیان نمایاں ہے۔ اس میں زبان کی فصاحت و بلاغت اور شعری محاسن قاری کو متاثر کرتے ہیں۔ اس قصیدے کی تدریس کا مقصد آپ کو اردو قصیدے کی فنی خصوصیات، زبان و بیان اور شعری حسن سے روشناس کرانا ہے۔ اس سبق کے ذریعے طلبہ نہ صرف قصیدے کے مفہوم کو سمجھتے ہیں بلکہ اس کے ادبی وفنی پہلوؤں کا بھی مطالعہ کرتے ہیں۔ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ قصیدہ کس طرح درباری ماحول اور جنگی فضا کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ طلبہ شاعر کے اندازِ بیان، تشبیہات، استعارات اور مبالغے کے استعمال کو بھی سمجھتے ہیں۔ یہ سبق طلبہ میں ادبی ذوق پیدا کرنے اور اردو شاعری کی کلاسیکی روایت

سے واقفیت پیدا کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔قصیدے کی تدریس سے طلبہ زبان کی خوبصورتی، الفاظ کے انتخاب اور شعری اظہار کی قوت سے آگاہ ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ یہ سبق اردو ادب کی کلاسیکی روایت کو سمجھنے اور شعری تنقید کا شعور پیدا کرنے میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔

5.2: آیا عمل میں تیغ سے تیری وہ کارزار (متن)

''درمدح نواب شجاع الدولہ ودر فتح کردن بہ حافظ رحمت خان''

آیا عمل میں تیغ سے ترے وہ کارزار — دیکھا ہے جسے نہ ترک فلک نے بہ روزگار
بے سر ہوئے ہیں آج یہ سرکش کہ گر نہال — خاک ان کی پر ہو تو نہ ثمر لاوے شاخسار
سرچنگ اس طرح کی نہ کھائے کہ تا بہ حشر — مدفوں ہو جس زمیں پہ نہ واں اٹھ سکے غبار
آتش غضب کی تو نے یہ ان کے فسردہ کی — تن میں نہیں ہے قطرۂ خوں صورتِ شرار
نام ان کا تیری تیغ نے معدوم یہ کیا — نہ عف کرے ہے سگ ہی نہ قاں زاغ کوہسار
اک خم تھا دل انہوں کا پُر از بادۂ غرور — تیں اس میں کر دیا نمک تیغ آب دار
تھا عزم یہ ہر ایک کا گاویں گے بیٹھ ہم — تانوں کو کھینچ کھینچ کے قلقاری مارمار
آئے تھے وہ چنانچہ اسی طرح روز جنگ — پایا تھا جوں دلوں میں خیال ان کے نے قرار
گاتے بجاتے ناچتے اور کودتے ہوئے — سائے میں جھنڈیوں کے صفیں باندھ بے شمار
وہ جھنڈیاں نظر پڑیں اک دم میں اس طرح — گاذُر بچھا دیں پارچہ جوں نہر کے کنار
پر حق بجانب ان کے ہی تھا کچھ اس امر میں — تیرے دلاوروں کا نہ دیکھا تھا کارزار
جو غول اِن کے سامنے آیا تو سمجھے یہ — اک کھیت روبرو ہے ہمارے پُر از خیار
جیسی ہی اس گروہ نے پی تھی شراب کبر — کھینچا ہے اس کے نشے نے ویسا ہی کچھ خمار
اسباب پر حریف کے آپس میں لگتے داؤں — لشکر میں اپنے بیٹھ کے جب کھیلتے قمار
حق ناشناس قوم یہ تھی غرّہ اس قدر — غارت پہ ہر نبرد کے لیتے تھے سب اُدھار

لیکن خدا کے فضل سے یاں ناگرفتہ قرض
جولائے تھے سودے گئے رکھا نہ ایک تار

شمشیر ودست وبازو کے ہیں یہ بہت بلی
اپنا تو حرف حق سے گذر نہیں شعار

پر وہ جو ہیں غلام غلام اِس جناب کے
آگے قدم انہوں کے نہیں ان کا استوار

جرأت میں ان کے حرف نہیں پر یہ کیا کریں
صحبت نہ ان کے دل سے تہور نے کی برار

ان میں سے اس غلام کے تھے اکثر آشنا
میں نے کہا انہوں سے کہ تم جیسے جاں گزار

یک قوم ویک برادری ویک گروہ کے
ہو سامنے حریف کے بے حد و بے شمار

حافظ کی لاش ڈال گئے معرکہ میں تم
فتح وشکست مردوں کو ہے پر یہ اضطرار

ان میں سے ایک نے بہ دم سرد یہ کہا
خواہش خدا کی یوں تھی نہ تھا اپنا اختیار

لیکن جو کچھ کہ واقعی دیکھا سو ہم کہیں
آوے تجھے سخن کا ہمارے گر اعتبار

تھی سامنے ہمارے جو فوج ہر اولیٰ
ہوں گے وہ دس ہزار تلک پیادہ وسوار

سنتے ہیں اب ہر ایک سے اس فوج کی یہی
سرکردہ تھے سمیت فرنگی کے پانچ چار

محبوب اور بسنت ولطافت تھے یک طرف
یک سوتھا میر سیدعلی مستعد کار

لیکن انہوں کو آدمی کہیے کہ دیو و دد
ان کا قدم وغا میں یہ پایا ہم استوار

ایدھر سے بان و رہکلا و توپ متصل
پڑتی تھی پر وہ بڑھتے ہی آتے تھے سرگزار

بڑھ بڑھ کے آخرش وہ لگے توپیں داغنے
اس پلّے پر جہاں سے جزائر کی ہووے مار

لیکن میں تجھ سے کیا کہوں اے یار اس گھڑی
دکھلائی تھی اجل نے عجب طرح کی بہار

مطلع

تھی کرتیاں تلنگوں کی مانند لالہ زار
تھا دود توپ ابرسیاہ تگرگ بار

توپیں جو داغتے تھے فتیلوں سے آن آن
رنجک مثال برق چمکتی تھی باربار

گجنال مثل رعد کے کڑکے تھی دم بہ دم
آواز شُترنال تھی طاؤس کی جھنکار

بارود وگولہ توپ میں تھا یا وہ باد تھی　　جن نے کہ قوم عاد اڑائی تھی جوں غبار

فرصت کسو نے اتنی نہ پائی کہ وہ کرے　　بندوق وتیغ وتیر سے جا ان میں کار زار

ہر ایک جا یہی نظر آیا ہر ایک کو　　گھوڑا اِدھر جو تڑپے ہے اُدھر پڑا سوار

اڑتے تھے یوں پیادے کہ تو دے کو روئی کے　　ندّاف کا کمانچہ جوں دے ہے انتشار

تھے ہاتھیوں پہ بیٹھے جو حافظ کے ہم نشیں　　ساتھ اس کے ہم پیالہ و باہم نوالہ خوار

وہ بھاگے اس طرح کہ یہ کہتی تھی ان کو خلق　　بھاگا وہ دیکھو جائے ہے میداں سے کوہسار

نے لڑنے کے حواس تھے نہ بھاگنے کا ہوش　　نے سوچ مرنے کا ہی نہ جینے کا کچھ بچار

باور ہی کیجو اس کو تو اے یار اس گھڑی　　آیا جو کچھ عمل میں نہ تھا اس میں اختیار

جیدھر کو جس کا منہ اٹھا اودھر کو وہ چلا　　سوچے بغیر یہ کہ فلاں جا کروں قرار

ہو یہ غصب تو لاش کا حافظ کی ذکر کیا　　بیٹا سسکتے چھوڑ کیا باپ نے فرار

حافظ کی لاش ہم سے نہ اٹھی تو نزد فہم　　جا گہ نہیں ہے طعن وتعرض کی ہم پہ یار

لازم نہ تھا اسے کہ ہوا یسے کے سامنے　　ہمت میں اور کرم میں ہے جو طاق روزگار

لے زر سے تا جواہر واز اسپ تا بہ فیل　　جس کے ہمم کے آگے نہ رکھے کچھ اعتبار

نے رتبہ زر کو ہے نہ جواہر کو منزلت　　نے قدر اسپ کی ہے نہ کچھ فیل کا وقار

خلعت کسی کو، اسپ کسی کو ، کسی کو فیل　　بخشے کسی کو لاکھ ، کسی کو دیئے ہزار

حافظ یہ چاہے عہدہ سے اس کے برآؤں میں　　پیادے کو دے کے تین روپے نو روپے سوار

کیا کیا کروں میں اس کی شجاعت کا اب بیاں　　ہمت کا اس کی کیا کروں اظہار بار بار

’’حافظ‘‘ نے سر دیا نہ دیا ’’زر‘‘ ہوئی ہے یہ　　تاریخ اس کے فوت کی کر لے عدد شمار

تاریخ فتح عرض کی سوّدا نے یوں کہ ’’ہو
یہ فتح نو مبارک نوّاب نامدار‘‘

5.2.1: متن کی تدریس

شمالی ہند میں اردو قصیدہ گوئی کا باقاعدہ آغاز مرزا رفیع محمد سوؔدا کے قصائد سے ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے قصائد میں متنوع موضوعات کو نظم کرنے کے ساتھ ساتھ اخلاقی تعلیمات وحکیمانہ خیالات اور داخلی جذبات وخارجی واقعات کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ مداحیہ قصائد میں سوؔدا نے فارسی کے شہرت یافتہ قصیدہ گو خاقانؔی اور عرفؔی کی تقلید کی اور ہجوگوئی میں انورؔی کی پیروی کی۔ ڈائریکٹوریٹ آف ڈسٹینس اینڈ آن لائن ایجوکیشن یونیورسٹی آف جموں میں ایم اے اردو سمسٹر اول کے کورس نمبر۱۰۲ (قصیدہ ومرثیہ) کے نصاب میں شامل سوؔدا کا قصیدہ ''درمدح نواب شجاع الدولہ ودرفتح کردن بہ حافظ رحمت خاں'' ہے۔

شجاع الدولہ کا اصلی نام مرزا جلال الدین حیدر تھا۔ وہ اودھ کے تیسرے نواب تھے۔ ۱۱۸۶ھ (۱۷۷۲ء) میں شجاع الدولہ اور آخری روہیلہ سردار حافظ رحمت خاں کے درمیان یہ معاہدہ ہوا کہ مرہٹوں کے حملے کی حالت میں نواب اودھ اور انگریز روہیلوں کا ساتھ دیں گے اور اس عوض میں حافظ رحمت خاں چالیس لاکھ روپے نواب شجاع الدولہ کو ادا کرے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا مگر جب حافظ رحمت خان نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا تو ۱۱۸۸ھ (۱۷۷۴ء) میں نواب شجاع الدولہ اور انگریزوں نے روہیل کھنڈ ہتھیارنے کے لئے یلغار کردی۔ لڑائی میں حافظ رحمت خاں اور ان کے بیٹے کے علاوہ ہزاروں روہیلہ سپاہی مارے گئے۔ پس اس قصیدہ میں سوؔدا نے اسی جنگ کا حال بیان کیا ہے اور نواب شجاع الدولہ کو فتح کی مبارک باد پیش کی ہے۔ شامل نصاب قصیدہ ''درمدح نواب شجاع الدولہ ودرفتح کردن بہ حافظ رحمت خان کے ہر شعر کی فرداً فرداً شرح ملاحظہ فرمایئے:

شعر۱:

آیا عمل میں تیغ سے ترے وہ کارزار
دیکھا ہے جسے نہ ترک فلک نے بہ روزگار

مفہوم: سوؔدا اپنے ممدوح سے مخاطب ہوکر فرماتے ہیں کہ میں نے میدان جنگ میں تیری تلوار کے کارناموں کا وہ خوفناک منظر دیکھا ہے جسے جلاد فلک یعنی آسمان نے زمانے کی گردش میں بھی کبھی نہیں دیکھا۔

شعر۲:

بے سر ہوئے ہیں آج یہ سرکش کہ گرنہال
خاک ان کی پر ہوتو نہ ثمر لاوے شاخسار

مفہوم: اس دور میں بغاوت کرنے والے اپنے ہوش وحواس اور وقار ومرتبہ اس قدر کھوبیٹھے ہیں کہ ان کا وجود بغیر شاخوں اور بغیر پھل والے درخت کی مانند ہے۔ گویا موجودہ دور میں باغی اپنی نشوونما اور ترقی سے محروم ہوگئے ہیں۔

شعر۳:

سرچنگ اس طرح کی نہ کھائے کہ تابہ حشر
مدفوں ہو جس زمیں پہ نہ واں اٹھ سکے غبار

مفہوم: نافرمان کو کہیں ایسا صدمہ نہ اٹھانا پڑے کہ جس جگہ پر یہ دفن ہوں وہاں روزِ محشر تک کوئی ہلچل نہ ہو۔ شاعر کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ باغیوں کو بدکرداری کی پاداش میں کہیں ایسی ذلت کا سامنا نہ کرنا پڑے کہ جس زمین میں دفن ہوں وہاں قیامت تک ذرا سی حرکت بھی ممکن نہ ہو۔

شعر۴:

آتش غضب کی تو نے یہ ان کے فسردہ کی
تن میں نہیں ہے قطرۂ خوں صورتِ شرار

مفہوم: شاعر فرماتے ہیں کہ بادشاہ سلامت تو نے ان غمگین چہروں کے اندر اگرچہ غصے کی آگ بھڑکا دی ہے لیکن ان کے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے جو چنگاری کی طرح چمک سکے۔

شعر۵:

نام ان کا تیری تیغ نے معدوم یہ کیا
نہ عف کرے ہے سگ ہی نہ قاں زاغ کوہسار

مفہوم: تیری تلوار نے باغیوں کا نام ونشان اس طرح مٹا دیا ہے کہ اب اس جگہ نہ کوئی کتا بھونک رہا اور نہ ہی کہیں کوّے کی آواز سنائی دے رہی ہے۔

شعر۶:

اک خم تھا دل انہوں کا پُر از بادۂ غرور
تیں اس میں کردیا نمک تیغ آب دار

مفہوم: مغروروں کے رویہ اور سوچ میں جو غرور چھلک رہا تھا تیری تیز دھار والی تلوار نے ان کا وہ چھلکتا ہوا غرور اس طرح ختم کر دیا ہے جس طرح نمک سے شراب کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔

شعر۷:

تھا عزم یہ ہر ایک کا گاویں گے بیٹھ ہم
تانوں کو کھینچ کھینچ کے قلقاری مارمار

مفہوم: ہر ایک باغی کا ارادہ یہ تھا کہ ہم آپس میں مل بیٹھ کر محفل سجائیں گے اور اونچی اونچی آوازوں میں قہقہہ لگائیں گے یعنی بچوں کی طرح زور زور سے آوازیں نکالیں گے۔ ہنسی مذاق اڑئیں گے۔

شعر۸:

آئے تھے وہ چنانچہ اسی طرح روز جنگ
پایا تھا جوں دلوں میں خیال ان کے نے قرار

مفہوم: چنانچہ وہ اپنے دلوں میں سکون لیے ہوئے بڑے اطمینان سے اس طرح جنگ کے زور آئے ہوئے تھے۔

شعر۹:

گاتے بجاتے ناچتے اور کودتے ہوئے
سائے میں جھنڈیوں کے صفیں باندھ بے شمار

شعر۹: اس طرح وہ لاتعداد گاتے بجاتے، ہنستے کھیلنے اور اچھلتے کودتے ہاتھوں میں جھنڈیاں بلند کیے ہوئے قطاروں میں تھے۔

شعر۱۰:

وہ جھنڈیاں نظر پڑیں اک دم میں اس طرح
گاذُر بچھا دیں پارچہ جوں نہر کے کنار

مفہوم: ان کے ہاتھوں میں لہراتی ہوئی جھنڈیوں کو دیکھ کر یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کسی دھوبی نے نہر کے کنارے کپڑے سکھانے کے لئے پھیلا رکھے ہیں۔

شعر۱۱:

پر حق بجانب ان کے ہی تھا کچھ اس امر میں
تیرے دلاوروں کا نہ دیکھا تھا کارزار

مفہوم: لیکن ان کا یہ عمل درست تھا کیوں کہ وہ تیرے بہادر سپاہیوں کی جنگی مہارت اور بہادری سے ناواقف تھے۔

شعر۱۲:

جو غول اِن کے سامنے آیا تو سمجھے یہ
اک کھیت روبرو ہے ہمارے پُر از خیار

مفہوم: بالمقابل آئے ہوئے گروہ کو یہ اپنے سامنے ککڑی سے بھرے ہوئے کھیت کی مانند سمجھے تھے۔

شعر۱۳:

جیسی ہی اس گروہ نے پی تھی شراب کبر
کھینچا ہے اس کے نشے نے ویسا ہی کچھ خمار

مفہوم: یہ گروہ حقیقت سے نابلد تھا۔ان کے اندر غرور شراب کی طرح چھلک رہا تھا لہٰذا وہ گھمنڈ میں اس طرح بدمست ہوگئے کہ اپنے ہوش وحواس ہی کھو بیٹھے تھے۔

شعر۱۴:

اسباب پر حریف کے آپس میں لگتے داؤں
لشکر میں اپنے بیٹھ کے جب کھیلتے قمار

مفہوم: وہ اپنے فوجی دستہ میں بیٹھ کر جب جوا کھیلتے تو بالمقابل کے ذرائع (وسائل،ہتھیار،حکمت عملی وغیرہ) پر ان کی نظریں ٹکی رہتی اور انتظار کرکے موقع کا فائدہ اٹھانے کی تاک میں رہتے۔

شعر۱۵:

حق ناشناس قوم یہ تھی غرّہ اس قدر
غارت پہ ہر نبرد کے لیتے تھے سب اُدھار

مفہوم: یہ مغرور فرقہ اس قدر احسان فراموش تھا کہ ہر لڑائی میں لوٹ کھسوٹ اور لوٹ مار پر نفع رکھ کر قرض وصول کرتے تھے۔

شعر۱۶:

لیکن خدا کے فضل سے یاں ناگرفتہ قرض
جولائے تھے سودے گئے رکھا نہ ایک تار

مفہوم: لیکن خُدا کی مہربانی سے نہ لیا ہوا ادھار یہ جولائے تھے وہ انہیں سارا دینا ہے یہاں تک کہ ایک ایک دھاگا واپس کرنا پڑا یعنی پائی پائی کا حساب دینا پڑا۔

شعر۱۷:

شمشیر ودست وبازو کے ہیں یہ بہت بلی
اپنا تو حرف حق سے گذر نہیں شعار

مفہوم: سوؔدا فرماتے ہیں کہ ہم سچی بات کہنے سے کبھی پیچھے نہیں ہٹتے ہم سچ کہتے ہیں کہ یہ بہت طاقتور اور بہادر ہیں با جرأت اور جواں مرد ہیں۔

شعر۱۸:

پر وہ جو ہیں غلام غلام اِس جناب کے
آگے قدم انہوں کے نہیں ان کا استوار

مفہوم: لیکن اے بادشاہ سلامت آپ کی اطاعت کرنے والے بہادر سپاہیوں کے سامنے یہ قدم نہیں رکھ سکتے۔ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

شعر۱۹:

جرأت میں ان کے حرف نہیں پر یہ کیا کریں
صحبت نہ ان کے دل سے تہور نے کی برار

مفہوم: بہادری میں یہ کوئی وجو نہیں رکھتے۔اس معاملے میں یہ کیا کریں کیوں کہ ان کے دل سے جواں مردی کی دوستی نبھ نہ سکی۔

شعر۲۰،۲۱:

ان میں سے اس غلام کے تھے اکثر آشنا
میں نے کہا انہوں سے کہ تم جیسے جاں گزار
یک قوم ویک برادری ویک گروہ کے
ہو سامنے حریف کے بے حد و بے شمار

مفہوم: سوداؔ فرماتے ہیں کہ ان میں سے زیادہ تر میرے واقف تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ تمہارے جیسے جاں نثار کرنے والے اور ایک ہی قوم سے تعلق رکھنے والے کثیر تعداد میں دشمن کے سامنے لڑنے کو تیار ہوں۔

شعر۲۲:

حافظ کی لاش ڈال گئے معرکہ میں تم
فتح وشکست مردوں کو ہے پر یہ اضطرار

مفہوم: حافظ رحمت خاں کو تم نے مکمل طور پر ہرا دیا۔اس کی تمام طاقت اور اثر ورسوخ ختم کر دیا۔کامیابی و ناکامی زندگی کا حصہ ہیں اور یہ بے چینی مردوں کو اپنی حالت میں بدلنے کے لئے ایک یاد دہانی ہے۔کیوں کہ کوئی بھی فتح ہمیشہ کے لیے نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی شکست ہمیشہ کے لئے رہتی ہے۔

شعر۲۳:

ان میں سے ایک نے بہ دم سرد یہ کہا
خواہش خدا کی یوں تھی نہ تھا اپنا اختیار

مفہوم: ان میں سے ایک نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے فوراً جواب دیا کہ خُدا کی مرضی یہی تھی۔ یہ ہمارے اختیار میں نہیں تھا۔

شعر۲۴:

لیکن جو کچھ کہ واقعی دیکھا سو ہم کہیں
آوے تجھے سخن کا ہمارے گر اعتبار

مفہوم: شاعر فرماتے ہیں کہ سچ مچ ہم نے جو منظر دیکھا اگر تجھے میری بات پر یقین ہے تو میں بیان کروں؟

شعر۲۵:

تھی سامنے ہمارے جو فوج ہر اولیٰ
ہوں گے وہ دس ہزار تلک پیادہ وسوار

مفہوم: ہمارے سامنے والی فوج کا جو اگلا دستہ تھا اس میں سپاہیوں کی تعداد لگ بھگ دس ہزار کے آس پاس تھی۔ ان میں کچھ سوار تھے اور کچھ پیدل۔

شعر۲۶:

سنتے ہیں اب ہر ایک سے اس فوج کی یہی
سرکردہ تھے سمیت فرنگی کے پانچ چار

مفہوم: سوداؔ فرماتے ہیں کہ ممدوح کی فوج کے بارے میں ہر ایک سے یہ سنتے آئے ہیں کہ صرف چار پانچ سردار (کمانڈر) تھے اور جن میں غیر ملکی بھی شامل تھا۔ غیر ملکی یعنی فرنگی کرنل چیمپین کی طرف اشارہ ہے جو اس لڑائی میں انگریزوں کی اُور سے کمانڈر انچیف تھا۔

شعر۲۷:

محبوب اور بسنت ولطافت تھے یک طرف
یک سو تھا میر سید علی مستعد کار

مفہوم: نواب شجاع الدولہ کا سپہ سالار میر سید علی کے علاوہ محبوب علی خاں، بسنت علی خاں اور لطافت علی خاں بھی اس طرف والی فوج کے دستوں کے سردار تھے۔

شعر۲۸:

لیکن انہوں کو آدمی کہیے کہ دیو و دد
ان کا قدم وغا میں یہ پایا ہم استوار

مفہوم: لیکن ان کو جنگ میں بہادری کے ساتھ ڈٹے ہوئے دیکھ کر یوں لگ رہا تھا کہ یہ آدمی نہیں ہیں بلکہ راکھشش وخونخوار شیر ہیں۔

شعر۲۹:

ایدھر سے بان و رہکلا و توپ متصل
پڑتی تھی پر وہ بڑھتے ہی آتے تھے سرگزار

مفہوم: اس طرف سے اگر چہ چھوٹی و بڑی توپیں مسلسل داغی جارہی تھیں مگر پھر بھی وہ سرفروش آگے بڑھتے ہی آرہے تھے۔

شعر۳۰:

بڑھ بڑھ کے آخرش وہ لگے توپیں داغنے
اس پلّے پر جہاں سے جزائر کی ہووے مار

مفہوم: آخر کار وہ آگے نکل کر اس فاصلے پر سے توپیں داغنے لگے جہاں سے بڑی بندوق کا نشانہ لگ سکتا تھا۔

شعر۳۱:

لیکن میں تجھ سے کیا کہوں اے یار اس گھڑی
دکھلائی تھی اجل نے عجب طرح کی بہار

مفہوم: سوداؔ فرماتے ہیں کہ اے دوست میں اس وقت کی لڑائی کا حال تجھ سے کیا بیان کروں کہ موت کا حیران کن منظر دکھائی دے رہا تھا۔

مطلع

شعر۳۲:

تھی کرتیاں تلنگوں کی مانند لالہ زار
تھا دود توپ ابرسیاہ تگرگ بار

مفہوم: جنگ میں سپاہیوں کی وردیاں (کپڑے) لالہ کے کھیت کی طرح دکھائی دیتی تھیں اور توپ سے نکلنے والا دھواں اولے برسانے والے کالے بادل کی مانند تھا انگریزوں نے چوں کہ سب سے پہلے تلنگانہ میں فوج بنائی تھی اس نسبت سے لفظ ''سپاہیوں'' کا استعمال ''تلنگوں'' کے ہم معنی کہا گیا ہے۔

شعر۳۳:

توپیں جو داغتے تھے فتیلوں سے آن آن
رنجک مثال برق چمکتی تھی باربار

مفہوم: سپاہی بندوقوں سے لگا تار جو توپیں داغتے تھے ان سے نکلنے والا بارود آسمانی بجلی کی مانند متواتر چمک رہا تھا۔

شعر۳۴:

گجنال مثل رعد کے کڑکے تھی دم بہ دم
آواز شُترنال تھی طاؤس کی جھنگار

مفہوم: بڑی توپ ہر لمحہ بادل کی گرج کی طرح گونجتی تھی اور اونٹ کی پیٹھ پر رکھنے والی چھوٹی توپ سے نکلنے والی آواز مور کی کھنک (آواز) جیسی تھی۔

شعر۳۵:

بارود وگولہ توپ میں تھا یا وہ باد تھی
جن نے کہ قوم عاد اڑائی تھی جوں غبار

مفہوم: توپ سے نکلنے والا گولہ و بارود عذاب الٰہی کے طور پر آنے والی اس آندھی کا جیسا تھا جس سے قوم عادِ تباہ و برباد ہوگئی تھی۔ شاعر کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ توپ سے نکلنے والے گولہ و بارود کے دھواں سے وہی حالت لڑائی میں سپاہیوں کی ہوئی جو عذابِ الٰہی کے طور پر آنے والی آندھی سے قومِ عاد کی ہوئی تھی۔

شعر۳۶:

فرصت کسو نے اتنی نہ پائی کہ وہ کرے
بندوق وتیغ وتیر سے جا ان میں کار زار

مفہوم: کسی کو اتنی مہلت نہیں ملی کہ وہ میدان جنگ میں جا کر بندوق، تلوار اور تیر سے جنگ کرتا یعنی ہتھیار اُٹھا کر مقابلہ کرتا۔

شعر۳۷:

ہر ایک جا یہی نظر آیا ہر ایک کو

گھوڑا اِدھر جو تڑپے ہے اُدھر پڑا سوار

مفہوم: ہرایک کو ہر جگہ یہی دکھائی دیا کہ ایک طرف گھوڑا پھڑک رہا ہے تو دوسری جانب سوار تڑپ رہا ہے۔

شعر۳۸:

اڑتے تھے یوں پیادے کہ تو دے کو روئی کے

ندّاف کا کمانچہ جوں دے ہے انتشار

مفہوم: پیدل چلنے والا لشکر ہوا میں اوپر اس طرح اڑ رہا تھا جس طرح دُھنیا دھنکی سے روئی کے ڈھیر (کپاس کا گٹھا) کو بکھیرتا ہے یعنی تتر بتر کرتا ہے۔

شعر۳۹:

تھے ہاتھیوں پہ بیٹھے جو حافظ کے ہم نشیں

ساتھ اس کے ہم پیالہ و باہم نوالہ خوار

مفہوم: حافظ رحمت خاں کے ساتھ ایک پیالے میں کھانے والے یعنی ان کے گہرے دوست جو ان کے ساتھ ہی ہاتھیوں پر سوار تھے۔

شعر۴۰:

وہ بھاگے اس طرح کہ یہ کہتی تھی ان کو خلق

بھاگا وہ دیکھو جائے ہے میداں سے کوہسار

مفہوم: وہ اس طرح بھاگے کہ انھیں دیکھ کر لوگ یہ کہنے لگے کہ دیکھو وہ میدان جنگ سے پہاڑ فرار ہو رہا ہے۔ یعنی وہ ہاتھیوں پر پہاڑ کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔

شعر۴۱:

نے لڑنے کے حواس تھے نہ بھاگنے کا ہوش

نے سوچ مرنے کا ہی نہ جینے کا کچھ بچار

مفہوم: وہ اپنے ہوش وحواس اس قدر کھو بیٹھے تھے کہ نہ انھیں لڑنے کی سوجھ بوجھ تھی اور نہ ہی بھاگ جانے کی وہ سوچ رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ انھیں اپنے جینے و مرنے کا غور و فکر بھی نہیں تھا۔

شعر۴۲:

باور ہی کچھ اس کو تو اے یار اس گھڑی
آیا جو کچھ عمل میں نہ تھا اس میں اختیار

مفہوم: شاعر فرماتے ہیں کہ اے دوست یہ یقین کرو کہ اس وقت وہ کوئی اقدام اٹھانے یا کوئی کارروائی کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔

شعر۴۳:

جیدھر کو جس کا منہ اٹھا اودھر کو وہ چلا
سوچے بغیر یہ کہ فلاں جا کروں قرار

مفہوم: جنگ سے فرار ہونے والے جس کسی کی جس طرف مرضی تھی وہ اسی طرف بھاگ نکلا اور بغیر سوچے سمجھے کسی جگہ جا کر سکون حاصل کرنے کی ٹھان گیا۔

شعر۴۴:

ہو یہ غصب تو لاش کا حافظ کی ذکر کیا
بیٹا سسکتے چھوڑ کیا باپ نے فرار

مفہوم: سوداؔ فرماتے ہیں حافظ رحمت خاں کی لاش کا میں کیا بیان کروں۔ لاش کو میدان جنگ میں چھوڑ کر ان کے ساتھی اس طرح فرار ہو گئے جیسے کوئی باپ شدید غصّے میں بیٹے کو روتا چھوڑ کر بھاگ نکلتا ہے۔

شعر۴۵:

حافظ کی لاش ہم سے نہ اٹھی تو نزد فہم
جا گہ نہیں ہے طعن وتعرض کی ہم پہ یار

مفہوم: حافظ رحمت خاں کے قریبی ساتھی جب ان کا جنازہ نہ اٹھا سکے تو انھیں اس قدر لعنت ملامت ہوئی کہ چھپنا مشکل ہو گیا۔ گویا

انھیں چھپنے کے لئے بھی کوئی جگہ نہ ملی۔

شعر۴۶:

لازم نہ تھا اسے کہ ہوا یسے کے سامنے

ہمت میں اور کرم میں ہے جو طاق روزگار

مفہوم: سوؔدا اپنے ممدوح کی عظمت وسخاوت کا ذکر کرتے ہوں فرماتے ہیں کہ حافظ رحمت خاں کے لئے یہ ضروری نہیں تھا کہ اسے شخص (مراد شجاع الدولہ) کا مقابلہ کرے جو زمانے میں بہادری اور سخاوت میں یکتا ہے۔

شعر۴۷:

لے زرسے تا جواہر واز اسپ تا بہ فیل

جس کے ہمم کے آگے نہ رکھے کچھ اعتبار

مفہوم: سوؔدا اس شعر میں پھر اپنے ممدوح کی بہادری کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس کی بہادری وعالی کے سامنے مال ودولت اور گھوڑا وہاتھی وغیرہ یہ تمام بنیادی چیزیں فضول ہیں۔

شعر۴۸:

نے رتبہ زر کو ہے نہ جواہر کو منزلت

نے قدر اسپ کی ہے نہ کچھ فیل کا وقار

مفہوم: شاعر فرماتے ہیں کہ ممدوح کی عظمت ومرتبہ کے سامنے مال ودولت اور گھوڑے ہاتھی کا وقار ورتبہ بے معنی ہے یعنی بے بنیاد ہے۔

شعر۴۹:

خلعت کسی کو، اسپ کسی کو ، کسی کو فیل

بخشے کسی کو لاکھ ، کسی کو دیئے ہزار

مفہوم: سوؔدا کہتے ہیں کہ کسی کو اعزازی لباس تحفہ میں ملا۔ کئی کو گھوڑا اور کئی کو ہاتھی انعام میں ملا۔ اسی طرح کسی کو لاکھ روپے کی رقم ملی اور کسی کو ہزار روپئے نقدی ملے۔

شعر۵۰:

حافظ یہ چاہے عہدہ سے اس کے برآؤں میں

پیادے کو دے کے تین روپے نو روپے سوار

مفہوم: حافظ کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ اپنی ذمہ داری کو نبھاتے ہوئے پیدل والے سپاہی کو تین روپئے اور سوار والے کو نو روپے عطا کرتا۔

شعر۵۱:

کیا کیا کروں میں اس کی شجاعت کا اب بیاں

ہمت کا اس کی کیا کروں اظہار بار بار

مفہوم: سودا فرماتے ہیں کہ میں اپنے ممدوح کی بہادری خوبیوں کو بیان نہیں کرسکتا۔ مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ میں اپنے ممدوح کے اوصاف و ہمت کا تذکرہ کرسکوں۔

شعر۵۲:

''حافظ'' نے سر دیا نہ دیا ''زر'' ہوئی ہے یہ

تاریخ اس کے فوت کی کر لے عدد شمار

مفہوم: رقم نہ ادا کر سکنے کے بدلہ میں حافظ رحمت خاں کو جان قربان کرنی پڑی اور اس کی تاریخ وفات عدد شمار کر کے نکالی گئی ہے۔ یہ شعر دراصل ایک تاریخ گوئی ہے اور اس میں حافظ رحمت خاں کی تاریخ وفات حروف ابجد کے ذریعے نکالی گئی ہے۔ لفظ ''حافظ'' کے اعداد کے جوڑ (8+1+80+900=989) میں سے ''ح (حافظ کا سر)'' کا عدد (8) خارج (981=8-989) کرنے کے بعد ''زر'' کے اعداد یعنی (7+200=207) یعنی 207 میں 981 جوڑ دینے سے 1188 بنتا ہے۔ اس طرح حافظ رحمت خان کی تاریخ وفات ۱۱۸۸ھ نکلتی ہے۔

شعر۵۲:

تاریخ فتح عرض کی سوؔدا نے یوں کہ ''ہو

یہ فتح نو مبارک نوّاب نامدار''

مفہوم: اس شعر میں سوؔدا اپنے ممدوح کی تاریخ فتح بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ نئی فتح مشہور و معزز نواب صاحب کو مبارک باد ہو۔ اس شعر میں شجاع الدولہ کی تاریخ فتح حروف ابجد کے ذریعے نکالی گئی ہے۔ اس شعر میں ''ہو'' سے لیکر'' نامدار'' تک اعداد کا جوڑ 1188 بنتا ہے۔ اس طرح سے شجاع الدولہ کی فتح تاریخ 1188ھ نکلتی ہے۔

12.2.2 : سرگرمی (آو! اپنی معلومات کو جانچیں)

1۔ قصیدہ" آیا عمل میں تیغ سے تیری وہ کارزار" کس صنفِ ادب سے تعلق رکھتا ہے؟

الف) غزل ب) نظم ج) قصیدہ د) مرثیہ

2۔ قصیدے میں کس چیز کی تعریف کی گئی ہے؟

الف) حسن ب) بہادری ج) فطرت د) عشق

3۔ اردو کے مشہور قصیدہ نگار کون ہیں؟

الف) میر ب) سودا ج) اقبال د) فیض

4۔ قصیدے میں "تیغ" سے کیا مراد ہے؟

الف) گھوڑا ب) تاج ج) تلوار د) نیزہ

5۔ قصیدے کی زبان کیسی ہوتی ہے؟

الف) سادہ ب) عامیانہ ج) پرشکوہ د) مزاحیہ

5.3: عمومی جائزہ

قصیدہ" آیا عمل میں تیغ سے تیری وہ کارزار" اردو ادب کی ایک اہم شعری تخلیق ہے جس میں شاعر نے اپنے ممدوح کی بہادری، جنگی صلاحیت اور عظمت کو نہایت مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔ اس قصیدے میں جنگی ماحول کی بھرپور عکاسی ملتی ہے اور شاعر اپنے مخصوص اندازِ بیان سے قاری کے دل میں جوش و ولولہ پیدا کرتا ہے۔ قصیدے کے اشعار میں تلوار کی کاٹ، میدانِ جنگ کی ہولناکی اور دشمنوں پر رعب و دبدبے کا

نقشہ کھینچا گیا ہے۔

شاعر نے اس قصیدے میں مبالغہ، تشبیہ اور استعارے کا خوبصورت استعمال کیا ہے۔ وہ اپنے ممدوح کی بہادری کو اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ اس کی تلوار دشمنوں کے لیے قیامت بن جاتی ہے۔ قصیدے میں زبان نہایت شاندار، فصیح اور بلند آہنگ ہے جو قصیدے کی روایتی خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔ شاعر نے الفاظ کا انتخاب اس مہارت سے کیا ہے کہ ہر شعر اپنے اندر ایک خاص تاثیر رکھتا ہے۔ یہ قصیدہ صرف تعریف و توصیف تک محدود نہیں بلکہ اس میں شاعر کی فنی مہارت بھی نمایاں ہے۔ شاعر نے جنگی مناظر کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ قاری خود کو میدانِ جنگ میں محسوس کرتا ہے۔ اس میں جذبات کی شدت اور قوتِ اظہار نمایاں ہے۔ قصیدے کی یہی خصوصیات اسے اردو ادب میں ممتاز مقام عطا کرتی ہیں۔ قصیدے کی تدریس کے دوران طلبہ کو اس کے اشعار کی تشریح، مشکل الفاظ کے معنی اور ادبی صنعتوں کی وضاحت کی جاتی ہے۔ اس سے طلبہ نہ صرف شعر کے ظاہری مفہوم کو سمجھتے ہیں بلکہ اس کے باطنی حسن اور فنی پہلوؤں سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ اس سبق کے ذریعے طلبہ اردو قصیدے کی روایات، زبان کی عظمت اور کلاسیکی ادب کی اہمیت کو بہتر انداز میں سمجھتے ہیں۔

یہ قصیدہ طلبہ میں ادبی ذوق پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی زبان دانی میں بھی اضافہ کرتا ہے۔ وہ سیکھتے ہیں کہ شاعر کس طرح الفاظ کے ذریعے جذبات، مناظر اور خیالات کو مؤثر انداز میں پیش کرتا ہے۔ اس کے علاوہ طلبہ کو اردو ادب کی کلاسیکی روایت اور شعری اظہار کی قوت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قصیدے کی تدریس اردو ادب کی تعلیم میں اہم مقام رکھتی ہے۔

5.4: آپ نے کیا سیکھا؟

اس سبق کے مطالعے سے آپ نے اردو قصیدے کی اہمیت اور اس کی فنی خصوصیات کو سمجھا۔ انہوں نے جانا کہ قصیدہ اردو ادب کی ایک قدیم صنف ہے جس میں مدح وستائش اور بہادری کا بیان کیا جاتا ہے۔ طلبہ نے قصیدہ" آیا عمل میں تیغ سے تیری وہ کارزار" کے مفہوم، زبان اور اسلوب کا مطالعہ کیا۔

طلبہ نے تشبیہ، استعارہ، مبالغہ اور دیگر ادبی صنعتوں کے استعمال کو پہچانا۔ انہیں معلوم ہوا کہ شاعر کس طرح جنگی مناظر اور بہادری کو مؤثر انداز میں بیان کرتا ہے۔ اس سبق کے ذریعے طلبہ کی زبان دانی، ادبی ذوق اور تنقیدی صلاحیت میں اضافہ ہوا۔ انہوں نے کلاسیکی اردو شاعری کی عظمت اور شعری اظہار کی خوبصورتی کو بھی محسوس کیا۔

5.5:فرہنگ

تیغ	:	تلوار
کارزار	:	میدانِ جنگ
ممدوح	:	جس کی تعریف کی جائے
شجاعت	:	بہادری
رعب	:	خوف
دبدبہ	:	شان وشوکت
بلاغت	:	مؤثر اندازِ بیان
فصاحت	:	زبان کی صفائی
مبالغہ	:	بڑھا چڑھا کر بیان کرنا
تشبیہ	:	کسی چیز کو دوسری چیز سے ملانا
استعارہ	:	مجازی معنی
ولولہ	:	جوش
قیامت	:	تباہی
محاسن	:	خوبیاں
عظمت	:	بڑائی
روایت	:	قدیم طریقہ
تاثیر	:	اثر
ہیبت	:	خوف وجلال

منظر کشی : منظر بیان کرنا

صنفِ سخن : ادبی صنف

5.6: خود جانچ سوالات

1 قصیدہ کیا ہے؟

2 قصیدے میں کن جذبات کا اظہار کیا گیا ہے؟

3 قصیدے میں "تیغ" سے کیا مراد ہے؟

4 شاعر نے کن ادبی صنعتوں کا استعمال کیا ہے؟

5 قصیدے کی زبان کی اہم خصوصیت کیا ہے؟

5.7: مشقی سوالات

1 قصیدہ " آیا عمل میں تیغ سے تیری وہ کارزار" کا مرکزی خیال بیان کریں۔

2 قصیدے میں جنگی مناظر کی عکاسی پر روشنی ڈالیں۔

3 قصیدے کی زبان و بیان کا جائزہ لیں۔

4 شاعر کی فنی مہارت پر مضمون لکھیں۔

5 قصیدے میں استعمال ہونے والی ادبی صنعتوں کی وضاحت کریں۔

5.8: جواباتِ سرگرمی

1۔ ج) قصیدہ

2۔ ب) بہادری

3۔ ب) سودا

4۔ ج) تلوار

5۔ ج) پرشکوہ

5.8.1: مشقی سوالات کے جوابات

1 قصیدے کا مرکزی خیال ممدوح کی بہادری، جنگی صلاحیت اور عظمت کا بیان ہے۔ شاعر نے اس کی تلوار کی طاقت اور دشمنوں پر اس کے رعب کو مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔

2 قصیدے میں جنگی مناظر نہایت جاندار انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ شاعر نے میدانِ جنگ، تلوار کی کاٹ اور دشمنوں کی شکست کو مؤثر انداز سے بیان کیا ہے۔

3 قصیدے کی زبان بلند آہنگ، فصیح اور شاندار ہے۔ اس میں تشبیہات، استعارات اور مبالغے کا خوبصورت استعمال کیا گیا ہے۔

4 شاعر نے اپنی فنی مہارت سے قصیدے کو مؤثر اور پُر جوش بنایا۔ اس کی منظر نگاری اور الفاظ کا انتخاب قابلِ تعریف ہے۔

5 قصیدے میں تشبیہ، استعارہ، مبالغہ اور صنعتِ تلمیح جیسی ادبی صنعتوں کا استعمال کیا گیا ہے جس سے اشعار کا حسن بڑھ گیا ہے۔

5.9: امدادی کتب

1۔ اردو قصیدہ نگاری — ڈاکٹر محمد کمال الدین

2۔ اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ — ڈاکٹر محمود الٰہی

3۔ انتخاب قصائد اردو — مغیث الدین فریدی

4۔ مرثیہ اور مرثیہ نگار — ڈاکٹر شاداب ردولوی

5۔ اردو مرثیہ — سید علی عباس حسینی

6۔ میر انیس اور دبیر — شبلی نعمانی

سبق6: قصیدہ ''درتہنیت جشن صحت مرزا محمد ابوظفر'' (ذوقؔ)

ساخت

6.0: اغراض ومقاصد

6.1: تعارف

6.2: قصیدہ ''درتہنیت جشن صحت مرزا محمد ابوظفر''

6.2.1 : متن کی تدریس

6.2.2 : سرگرمی (آو! اپنی معلومات کو جانچیں)

6.3: عمومی جائزہ

6.4: آپ نے کیا سیکھا؟

6.5: فرہنگ

6.6: خود جانچ سوالات

6.7: مشقی سوالات

6.8: جواباتِ سرگرمی

6.8.1: مشقی سوالات کے جوابات

6.9: امدادی کتب

6.0 :اغراض ومقاصد

اس سبق کو پڑھانے کا بنیادی مقصد آپ کو اردو قصیدہ نگاری کی روایت سے متعارف کرانا ہے۔اس کے ذریعے آپ کو یہ سمجھایا جاتا ہے کہ قصیدہ اردو شاعری کی ایک اہم صنف ہے جس میں شاعر اپنے جذبات، مشاہدات اور خیالات کو پُر اثر انداز میں بیان کرتا ہے۔ ذوق کے اس قصیدے کے مطالعے سے آپ اردو زبان کی لطافت، فصاحت اور شگفتگی کو محسوس کرتے ہیں۔اس سبق کے ذریعے آپ میں فطرت سے محبت اور حسنِ فطرت کا شعور پیدا کرنا بھی مقصود ہے۔ شاعر نے بہار، باغ، پھولوں اور خوشگوار ہوا کے ذریعے زندگی کی تازگی اور شادابی کو نمایاں کیا ہے۔ آپ اس نظم کے مطالعے سے قدرتی مناظر کی اہمیت اور ان کے جمالیاتی اثرات کو سمجھتے ہیں۔

یہ سبق طلبہ کی ادبی صلاحیتوں کو فروغ دینے میں بھی مددگار ثابت ہوتا ہے۔ قصیدے میں استعمال ہونے والی تشبیہوں، استعارات، صنعتوں اور محاورات کے ذریعے طلبہ زبان و بیان کے حسن سے واقف ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ ان میں شعر فہمی، تنقیدی سوچ اور ادبی ذوق پیدا ہوتا ہے۔اس سبق کا ایک اہم مقصد طلبہ کی زبان دانی کو بہتر بنانا بھی ہے۔ مشکل الفاظ، محاورات اور خوبصورت تراکیب کے ذریعے طلبہ کے ذخیرہ؟ الفاظ میں اضافہ ہوتا ہے۔ وہ درست تلفظ، روانی اور مؤثر اندازِ بیان سیکھتے ہیں۔اس تدریسی عمل کے نتیجے میں طلبہ اردو ادب کی کلاسیکی روایت کو سمجھنے کے قابل ہوتے ہیں اور ان میں شاعری سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ یوں یہ سبق نہ صرف علمی و ادبی شعور پیدا کرتا ہے بلکہ طلبہ کی فکری اور جمالیاتی تربیت بھی کرتا ہے۔

6.1: تعارف

شیخ محمد ابراہیم ذوق اردو شاعری کے ایک عظیم قصیدہ گو شاعر تھے۔ان کا شمار دہلی دبستانِ شاعری کے اہم ستونوں میں ہوتا ہے۔ ذوق نے اپنی شاعری میں زبان کی صفائی، محاورے کی چاشنی، سادگی اور فصاحت کو نمایاں مقام دیا۔ان کے قصائد دربارِ مغلیہ کی شان و شوکت، تہذیبی عظمت اور قدرتی مناظر کی خوبصورت عکاسی کرتے ہیں۔'' واہ واہ کیا معتدل ہے باغِ عالم میں ہوا'' ذوق کا ایک مشہور قصیدہ ہے جس میں شاعر نے موسمِ بہار، فطرت کی دلکشی اور انسانی جذبات کو نہایت دلنشیں انداز میں بیان کیا ہے۔اس قصیدے میں شاعر نے باغ، پھولوں، خوشبوؤں، پرندوں اور بہار کی لطافتوں کا ایسا مرقع پیش کیا ہے کہ قاری خود کو ایک حسین باغ میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ ذوق کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ عام الفاظ میں غیر معمولی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ قصیدے کا آغاز بہاریہ منظر نگاری سے ہوتا ہے جہاں نرم و معتدل ہوا، کھلے ہوئے پھول، مہکتی

فضائیں اور فطرت کی تازگی دل کو مسرور کر دیتی ہے۔شاعر نے بہار کے حسن کو انسانی جذبات کے ساتھ اس طرح جوڑا ہے کہ قاری کے دل میں شادمانی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ قصیدہ صرف فطرت کی تعریف تک محدود نہیں بلکہ اس میں انسانی زندگی کے لیے خوشی، امید اور تازگی کا پیغام بھی موجود ہے۔شاعر نے موسمِ بہار کو زندگی کی خوشحالی اور روحانی مسرت کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ذوق کی زبان نہایت رواں، شستہ اور دلکش ہے۔ان کے اشعار میں صنعتوں کا استعمال بھی خوبصورت انداز میں ملتا ہے، مگر کہیں تصنع محسوس نہیں ہوتا۔ادبی اعتبار سے یہ قصیدہ اردو قصیدہ نگاری کی بہترین مثالوں میں شمار ہوتا ہے۔اس میں منظر نگاری، تشبیہ، استعارات اور موسیقیت کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہ نظم نصابی اہمیت رکھتی ہے اور طلبہ کے ادبی ذوق کو نکھارنے میں مدد دیتی ہے۔اس قصیدے کے مطالعے سے طلبہ نہ صرف اردو زبان کی خوبصورتی سے آشنا ہوتے ہیں بلکہ فطرت سے محبت اور جمالیاتی احساس بھی پیدا کرتے ہیں۔

6.2 : قصیدہ ''درتہنیت جشن صحت مرزا محمد ابوظفر''

واہ واکیا معتدل ہے باغ عالم میں ہوا
مثل نبض صاحب صحت ہے ہر موج صبا

بھرتی ہے کیا کیا مسیحائی کا دم بادِ بہار
بن گیا گلزار عالم رشک صد دارالشفا

ہے گلوں کے حق میں شبنم مرہم زخم جگر
شاخ بشکستہ کو ہے باراں کا قطرہ مومیا

ہوگیا موقوف یہ سودا کا بالکل احتراق
لالہ بے داغ سیہ پانے لگا نشو ونما

ہوگیا زائل مزاج دہر سے یاں تک جنوں
بید مجنوں کا بھی صحرا میں نہیں باقی پتا

ہوتا ہے لطف ہوا سے اس قدر پیدا لہو
برگ میں ہر نخل کے سرخی ہے جوں برگ حنا

پائی یہ اصلاح صفرانے کہ دنیا میں کہیں
زرد چشم اب دیکھنے کو بھی نہیں ہے کہربا

ہر مزاج بلغمی میں ہوتی ہے تولید خوں
چاندنی کا پھول ہو گر ارغوانی ہے بجا

نام کو اشیا میں ،نے تلخی رہی نے سمیت
بن گئی تریاکِ افیون، زہر میٹھا ہوگیا

کیا عجب جدوار کی تاثیر گرر کھے زقوم
کیا عجب گر آب حنظل دیوے شربت کا مزا

نیش کی جا نوش ہو دُنبالۂ زنبور میں
کام میں افعی کے ہو مہرہ بجائے آبلا

راحت وآرام کا اس دور میں ہے دور دور
چاہیئے واقف نہ ہو دوران سر سے آسیا

موتیا بند آنکھ میں اپنے جو رکھتی ہے صدف
اب رکھے ہے روشنی مثل دل اہل صفا

آگیا اصلاح پر ایسا زمانے کا مزاج
تا زبانِ خامہ بھی آتا نہیں حرف دوا

نسخے پر لکھنے نہیں پاتا ہوالشافی طبیب
کہتا ہے بیمار بس کر مجھ کو بالکل ہے شفا

فرق جاپایاں تک اعضائے بدن سے درد نے
درد کے جو حرف ہیں وہ آپ بھی ہیں سب جدا

لاغروں کو ہو کمال تاب وطاقت یہ شتاب
کیسے دو ہفتے، ہلال اک شب میں ہو بدرالدُّجا

صبح صادق کے ہے، گو سر میں سپیدی آگئی
لیکن اس پیری میں بھی صادق ہے ایسی اشتہا

بھوک کی شدت سے اس کو اک نفس فرصت نہ ہو
قرص سے خورشید کے جب تک نہ کرلے ناشتا

رات بھر ٹھونگا کیا انجم کے دانے چرخ پیر
پھر جو دیکھا صبح کو اصلا شکم میں کچھ نہ تھا

پہنچی یہ تفتیح کی نوبت کہ نوبت خانے میں
لیتی ہے جی کھول کر کیا کیا ڈکاریں کرنا

کوس پھولا ہے خوشی سے نفخ کا کیا دخل ہے
جوں حباب اس کے نہیں مطلق شکم میں امتلا

ہضم کامل اس قدر معدے نے پہنچایا بہم
جیّدالکیموس ہے جو حلق سے اُترے غذا

ہے مزاج اہل عالم یہ قریب اعتدال
ساتوں اقلیمیں ہیں گویا اب بخط استوا

رکھے گا تعویذ اور گنڈا کوئی کیوں اپنے پاس
باغ عالم میں یہی عالم جو صحت کا رہا

دے گا طاؤس اپنے بال وپر سے سارے نقش دھو
پھینک دے گی توڑ کر گنڈا گلے سے فاختا

اس قدر جاتی رہی عالم، سے بیماری کہ آج
نام گلشن میں نہیں ہے نرگس بیمار کا

واقعی کس طرح سے صحت نہ اک عالم کو ہو
جب کہ ہو اس کو نوید غسل صحت جاں فزا

وہ ولی عہد زماں مرزا محمد بوظفر
اس کی قوت گر ضعیفوں کو بنادے اقویا

تقویت کا یہ اثر ہو عام جو ہیں برگ زرد
ہوں مقوی دل وجاں مثل اوراق طلا

شادیٔ صحت سے اس کی آج ہو کر شاد شاد
تہنیت خوانی میں ہیں سرگرم سب مدحت سرا

میں بھی اس رشک چمن محفل میں وہ مطلع پڑھوں
بلبل تصویر سن کر بول اٹھے مرحبا

مطلع

آج ہے عالم میں وہ روز سعادت انتما
دے اگر زاغ وزغن بیضہ تو ہو پیدا ہُما

مژدۂ جاں بخش صحت ہے تراماء الحیات
جس سے جوں سیماب کشتہ مردہ دل زندہ ہوا

ہے بقائے عمر سے تیری بقاے عمر خلق
ذات ہے تیری جہاں میں چشمۂ آب بقا

قطرہ افشانی سے آبِ غسل صحت کی ترے
ہوں دُر خوش آب پیدا اس قدر قوت فزا

ہوویں استعمال یاقوتی میں وہ موتی اگر
بخشے پیران کہن کو نوجوانوں کے قوا

جسم کو مل مل کے دھویا تو نے جس دم وقت غسل
گرد کلفت کو دل عالم سے گویا دھو دیا

دل عدوے سنگ دل کا تھا شقاوت سے جو سخت
زیر پا پامال ہوتا تھا برنگ سنگ پا

خُردۂ گل کو صبا لائی تصدق کے لئے
دے گیا ابر بہاری نذر دُرّ بے بہا

شادیٔ صحت کا تیری کیا کہوں عالم کہ آج
جوش عشرت سے یہ عالم بن گیا عشرت سرا

چھیڑے تارشمع کو گر ناخن موج نسیم
بزم میں پیدا ہوتارِساز مطرب کی صدا

لب پہ ساغر کے ہے جوں موج تبسم موج مے
شور قلقل لب پہ ہے مینائے مے کے قہقہا

بزم تصویرات فانوس خیالی کی طرح
حلقۂ رقاص گاں ہے زیر گردوں جابجا

کررہا صحن چمن ہی میں ہے کیا طاؤس رقص
آشیانے میں ہے رقصاں طائر قبلہ نما

خانہ ہائے چشم میں بھی پتلیوں کا رقص ہے
ہے جو منظور نظر سب کو تماشا رقص کا

چھوٹی آتشبازی ایسی جس کی گلکاری کو دیکھ
رات کو کہتے تھے آپس میں ثریا وسہا

صنع آتش باز پر حیرت زدہ ہوتی ہے عقل
سنگ پارس سے کہیں باروت کو پیسا تھا کیا

ہوگئی تاثیر جس کی یہ کہ ہر گلریز سے
ریزۂ فولاد نکلے بن کے گل ہائے طلا

گنج چھٹتے تھے ستاروں کے عجب انداز سے — ماہ پاروں کا تھا گویا خندہ دنداں نما

منہ ہے کیا جو رنگ سے مہتاب کے ہم تاب ہو — غازے سے ہر چند چمکے رنگ روے مہ لقا

برج جو اڑ کر ہوئے قندیل شب زیر فلک — برج تھے جتنے فلک پر سب کو روشن کردیا

فی الحقیقت یہ وہ شادی ہے کہ اس کے روبرو — جشن جمشیدی کا کچھ مطلق نہیں رتبہ رہا

ہے زبان خامہ عاجز آگے بس تعریف میں — ذوقؔ کہتا ہے اٹھا کر ذوق میں دست دعا

رکھے صحت سے ہمیشہ شافیٔ مطلق تجھے

جو ترے بدخواہ ہوں وہ رنج میں ہوں مبتلا

6.2.1 :متن کی تدریس

شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ جنہیں مرزا رفیع محمد سوداؔ کے بعد اردو کا سب سے بڑا قصیدہ گو تسلیم کیا گیا ہے نے اپنی زباں دانی اور فنی مہارت سے اردو قصیدہ کو عروج بخشا۔ ان کے تمام قصائد اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کی تعریف میں ہے۔ وہ چھوٹی عمر میں ہی اکبر شاہ ثانی کے دربار سے ''خاقانی ہند'' کا خطاب حاصل کر کے ملک الشعرا بن گئے۔ مضامین کی تازگی، فارسی قصیدہ سے استفادہ، زبان ں وبیان کی صفائی، تخئیل کی بلند پروازی، علمی اصطلاحات وتلمیحات، مناسب تشبیہات واستعارات وغیرہ ذوقؔ کے قصائد کی اہم خصوصیات ہیں۔ ان کا ایک اہم قصیدہ ''درتہنیت جشن صحت مرزا محمد ابوظفر'' ڈائرکٹوریٹ آف ڈسٹینس اینڈ آن لائن ایجوکیشن یونیورسٹی آف جموں کے ایم اے اردو سمسٹر اول کے کورس نمبر ۱۰۲ (قصیدہ ومرثیہ) کے نصاب میں شامل ہے۔ مرزا محمد ابوظفر مغلیہ تاجدار اکبر شاہ ثانی کے بیٹے اور دہلی کے آخری مغل بادشاہ تھے۔ وہ ۱۷۷۵ء (۱۱۸۹ھ)، میں پیدا ہوئے اور ۱۸۳۷ء (۱۲۵۳ھ) میں بہادر شاہ کے خطاب سے دہلی کے تخت پر بیٹھے۔ مرزا ابو محمد ظفر اپنے ولی عہد میں ایک بار سخت بیمار ہوئے اور جب صحت یاب ہوئے تو اکبر شاہ ثانی نے جشن غسل منایا۔ ذوقؔ کا یہ قصیدہ پس اس زمانہ کی یادگار ہے۔ اس قصیدہ کی تشبیب بہاریہ ہے۔ قصیدہ ''درتہنیت جشن صحت مرزا محمد ابوظفر'' کے اشعار کی شرح ملاحظہ فرمائیے:

واہ واکیا معتدل ہے باغ عالم میں ہوا

مثل نبض صاحب صحت ہے ہر موج صبا

مفہوم: ذوقؔ فرماتے ہیں کہ سبحان اللہ دنیا کے باغ یعنی دنیا میں کتنی خوشگوار (اعتدال والی) ہوا ہے جس کا ہر جھونکا اس طرح سے چل رہا ہے جیسے ایک تندرست انسان کی نبض صحیح رفتار سے حرکت کرتی ہے۔

شعر۲:

بھرتی ہے کیا کیا مسیحائی کا دم بادِ بہار
بن گیا گلزار عالم رشک صد دارالشفا

مفہوم: صبح کی ہوا میں حضرت عیسیٰ کی سی شفا بخش صفت ہے۔یعنی صبح کے وقت چلنے والی ہوا مردہ دلوں میں زندگی بخشنے کا دعویٰ کر رہی ہے۔اور اس وجہ سے باغ اب دنیا کے سینکڑوں شفا خانوں کا رشک گاہ بن گیا ہے۔

شعر۳:

ہے گلوں کے حق میں شبنم مرہم زخم جگر
شاخ بشکستہ کو ہے باراں کا قطرہ مومیا

مفہوم: اوس میں یہ خاصیت پیدا ہوگئی ہے کہ وہ پھولوں کے جگر کے زخم کے لئے مرہم کا کام دے رہی ہے اور بارش کا قطرہ ٹوٹی ہوئی شاخ کو اس طرح جوڑ دیتا ہے جیسے مومیا سے ٹوٹی ہوئی ہڈی جُڑتی ہے۔

شعر۴:

ہوگیا موقوف یہ سودا کا بالکل احتراق
لالہ بے داغ سیہ پانے لگا نشو ونما

مفہوم: سودا بمعنی عشق سے ہونے والی جلن وسوزش (گرمی کی شدت) مکمل طور پر ختم ہونے کی وجہ سے اب لالہ کا پھول سیاہ داغ کے بغیر نشو ونما پانے لگا ہے۔اس سے مراد یہ ہے کہ عشق سے ہونے والی گرمی کی شدت سے ہی لالہ کے سینہ میں سیاہ داغ پڑا تھا مگر اب چوں کہ یہ پوری طرح ختم ہوگئی ہے اس لئے لالہ کے سینہ میں سیاہ داغ نہیں رہا۔

شعر۵:

ہوگیا زائل مزاج دہر سے یاں تک جنوں
بید مجنوں کا بھی صحرا میں نہیں باقی پتا

مفہوم: زمانے کا مزاج یہاں تک بدل چکا ہے کہ جو لوگ شدید ذہنی بیماری میں مبتلا تھے وہ اب ٹھیک ہو گئے ہیں اور باریک پتے و نازک شاخوں والا بید کا درخت کا سراغ بھی اب جنگل میں کہیں نہیں ملتا۔

شعر۶:

ہوتا ہے لطف ہوا سے اس قدر پیدا لہو
برگ میں ہر نخل کے سرخی ہے جوں برگ حنا

مفہوم: خوشگوار ہوا میں اس قدر خون بننے کی تاثیر ہے کہ ہر پودے کا پتّا مہندی کے پتے کی طرح سرخ ہو گیا ہے۔

شعر۷:

پائی یہ اصلاح صفرانے کہ دنیا میں کہیں
زرد چشم اب دیکھنے کو بھی نہیں ہے کہربا

مفہوم: پِتّہ یعنی جگر کے قریب چھوٹی تھیلی نما عضو میں جو زرد رنگ کا مادہ ہوتا ہے اس میں یہاں تک بہتری آ گئی ہے کہ اب پیلا پن بالکل ختم ہو گیا ہے۔اس طرح پیلے پن کے خاتمے سے اب دُنیا میں پیلیا (یرقان) کی بیماری میں کوئی مبتلا نظر نہیں آتا۔

شعر۸:

ہر مزاج بلغمی میں ہوتی ہے تولید خوں
چاندنی کا پھول ہو گر ارغوانی ہے بجا

مفہوم: بلغم (کف) کے مزاج والے جسم میں خون بننا اب قدرتی عمل بن گیا ہے۔بلغم جو سفید رنگ کا ہوتا ہے جس طرح خون جیسا سرخ بن گیا ہے ٹھیک اُسی طرح چاندنی کا پھول (سفید رنگ کا پھول) اگر ارغوانی یعنی سُرخ رنگ کا پھول بن جائے تو درست ہے۔

شعر۹:

نام کو اشیا میں ،نے تلخی رہی نے سمیت
بن گئی تریاکِ افیون، زہر میٹھا ہوگیا

مفہوم: جو چیزیں نشیلی، کڑوی اور زہریلی تھیں ان میں نشیلا پن، کرواہٹ اور زہریلا پن اس قدر خاتمہ ہو گیا ہے کہ اب ان کا استعمال

بطور زہرمہرہ یعنی زہرکوختم کرنے والی دوائی کے طور پر ہوتا ہے۔

شعر۱۰:

کیا عجب جدوار کی تاثیر گر رکھے زقوم

کیا عجب گر آب حنظل دیوے شربت کا مزا

مفہوم: خاردار وزہریلا پودا (تھوہڑ) اگر زہرکوختم کرنے والی جڑی یعنی نربسی کا اثر رکھتا ہے۔تو یہ کوئی حیران کن بات نہیں ہے۔اگر کڑوے پھل کا رَس شربت جیسا میٹھا لطف دے تو یہ بھی کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔

شعر۱۱:

نیش کی جا نوش ہو دُنبالۂ زنبور میں

کام میں افعی کے ہو مہرہ بجائے آبلا

مفہوم: بھڑ (شہد کی مکھی) کی دم کی ڈنک میں شہد جیسا لطف ہے یعنی بھڑ کے کاٹنے سے اب درد نہیں ہوتا بلکہ مزہ آتا ہے اور اسی طرح زہریلے سانپ کے ڈسنے سے جو چھالا بنتا ہے وہ زہرمہرہ کا اثر رکھتا ہے۔

شعر۱۲:

راحت وآرام کا اس دور میں ہے دور دور

چاہیئے واقف نہ ہو دوران سرسے آسیا

مفہوم: اس عہد میں سکون وآرام کا عام چرچا ہے یعنی آرام وسکون کے بارے میں لوگ چرچا کرتے رہتے ہیں اور سکون کی وجہ سے چکی بھی چکر سے واقف نہیں ہے۔اس سے مراد یہ ہے کہ چکی جو پہلے ہر وقت گھومتی رہتی تھی اب اسے گھومنے سے نجات مل گئی ہے۔

شعر۱۳:

موتیا بند آنکھ میں اپنے جو رکھتی ہے صدف

اب رکھے ہے روشنی مثل دل اہل صفا

مفہوم: ایک صاف شفاف موتی جیسی دُھندلے پن والی آنکھ میں اب روشنی اس طرح موجود ہے جس طرح صوفیہ کا دِل صاف

اور پاک ہوتا ہے۔

شعر۱۴:

آگیا اصلاح پر ایسا زمانے کا مزاج

تا زبانِ خامہ بھی آتا نہیں حرف دوا

مفہوم: موجودہ دور کی زندگی کے طرزِ فکر میں اس قدر بہتری آگئی ہے کہ اب قلم کی نوک پر بھی لفظ ''دوا'' نہیں آتا۔ عرض یہ کہ تمام بیماریوں اور برائیوں کا خاتمہ ہوگیا۔ اس طرح اب لفظ دوا لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں پڑتی۔

شعر۱۵:

نسخے پر لکھنے نہیں پاتا ہوالشافی طبیب

کہتا ہے بیمار بس کر مجھ کو بالکل ہے شفا

مفہوم: مریض کی شفا کے لئے حکیم پہلے نسخے پر لکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ شفا دینے والا ہے۔ لیکن اب اسے یہ لکھنے کی نوبت نہیں آتی کیونکہ لکھنے سے پہلے ہی مریض صحت یاب ہوگیا ہے۔

شعر۱۶:

فرق چاہا یاں تک اعضائے بدن سے درد نے

درد کے جو حرف ہیں وہ آپ بھی ہیں سب جدا

مفہوم: جسمانی حصوں سے درد یہاں تک ختم ہوگیا ہے کہ اب لفظ ''درد'' کے حروف الگ الگ ہو کر اپنی اصلی شکل میں آگئے ہیں۔ ان میں جوڑ ختم ہوگیا ہے۔ ایک دوسرے سے جُدا ہوگئے ہیں جیسے د، ر، د۔

شعر۱۷:

لاغروں کو ہو کمال تاب وطاقت یہ شتاب

کیسے دو ہفتے، ہلال اک شب میں ہو بدر الدُّ جا

مفہوم: صحت اور تندرستی کا یہ عالم ہے کہ ہر کوئی کمزور جسم اس قدر مکمل طور پر بہت جلد صحت یاب ہو رہا ہے کہ جیسے پہلی رات کا چاند دو ہفتے

میں بدر کامل یعنی چودھویں کا چاند بن جاتا ہے۔

شعر۱۸۔۱۹:

صبح صادق کے ہے ،گو سر میں سپیدی آگئی
لیکن اس پیری میں بھی صادق ہے ایسی اشتہا
بھوک کی شدت سے اس کو اک نفس فرصت نہ ہو
قرص سے خورشید کے جب تک نہ کرلے نا شتا

مفہوم: اس دور میں جو کوئی بھی عمر رسیدہ ہے وہ بوڑھا ہونے کے باوجود زندگی کی ایک نئی امید کا آغاز کرر ہا ہے اور اس بڑھاپے کی عمر میں بھی وہ صحت مندانہ (صحیح) بھوک محسوس کرتا ہے۔لحہ بہ لحہ اس کے کھانے کی خواہش میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور علی الصباح جب تک وہ ناشتہ نہ کرلے تب تک اسے سخت بھوک کی شدت رہتی ہے۔

شعر۲۰:

رات بھر ٹھونگا کیا انجم کے دانے چرخ پیر
پھر جو دیکھا صبح کو اصلا شکم میں کچھ نہ تھا

مفہوم: بوڑھا آسمان دانوں کی طرح ایک ایک ستارے کو پوری رات کھاتا رہتا ہے لیکن صبح اس کا پیٹ بالکل خالی ہوتا ہے یعنی صبح آسمان بالکل خالی نظر آتا ہے۔

شعر۲۱:

پہنچی یہ تفتیح کی نوبت کہ نوبت خانے میں
لیتی ہے جی کھول کر کیا کیا ڈکاریں کرنا

مفہوم: پیٹ سے آواز کے ساتھ گیس خارج ہونے کا یہ عالم ہوگیا ہے کہ جیسے نقار خانہ سے جان بوجھ کر بار بار تر ہی (کرنا) سے ڈھنڈورا پیٹوانے کا عمل جاری ہے۔

شعر۲۲:

کوس پھولا ہے خوشی سے نفخ کا کیا دخل ہے
جوں حباب اس کے نہیں مطلق شکم میں امتلا

مفہوم: خوشی سے پیٹ نقارہ کی طرح پھولا ہوا ہے اور پھولنے کے باوجود پیٹ میں بلبلہ کی طرح بدہضمی کا معاملہ بالکل نہیں ہے۔

شعر۲۳:

ہضم کا مل اس قدر معدے نے پہنچایا بہم
جیّدالکیموس ہے جو حلق سے اُترے غذا

مفہوم: معدے میں پوری طرح غذا کو تحلیل کرنے کی صلاحیت اس قدر پیدا ہوگئی ہے کہ کھانا گلے سے نگلتے ہی فوراً ہضم ہوجاتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اب معدے کو کھانا تحلیل کرنے میں کوئی دشواری نہیں آتی۔

شعر۲۴:

ہے مزاج اہل عالم یہ قریب اعتدال
ساتوں اقلیمیں ہیں گویا اب بخط استوا

مفہوم: دنیا کے لوگوں کا مزاج اب میانہ روی سے اس قدر قریب ہے کہ جیسے سات ملک یعنی عرب، ایران، توران، چین، ہند، مصر، یونان تمام ایک ہی سمت میں آگئے ہیں یعنی تمام دنیا خط استوا پر آگئی ہے۔

شعر۲۵:

رکھے گا تعویذ اور گنڈا کوئی کیوں اپنے پاس
باغ عالم میں یہی عالم جو صحت کا رہا

مفہوم: دنیا میں تندرستی کا یہ عالم ہے کہ اب کسی کو اپنے بچاؤ کے لئے گلے یا بازو میں نقش ڈالنے اور بیماری دور کرنے کے لئے بچوں کے گلے یا بازو میں حلقہ باندھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

شعر۲۶:

دے گا طاؤس اپنے بال وپر سے سارے نقش دھو
پھینک دے گی توڑ کر گنڈا گلے سے فاختا

مفہوم: موربھی اب اپنے تمام نشانات (نقش ونگار) کودھوکر صاف کردے گا اور قمری کے گلے سے حلقہ بھی مٹ جائے گا یعنی مور کے بال وپر اور قمری کے گلے سے تمام دھبے غائب ہو جائیں گے۔

شعر۲۷:

اس قدر جاتی رہی عالم، سے بیماری کہ آج
نام گلشن میں نہیں ہے نرگس بیمار کا

مفہوم: اس دور میں دنیا سے بیماری کا خاتمہ اس قدر ہو گیا ہے کہ اب بیمار کی آنکھ کی طرح نشیلی وشرمیلی حالت والا نرگس کا پھول باغ میں کہیں پر بھی دکھائی نہیں دیتا۔

شعر۲۸:

واقعی کس طرح سے صحت نہ اک عالم کو ہو
جب کہ ہو اس کو نوید غسل صحت جاں فزا

مفہوم: سچ مچ تمام دنیا میں تندرستی کا بول بالا کیوں نہ ہو، کیوں کہ صحت یابی کی خوش خبری ہی جان میں جان ڈالنے والی ہے یعنی جان بخشنے والی ہے۔

شعر۲۹:

وہ ولی عہد زماں مرزا محمد بوظفر
اس کی قوت گر ضعیفوں کو بنادے اقویا

مفہوم: مرزا محمد ابوظفر بادشاہ وقت کا ہونے والا وہ جانشین ہے جس کی تندرستی میں کمزور لوگوں کو طاقتور بنانے کا راز مضمر ہے۔

شعر۳۰:

تقویت کا یہ اثر ہو عام جو ہیں برگ زرد

ہوں مقوی دل وجاں مثل اوراق طلا

مفہوم: ولی عہد کی تندرستی کے اثر سے مرجھاتے ہوئے تمام پتوں میں اب سونے کے ورق جیسی وہ خاصیت پیدا ہوگئی ہے جس کے استعمال سے دل ودماغ میں طاقت پیدا ہوتی ہے۔

شعر۳۱:

شادیٔ صحت سے اس کی آج ہو کر شاد شاد

تہنیت خوانی میں ہیں سرگرم سب مدحت سرا

مفہوم: اس کی صحت کی خوشی میں آج تمام تعریف کرنے والے انتہا خوش ہوکر مبارک باد پڑھنے میں مشغول ہیں۔غرض یہ ہے کہ تمام مدح کرنے والے قصیدے پڑھ رہے ہیں۔

شعر۳۲:

میں بھی اس رشک چمن محفل میں وہ مطلع پڑھوں

بلبل تصویر سن کر بول اٹھے مرحبا

مفہوم: ذوقؔ فرماتے ہیں کہ باغ کی خوبصورتی کو شرما دینے والی اس دلکش اور حسین مجلس میں کیوں نہ میں بھی وہ مطلع پڑھوں کہ جس کو سن کر تصویر کا بلبل بھی واہ واہ کہہ اُٹھے۔

مطلع

شعر۳۳:

آج ہے عالم میں وہ روز سعادت انتما

دے اگر زاغ و زغن بیضہ تو ہو پیدا ہُما

مفہوم: دنیا میں یہ دن اس قدر خوش نصیبی کا دن ہے کہ کوّا اور چیل کے انڈے سے بھی ایک خوش بخت پرندہ پیدا ہوتا ہے۔یعنی موجودہ

دورخوش بختی کا دور ہے۔حالیہ دنوں بے بنیاد اور ناممکن کام بھی بابنیادداور ممکن ہوتا ہے۔

شعر۳۴:

مژدۂ جاں بخش صحت ہے تراماء الحیات

جس سے جوں سیماب کشتہ مردہ دل زندہ ہوا

مفہوم: ذوقؔ اپنے ممدوح سے مخاطب ہوکر فرماتے ہیں کہ تیری صحت یابی کی خوشخبری اُس آبِ حیات کی مانند ہے جو جسم و جان کو تازگی بخشتا ہے۔تیری تندرستی سے وہ دل جو پہلے مردہ تھا اب زندہ ہوگیا ہے۔جو بے قرار تھا اسے اب سکون مل گیا ہے۔

شعر۳۵:

ہے بقائے عمر سے تیری بقاے عمر خلق

ذات ہے تیری جہاں میں چشمۂ آب بقا

مفہوم: اے ولی عہد تیری لمبی عمر قائم رہنے میں مخلوق کی عمر کی بقاہےاوراس دنیا میں تیراوجود چشمۂ خضر کی مانند ہے۔

شعر۳۶۔۳۷:

قطرہ افشانی سے آبِ غسل صحت کی ترے

ہوں دُر خوش آب پیدا اس قدرقوت فزا

ہوویں استعمال یاقوتی میں وہ موتی اگر

بخشے پیران کہن کو نوجوانوں کے قوا

مفہوم: تیرے جسم کو پاک کرنے والی پانی کی بوند ٹپکنے سے اس قدر قوت بڑھانے والے چمکدار اور خوبصورت موتی نمودار ہوں کہ وہ موتی اگر طاقت پیدا کرنے والے معجون میں استعمال کیے جائیں تو اس معجون کے استعمال سے پرانے بزرگوں میں نوجوانوں جیسی طاقت پیدا ہوگی۔

شعر۳۸:

جسم کو مل مل کے دھویا تونے جس دم وقت غسل

گرد کلفت کو دل عالم سے گویا دھو دیا

مفہوم: اے ولی عہد نہاتے وقت جب تو نے اپنے جسم کو خوب مل کے دھویا اور صاف کیا تو تیرے اپنے جسم کو اچھی طرح دھونے سے دنیا کے تمام لوگوں کی پریشانیاں اور تکلیفیں دور ہو گئیں۔

شعر۳۹:

دل عدوے سنگ دل کا تھا شقاوت سے جو سخت
زیرِپا پامال ہوتا تھا برنگ سنگ پا

مفہوم: بے رحم دشمن کا دل جو ظلم کی انتہا کو پہنچ گیا تھا وہ اب جھانواں (پاؤں رگڑنے کا پتھر) کی طرح پاؤں تلے روندا جا رہا تھا۔

شعر۴۰:

خُردۂ گل کو صبا لائی تصدق کے لئے
دے گیا ابر بہاری نذر دُرّبے بہا

مفہوم: اس خوشی کے عالم میں صبح کی ٹھنڈی اور معطر ہوا نے گلستان کے پھولوں کی خوشبو اپنے ساتھ لا کر نذر کی اور موسم بہار کا بادل بھی بہت قیمتی موتی قربان کر گیا۔

شعر۴۱:

شادئ صحت کا تیری کیا کہوں عالم کہ آج
جوش عشرت سے یہ عالم بن گیا عشرت سرا

مفہوم: آج میں تیری صحت کی خوشی کی صورت حال کیا بیان کروں کہ لطف و مسرت کا اس قدر جوش ہے کہ دنیا خوشی کا گھر بن گئی ہے۔

شعر۴۲:

چھیڑے تارِ شمع کو گر ناخن موج نسیم
بزم میں پیدا ہو تارِ ساز مطرب کی صدا

مفہوم: خوشی کے جوش میں خوشگوار ہوا کا جھونکا اگر جلتی ہوئی شمع سے ٹکراتا ہے تو ایسی آواز نکلتی ہے کہ جیسے کسی محفل میں گوّیے کے باجے کے تار کی آواز گونج رہی ہے۔

شعر۴۳:

لب پہ ساغر کے ہے جوں موج تبسم موج مے
شور قلقل لب پہ ہے مینائے مے کے قہقہا

مفہوم: شراب کے بھرے ہوئے پیالے کی لہر مسکراہٹ کی طرح ہے۔اور صراحی (بوتل) سے شراب انڈیلنے کی آواز سے یوں لگتا ہے جیسے کوئی زور سے ہنس رہا ہو۔

شعر۴۴:

بزم تصویرات فانوس خیالی کی طرح
حلقۂ رقاص گاں ہے زیر گردوں جابجا

مفہوم: آسمان کے نیچے زمین پر ہر جگہ ناچنے والیوں کی محفل خیالات کے اجتماع کی طرح ہے اور جہاں تصورات ہی روشنی کا ذریعہ ہیں ۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے خیالی روشنی کی مانند اس (محفل) کی رہنمائی کرتے ہیں۔

شعر۴۵:

کر رہا صحن چمن ہی میں ہے کیا طاؤس رقص
آشیانے میں ہے رقصاں طائر قبلہ نما

مفہوم: نہ صرف باغ کے کھلے احاطہ میں مور خوشی و خوبصورتی کے ساتھ ناچ رہا ہے بلکہ قطب نما کی ڈبیا میں قبلہ سمت کی نشاندہی کرنے والی سوئی کا ناچ بھی جاری ہے۔

شعر۴۶:

خا نہ ہائے چشم میں بھی پتلیوں کا رقص ہے
ہے جو منظور نظر سب کو تماشا رقص کا

مفہوم: ناچ چونکہ تمام تماشائیوں کو پسند ہے اس لئے آنکھ کے حلقہ میں پتلیاں بھی ناچ رہی ہیں۔

شعر۴۷، ۴۸، ۴۹:

چھوٹی آتشبازی ایسی جس کی گلکاری کو دیکھ
رات کو کہتے تھے آپس میں ثریا وسہا
صنع آتش بازپر حیرت زدہ ہوتی ہے عقل
سنگ پارس سے کہیں باروت کو پیسا تھا کیا
ہوگئی تاثیر جس کی یہ کہ ہر گلریز سے
ریزۂ فولاد نکلے بن کے گل ہائے طلا

مفہوم: چھوٹی آتش بازی کی ایسی نقاشی کو دیکھ کر رات کو ستاروں کا کہنا تھا۔ کہ آتش بازی کے کاریگر پر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ آتش بازی میں استعمال ہونے والا گندھک اکسیر (ایک پتھر جس کی نسبت مشہور ہے کہ لوہے کہ سونا بنا دیتا ہے) سے پیسا گیا ہے اور اسی وجہ سے پھلجھڑی سے لوہے کے ذرات سونے کے پھول کی طرح بن کر سامنے آ رہے تھے۔

شعر۵۰:

گنج چھٹتے تھے ستاروں کے عجب انداز سے
ماہ پاروں کا تھا گویا خندہ دنداں نما

مفہوم: آتش بازی کے جھرمٹ (لشکر) اس طرح حیران کن طریقہ سے منتشر ہو رہے تھے کہ گویا جیسے خوبصورت چہروں سے ہنستے وقت دانت دکھائی دے رہے ہوں۔

شعر۵۱:

منہ ہے کیا جو رنگ سے مہتاب کے ہم تاب ہو
غازے سے ہر چند چمکے رنگ روے مہ لقا

مفہوم: شکلِ ممدوح آتش بازی کی طرح روشن ہے اور چہرہ ابٹنی یعنی پوڈر سے بھی زیادہ چمک دمک والا ہے۔

شعر۵۲:

برج جو اڑ کر ہوئے قندیل شب زیر فلک

برج تھے جتنے فلک پر سب کو روشن کردیا

مفہوم: آتش بازی کے چھوٹنے سے رات کو آسمان کے نیچے اس قدر روشنی تھی کہ جس سے آسمان میں تمام ستاروں کے برج روشن ہوگئے۔

شعر۵۳:

فی الحقیقت یہ وہ شادی ہے کہ اس کے روبرو

جشن جمشیدی کا کچھ مطلق نہیں رتبہ رہا

مفہوم: اصل میں یہ وہ خوشی ہے کہ جس کے بالمقابل جشن جمشیدی یعنی جشن نوروز کی کوئی خاص اہمیت نہیں رہی۔

شعر۵۴،۵۵:

ہے زبان خامہ عاجز آگے بس تعریف میں

ذوقؔ کہتا ہے اٹھا کر ذوق میں دست دعا

رکھے صحت سے ہمیشہ شافی مطلق تجھے

جو ترے بدخواہ ہوں وہ رنج میں ہوں مبتلا

مفہوم: ذوقؔ فرماتے ہیں کہ اے ممدوح اس سے آگے تیری تعریف کرنا میرے اختیار سے باہر ہے لہٰذا میں خوشی سے ہاتھ اٹھا کر یہی دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تیری صحت کو برقرار رکھے یعنی تجھے تندرست رکھے اور جو تیرے دشمن ہیں وہ پریشان و غمگین ہوں۔

6.2.1 : سرگرمی (آو! اپنی معلومات کو جانچیں)

1۔ ذوق کا اصل نام کیا تھا؟

الف) مرزا غالب　ب) شیخ محمد ابراہیم　ج) مومن خان مومن　د) الطاف حسین حالی

2۔ ''واہ واہ کیا معتدل ہے باغِ عالم میں ہوا'' کس صنفِ سخن کی مثال ہے؟

الف) غزل　ب) نظم　ج) قصیدہ　د) مثنوی

3۔ اس قصیدے میں کس موسم کا ذکر کیا گیا ہے؟

الف) خزاں　ب) گرما　ج) سرما　د) بہار

4۔ شاعر نے ہوا کو کیسا قرار دیا ہے؟

الف) تیز　ب) گرم　ج) معتدل　د) خشک

5۔ ذوق کس دبستان سے تعلق رکھتے تھے؟

الف) لکھنؤ　ب) دہلی　ج) پنجاب　د) دکن

6.3 : عمومی جائزہ/خلاصہ

ذوق کے اس قصیدے میں موسمِ بہار کی خوبصورتی اور فطرت کی دلکشی کو نہایت دلنشیں انداز میں پیش کیا گیا ہے۔شاعر قصیدے کے آغاز میں معتدل اور خوشگوار ہوا کا ذکر کرتا ہے جو باغِ عالم کو شاداب اور خوشنما بنا رہی ہے۔ ہر طرف پھول کھلے ہوئے ہیں، خوشبو پھیلی ہوئی ہے اور فضا میں تازگی محسوس ہوتی ہے۔ بہار کی آمد سے درخت، پودے اور باغات نئی زندگی پا گئے ہیں۔شاعر اس حسین منظر کو دیکھ کر بے اختیار خوشی اور مسرت کا اظہار کرتا ہے۔قصیدے میں باغ کی رنگینی، پھولوں کی مہک اور پرندوں کی چہچہاہٹ کو نہایت خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔شاعر نے فطرت کے ان مناظر کو انسانی جذبات کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ بہار کی یہ فضا انسان کے دل و دماغ پر خوشگوار اثر ڈالتی ہے اور غم و اندوہ کو دور کرتی ہے۔ ہر شے میں تازگی، زندگی اور شادمانی نمایاں نظر آتی ہے۔

ذوق نے اس قصیدے میں تشبیہات اور استعارات کا بہترین استعمال کیا ہے۔ پھولوں کو رنگ و نور کی علامت بنایا گیا ہے جبکہ ہوا کو زندگی بخش قوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ شاعر کی زبان نہایت سادہ، شستہ اور رواں ہے۔ انہوں نے عام الفاظ میں ایسا حسن پیدا کیا ہے کہ اشعار دل میں اتر جاتے ہیں۔ قصیدے میں بہار صرف موسم کا نام نہیں بلکہ امید، خوشی اور زندگی کی علامت ہے۔ شاعر انسان کو یہ پیغام دیتا ہے کہ زندگی میں خوشی اور تازگی برقرار رکھنے کے لیے فطرت سے تعلق ضروری ہے۔ قدرت کے حسین مناظر انسان کے دل کو سکون اور روح کو تازگی عطا کرتے ہیں۔ ادبی لحاظ سے یہ قصیدہ اردو قصیدہ نگاری کا ایک اہم نمونہ ہے۔ اس میں زبان کی پاکیزگی، محاورے کی چاشنی اور فطری منظر نگاری نمایاں ہے۔ ذوق نے اپنے مخصوص انداز میں فطرت کے حسن کو اس طرح بیان کیا ہے کہ قاری خود کو بہار کے ایک حسین باغ میں محسوس کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قصیدہ اردو ادب میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اور نصاب میں شامل کیا جاتا ہے تاکہ طلبہ زبان و ادب کی لطافتوں سے آشنا ہو سکیں۔

6.4 : آپ نے کیا سیکھا؟

اس سبق کے مطالعے سے طلبہ نے اردو قصیدہ نگاری کی اہمیت کو سمجھا۔ انہیں معلوم ہوا کہ قصیدہ اردو شاعری کی ایک اہم صنف ہے جس میں شاعر اپنے جذبات اور خیالات کو مؤثر انداز میں پیش کرتا ہے۔ طلبہ نے ذوق کی شاعرانہ عظمت، زبان کی صفائی اور بیان کی خوبصورتی کو محسوس کیا۔ طلبہ نے موسمِ بہار اور فطرت کی دلکشی کے بارے میں شاعر کے احساسات کو سمجھا۔ انہوں نے یہ جانا کہ فطرت انسان کی زندگی میں خوشی، سکون اور تازگی پیدا کرتی ہے۔ اس سبق کے ذریعے ان کے اندر جمالیاتی ذوق اور قدرتی حسن کی قدر پیدا ہوئی۔ اس کے علاوہ طلبہ نے نئے الفاظ، محاورات اور ادبی صنعتوں کے استعمال کو سیکھا۔ ان کی زبان دانی بہتر ہوئی اور شعر فہمی کی صلاحیت میں اضافہ ہوا۔ یوں یہ سبق ان کی ادبی، فکری اور لسانی تربیت کا ذریعہ بنا۔

6.5: فرہنگ (مشکل الفاظ کے معنی)

معتدل : خوشگوار

باغِ عالم : دنیا کا باغ

نسیم : ٹھنڈی ہوا

لطافت : نرمی

شادابی : تازگی

چمن : باغ

عطربیزی : خوشبو پھیلانا

گلزار : پھولوں کا باغ

دلکشی : کشش

فرحت : خوشی

جمال : حسن

رعنائی : خوبصورتی

نسیمِ سحر : صبح کی ہوا

چمنستان : باغ

معطر : خوشبودار

روح افزا : دل خوش کرنے والا

نکہت : خوشبو

گلشن : باغ

6.6 : خود جانچ سوالات

1۔ ذوق نے اس قصیدے میں کس موسم کی منظر نگاری کی ہے؟

2۔ شاعر نے ہوا کو معتدل کیوں کہا ہے؟

3۔ قصیدے میں فطرت کے کن عناصر کا ذکر کیا گیا ہے؟

4۔ ذوق کی زبان کی نمایاں خصوصیات کیا ہیں؟

5۔ اس قصیدے سے ہمیں کیا پیغام ملتا ہے؟

6.7 : مشقی سوالات

1۔ ذوق کے حالاتِ زندگی بیان کریں۔

2۔ قصیدہ ’’واہ واہ کیا معتدل ہے باغِ عالم میں ہوا‘‘ کا خلاصہ لکھیں۔

3۔ اس قصیدے میں بہار کی منظر نگاری پر روشنی ڈالیں۔

4۔ ذوق کی شاعری کی خصوصیات بیان کریں۔

5۔ قصیدے میں استعمال ہونے والی ادبی صنعتوں کی وضاحت کریں۔

6.8 : جوابات سرگرمی

1۔ ب) شیخ محمد ابراہیم

2۔ ج) قصیدہ

3۔ د) بہار

4۔ ج) معتدل

5۔ ب) دہلی

6.8.1 : مشقی سوالات کے جوابات

1۔ ذوق کا اصل نام شیخ محمد ابراہیم تھا۔ وہ دہلی کے مشہور شاعر تھے اور بہادر شاہ ظفر کے استاد بھی رہے۔ ان کی شاعری زبان کی سادگی، محاورے کی صفائی اور فصاحت کے لیے مشہور ہے۔

2۔ اس قصیدے میں شاعر نے موسمِ بہار، خوشگوار ہوا، پھولوں کی مہک اور باغ کی خوبصورتی کو بیان کیا ہے۔ شاعر بہار کو خوشی اور تازگی کی علامت قرار دیتا ہے۔

3۔ ذوق نے بہار کی منظر نگاری میں کھلے ہوئے پھول، مہکتی فضائیں، چہچہاتے پرندے اور خوشگوار ہوا کا ذکر کیا ہے۔ ان مناظر سے باغ کی

شادابی نمایاں ہوتی ہے۔

4۔ ذوق کی شاعری کی اہم خصوصیات میں زبان کی صفائی، محاورے کی چاشنی، سادگی، فصاحت اور فطری منظر نگاری شامل ہیں۔

5۔ قصیدے میں تشبیہ، استعارہ، مراعات النظیر اور حسنِ تعلیل جیسی ادبی صنعتیں استعمال ہوئی ہیں جنہوں نے اشعار کے حسن کو بڑھا دیا ہے۔

6.9: امدادی کتب

1۔ اردو قصیدہ نگاری — ڈاکٹر محمد کمال الدین

2۔ اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ — ڈاکٹر محمود الٰہی

3 ۔ انتخاب قصائد اردو — مغیث الدین فریدی

4 ۔ مرثیہ اور مرثیہ نگار — ڈاکٹر شاداب ردولوی

5 ۔ اردو مرثیہ — سید علی عباس حسینی

6 ۔ میر انیس اور دبیر — شبلی نعمانی

سبق نمبر 7: مرثیہ کا تاریخی پس منظر اور فن

ساخت

7.0: اغراض ومقاصد

7.1: تعارف

7.2: مرثیہ کا تاریخی پس منظر اور فن

7.2.1 : سرگرمی (آو! اپنی معلومات کو جانچیں)

7.3: عمومی جائزہ

7.4: آپ نے کیا سیکھا؟

7.5: فرہنگ

7.6: خود جانچ سوالات

7.7: مشقی سوالات

7.8: جواباتِ سرگرمی

7.8.1: مشقی سوالات کے جوابات

7.9: امدادی کتب

7.0: اغراض و مقاصد

اس سبق کا بنیادی مقصد آپ کو مرثیہ کی تاریخی حیثیت، ادبی اہمیت اور فنی خصوصیات سے روشناس کرانا ہے۔ آپ کو یہ بتایا جائے گا کہ مرثیہ اردو ادب کی ایک اہم صنف ہے جو واقعۂ کربلا کے پس منظر میں پروان چڑھی اور جس نے اردو شاعری کو ایک منفرد اسلوب عطا کیا۔ اس سبق کے ذریعے آپ مرثیہ کے آغاز، ارتقا اور اس کے مختلف ادوار کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔ آپ کو یہ سمجھنے میں مدد ملے گی کہ عربی، فارسی اور اردو ادب میں مرثیہ کس طرح ترقی کرتا ہوا موجودہ شکل تک پہنچا۔ اس سبق کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ آپ مرثیہ کے فنی عناصر جیسے زبان و بیان، منظر نگاری، جذبات نگاری، کردار نگاری اور مکالمہ نگاری کو سمجھ سکیں۔ آپ کو مرثیہ کے مشہور شعرا خصوصاً میر انیس اور مرزا دبیر کی ادبی خدمات سے واقف کرایا جائے گا تاکہ آپ اردو مرثیہ کے عروج اور اس کی ادبی قدر و قیمت کا اندازہ لگا سکیں۔ مزید یہ کہ اس سبق کے ذریعے آپ میں ادب فہمی اور تنقیدی شعور پیدا کرنا بھی مقصود ہے۔ مرثیہ کے مطالعے سے آپ انسانی اقدار جیسے صبر، شجاعت، وفاداری، ایثار اور قربانی کے جذبات کو سمجھ سکیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ میں زبان کی خوبصورتی اور ادبی اظہار کا شعور بھی پیدا ہوگا۔ آپ مرثیہ کی ہیئت، اسلوب اور موضوعات کا تجزیہ کرنے کے قابل ہوں گے اور اردو ادب میں اس صنف کی اہمیت کو بہتر انداز میں جان سکیں گے۔

7.1: تعارف

مرثیہ اردو شاعری کی ایک اہم اور مؤثر صنف ہے جس کا بنیادی مقصد کسی عظیم شخصیت، واقعہ یا سانحہ پر غم و اندوہ کا اظہار کرنا ہوتا ہے۔ اردو ادب میں مرثیہ نگاری کو خاص طور پر واقعۂ کربلا اور شہدائے کربلا کی یاد سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ مرثیہ عربی زبان کے لفظ ''رثا'' سے نکلا ہے جس کے معنی کسی مرنے والے کی خوبیوں کو بیان کرتے ہوئے غم کا اظہار کرنا ہیں۔ ابتدا میں مرثیہ صرف مرنے والوں کی یاد میں کہا جاتا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں فنی وسعت پیدا ہوئی اور یہ ایک مکمل ادبی صنف بن گئی۔ اردو مرثیہ نے اپنی ترقی کے مختلف ادوار طے کیے اور خصوصاً لکھنؤ میں اسے عروج حاصل ہوا۔

مرثیہ کی ابتدا عربی ادب سے ہوئی جہاں قبائلی جنگوں میں مرنے والوں کے اوصاف بیان کیے جاتے تھے۔ فارسی ادب میں بھی مرثیہ کو مقبولیت حاصل ہوئی اور پھر یہی روایت اردو ادب تک پہنچی۔ اردو میں مرثیہ نگاری کا آغاز دکن سے ہوا مگر اس فن کو اصل فروغ لکھنؤ کے شعرا نے دیا۔ میر انیس اور مرزا دبیر اردو مرثیہ کے دو عظیم ستون مانے جاتے ہیں جنھوں نے اس صنف کو فنی اعتبار سے بلند مقام عطا کیا۔ ان کے مراثی میں

زبان وبیان کی خوبصورتی، کردارنگاری، منظرکشی، جذبات نگاری اور واقعات کی تفصیل نمایاں نظرآتی ہے۔مرثیہ صرف غم کی شاعری نہیں بلکہ اس میں انسانی اقدار، شجاعت، صبر، قربانی، وفاداری اور حق و باطل کی کشمکش کو بھی پیش کیا جاتا ہے۔ واقع؟ کربلا کے کرداروں کی عظمت اور ان کے اعلیٰ اخلاق مرثیے کا بنیادی موضوع بنتے ہیں۔مرثیہ اردو ادب کی ایسی صنف ہے جس نے مذہبی، ادبی اور تہذیبی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔اس صنف نے نہ صرف اردو زبان کو وسعت بخشی بلکہ انسانی جذبات کی ترجمانی میں بھی اہم کردار ادا کیا۔مرثیہ کا مطالعہ ہمیں تاریخ، اخلاقیات اور فنی لطافتوں سے آشنا کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اردو ادب میں اس صنف کو ہمیشہ عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

7.2: مرثیہ کا تاریخی پس منظر اور فن

رثائی شاعری میں اردو مرثیہ کو فنی نقطہ نظر سے ایک خاص عظمت ووقار حاصل ہے۔کیونکہ صرف اردو کو یہ فخر وامتیاز حاصل ہے کہ اس نے مرثیہ کو ایک منفرد سخن کی حیثیت سے متعارف کرایا۔اس کے فنی اور ہئیتی لوازمات کا تعین کیا اور دنیا کی شاعری میں رزمیہ نظم نگاری کا بہترین نمونہ پیش کیا۔اردو کی بیشتر اصناف شاعری فارسی شاعری کی مرہون منت ہیں۔لیکن صرف مرثیہ ایسی صنف ہے جس نے ہندوستان کی سرزمین میں نشونما پائی اور پروان چڑھی۔اس کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ فارسی اور عربی میں رثائی شاعری موجود نہیں تھی۔عربی وفارسی میں رثائی شاعری کے بہت سے نمونے موجود ہیں۔لیکن ان کی نوعیت جداگانہ ہے۔اوّل تو یہ ان کے ادبیات میں رثائی شاعری کے لئے کوئی صنف و ہیئت مقرر نہ تھی۔رثائی شاعری تو دراصل انسان کے سب سے بڑے غم اور صدمہ والم کا بیان ہے اور آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں موت سے بڑھ کر اور کوئی غم نہیں اور انسان غم کا اظہار مختلف طریقوں سے کرتا رہا ہے۔لیکن نفسیاتی نقطہ نظر سے غم کے اظہار کا سب سے مناسب اور عمدہ طریقہ یہ ہے کہ دوسروں کو اس میں شریک کیا جائے۔کیونکہ دوسروں کو اس میں شریک بنا کر ہی غم کو ہلکا کیا جاسکتا ہے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مرنے والے کے اوصاف حمیدہ کو بیان کرکے صبر کی راہ تلاش کی جائے۔انسانی غم کے اس پہلو کو نظر میں رکھیں اور شاعری کی ان بنیادی خصوصیات پر غور کریں کہ وسائل اظہار میں شاعری ہی سب سے بہتر اور موثر وسیلہ اظہار ہے۔انسان کی داخلی کیفیات اور کوائف کو جس دلگیری اور اثر پزیری سے شاعری بیان کرسکتی ہے،نثر میں ممکن نہیں۔ان حقائق کے پیش نظر رثائی شاعری کی ابتدائی کڑیوں کی تلاش کی جاسکتی ہے۔صرف اردو عربی وفارسی کی بات نہیں بلکہ عالمی ادبیات میں اس کی تلاش وجستجو کی جائے تو خاطرخواہ نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔شاعری کی ابتدا انسانی جذبات کے اظہار کے طور پر ہوتی ہے لہٰذا ہر ادیب کی شاعری میں ایسے سانحے اور موت کے صدمہ جانکاہ پر شاعروں نے ضرور کچھ نہ کچھ لکھا ہوگا۔عربی وفارسی میں رثا کی جو روایتیں

موجود ہیں اس کی نوعیت اسی طرح کی ہے۔ یہاں کسی کی موت پر اظہار رنج وغم سے متعلق اشعار مختلف ہیئتوں میں موجود ہیں اور پوری فنی خصوصیات کے ساتھ۔ مثلاً عربی مراثی اپنے سوز و گداز اور قوت تاثیر، جوش وولولہ کے اعتبار سے بے مثل ہیں۔ فارسی شاعری میں بھی یہ خصوصیات عربی سے ہی آئی ہیں۔ البتہ انفرادی سانحے کے ساتھ ساتھ فارسی میں امام حسین اور شہدائے کربلا پر بھی نظمیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن مرثیہ (صنفی اعتبار سے) وجود میں نہ آسکا۔

اردو میں ابتدائی دور کی شاعری میں جو رثائی نظمیں ملتی ہیں وہ فرد خاص کو موت پر مبنی ہیں لیکن ساتھ ہی امام حسین اور شہدائے کربلا کے موضوعا بھی ہیں اور اس رثائی شاعری نے مرثیہ کی شکل اس وقت اختیار کی جب شہدائے کربلا کی یاد کے سلسلہ میں مختلف تقریبات کا انعقاد کیا جانے لگا۔ اعزاء داری اور مجلسوں کا اہتمام خاص محرک بنتا ہے۔ مذہبی نقطہ نظر سے اہل تشع شہدائے کربلا کی یاد میں گرے ہوئے ایک آنسو کے بدلے ایک گناہ دھلتا ہے اور ثواب بھی حاصل ہوتا ہے۔ فضل علی فضلی کی ''کربل کتھا'' جو اردو نثر کے اسلوبیاتی ارتقاء میں اہم مقام کا حامل ہے کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ فضلی نے وجہ تالیف کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ لوگ محرم کی مجلسوں میں کثیر تعداد میں شریک ہوتے ہیں۔ جن میں ''روضتہ الشہداء'' کو پڑھا جاتا ہے۔ مگر ان میں سمجھنے والوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ لہٰذا بین و بکا میں بخوبی حصہ نہیں لے پاتے جس کے سبب ثواب سے محروم رہتے ہیں۔ اسی لئے میں نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا تا کہ لوگ اسے سمجھ سکیں اور اثر انگیزی کا عمل تیز تر ہو سکے۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ مرثیہ کی اصل روح شہدائے کربلا کی یاد میں آنسو بہانا ہے۔ اردو مرثیہ کی ابتدا دکن سے ہوتی ہے اور اسی وقت اس کو فروغ ملتا ہے جب محرم کے سلسلے کی تقریبات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی دکن میں مرثیوں کی ابتداء کے سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

> ''سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں جشن میلاد مبارک کے جلسوں کے ساتھ ساتھ محرم کی تعزیہ داری میں بھی ترقی ہوئی۔ تمام ما لک محروسہ میں ایامِ عاشورہ تک نوبت ونقارہ موقوف رہتے۔ گوشت اور پان کی دکانیں بند ہو جاتیں۔ تمام مسلمان اور ہندو ماتم میں شریک ہوتے تھے۔ گول کنڈہ میں شاہی عاشور خانے تھے جہاں چودہ علم چہاردہ معصوم کے کھڑے کرائے جاتے۔ روشنی کا خاص انتظام ہوتا تھا۔ سو سو دو سو چراغ کا ایک برنجی درخت بنایا گیا تھا جو اپنی روشنی سے عاشور خانے کو منور کر دیتا تھا۔ یہاں مرثیہ گو اور مداح شہداء ہر شب کو جمع ہوتے اور اردو میں مراثی مناقب پڑھتے تھے۔ جب مراسم تعزیہ داری ادا ہو جاتے تو حکومت کی جانب سے سب کو دعوت ہوتی

مگراس میں بے گوشت کی غذائیں ہوتی تھیں۔ ہرگلی کوچہ میں یہی ہوتا تھا۔چھٹی تاریخ کوعاشورخانے کے باہر کے علم اٹھائے جاتے ۔ان کے محبان ائمہ اظہار ہاتھوں میں مشعل لئے ہوتے اورذکر مداح مرثیہ خوانی اور مداحی اشعار پڑھتے ہوئے ساتھ ہوتے۔ دسویں تاریخ کوخودسلطان عبداللہ سیاہ لباس میں برہنہ پاعلموں کے ساتھ ہوتا تھا۔'' (مضمون۔دکن میں مرثیہ کی ابتدا۔مثحرسہ اوراردومرثیہ نگاری،ام ہانی اشرف)

دکنی ادب کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ دکنی شاعروں نے حکمرانوں اور بادشاہوں کے عزاخانوں کے لئے ایسے مرثیے قلمبند کئے جن کے ذریعے محرم کے دنوں میں سوزوگداز کاایک خاص ماحول بنایا جاتا تھا۔ یہ تقریبات زیادہ مذہبی عقیدت اوراہتمام کے ساتھ بعد میں لکھنؤ میں منائے جانے لگے اور لکھنؤ کی یہی سرزمین ہے جس نے اردومرثیہ جیسی عظیم صنف عطا کی ۔اردومرثیہ سے مرادایسی بیانیہ نظم ہے جس میں شہدائے کربلا کے اعزاء وقرباء اور کربلا کے سانحہ سے متعلق بیانات ہوں۔اوراسی مفہوم کے پیش نظر اجزائے ترکیبی مرتب کئے گئے جوحسب ذیل ہیں:

۱۔ چہرہ

۲۔ سراپا

۳۔ رخصت

۴۔ آمد

۵۔ رجز

۶۔ ماجرا

۷۔ جنگ

۸۔ شہادت

۹۔ بین

چہرہ دراصل مرثیے کی تمہید ہوتی ہے۔اس حصے میں زیادہ ترمرثیوں میں صبح کے مناظر ملتے ہیں۔اس کی توجیہہ یہ ہے کہ کربلا میں دسویں محرم کی صبح کو ہی جنگ کی شروعات ہوئی تھی اور قیامت خیز مناظر سامنے آئے تھے۔اسی مناسبت میں مرثیوں میں صبح کا منظر، پوپھٹنا،سورج نکلنا،

سورج کی لالی اور دیگر متعلقات پیش کئے جاتے ہیں۔اس کے علاوہ رات کا منظر، شام کا سماں، بے ثباتی دنیا، اولاد کی محبت، موسم کی شدت اور ریگستانی مناظر بھی نظم کئے گئے ہیں۔سراپا مرثیہ کا وہ حصہ ہے جس میں شاعر اس شہید کی شوکت و وجاہت، رعب و دبدبہ اور اس کی قد و قامت کو بیان کرتا ہے اور رخصت کے تحت جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے حضرت امام حسینؑ کی اجازت کے بعد میدانِ جنگ میں جانے سے قبل اعزاء واقربا و اہل خیمہ سے رخصت ہونے کا دردناک سماں پیش کیا جاتا ہے اور آمد کے تحت میدانِ جنگ میں دلیرانہ انداز کو بیان کیا جاتا ہے۔پھر اس کے بعد حسب ونسب اور آباواجداد کے کارہائے نمایاں اور اپنی شجاعت کا بیان رجز کے تحت ہوتا ہے۔رجز دراصل عربوں کا طریقہ تھا، اسی مناسبت سے اسے مرثیہ میں شامل کیا گیا۔ماجرا مرثیے کا وہ حصہ ہے جس میں مرثیہ نگار ہیرو کی جنگ اور شہادت سے قبل ان واقعات کو سرسری طور پر بیان کرتا ہے جن کا تعلق ہیرو سے ہوتا ہے۔جنگ اس حصے میں فریقین کو مصروف جنگ وجدال دکھایا جاتا ہے۔یہاں ہیرو کی شجاعت، فن حرب وضرب میں اس کی مہارت، اس کے دیگر اسباب حرب، مثلاً تلوار نیزہ، سپر اور گھوڑے کی تیزی وطراری کا بیان تفصیل سے ہوتا ہے۔مرثیہ کا یہی عنصر دراصل مرثیہ کو رزمیہ نظم کا مقام عطا کرتا ہے۔اور اس کے بعد شہادت کی منزل آتی ہے۔جب ہیرو دشمنوں کے نرغے میں ہوتا ہے اور ہر چہار جانب سے اس پر وار ہوتے ہیں اور بلآخر جام شہادت سے سرشار ہو جاتا ہے۔اس حصے میں رثا کا پہلو بھی حاوی ہوتا ہے اور اسی جذبے کی شدت بین میں نظر آتی ہے۔شہادت کے بعد اہل خیمہ کی آہ وزاری کا بیان نہایت ہی اثر انگیز اور پرسوز لہجے میں کیا جاتا ہے تاکہ سامعین پر بھی وہی کیفیت طاری ہو جائے اور وہ بھی غم میں مبتلا ہو کر آنسو بہا سکیں۔

اردو مرثیے کے یہی اجزائے ترکیبی ہیں جن کے سبب اردو مرثیہ منفرد ہوا لیکن یہ بھی واضح رہے کہ تمام مراثی میں اس کی پابندی نہ ہو سکی اور نہ ہو سکے گی۔کیونکہ کربلا کے سانحے سے قبل کے واقعات مثلاً امام حسینؑ اور اہل بیت کرام کا مدینے سے نکلنا، راہ کی دشواریاں، حضرت صغریٰ کی بیماری، شہادت کے بعد شامِ غریباں اور اہل حرم کا قیدی بنایا جانا، دمشق کے سفر کی صعوبتیں، یزید کے دربار میں پیشی اور پھر مدینہ کی واپسی، ان تمام واقعات کو بھی مرثیہ میں پیش کیا گیا اور ان واقعات کے بیان میں ان اجزائے ترکیبی کو ملحوظ رکھنا ناممکن تھا۔اسی لئے خود انیسؔ و دبیرؔ کے بھی بہت سے مراثی میں یہ اجزائے ترکیبی پوری طور پر موجود نہیں۔مگر چونکہ واقعات کربلا میں سب سے زیادہ زور میدانِ کربلا کے جنگ کی تفصیلات اور شہادت پر ملتا ہے اس کے مدنظر مرثیے کے اجزائے ترکیبی مرتب کئے گئے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

اردو مرثیے کی صنفی اور ادبی خصوصیات کے علاوہ سب سے بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ہندوستانی عناصر کی بھرپور نمائندگی ہوئی ہے۔ثقافتی اعتبار سے بھی اس صنف نے اپنے اندر صدیوں کی روایات واقدار اور رسوم ورواج کو سمیٹ رکھا ہے۔مثلاً قدیم ہندوستان میں شادی

بیاہ کے رسم ورواج، اعلیٰ گھرانوں میں رہن سہن کے آداب واطوار، طرز زندگی وغیرہ۔ اورادبی اعتبار سے سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مرثیوں نے ابلاغ وترسیل کا خوبصورت نمونہ پیش کرتے ہوئے جو ذخیرہ الفاظ اوراسالیب بیان فراہم کئے ہیں ان سے زبان کی قوت اظہار میں جو اضافہ ہوا ہے وہ نہایت ہی وقیع اور قابل فخر ہیں۔

7.2.1 : سرگرمی (آو! اپنی معلومات کو جانچیں)

1۔ مرثیہ کا لفظ کس زبان سے لیا گیا ہے؟

الف۔ فارسی ب۔ عربی ج۔ اردو د۔ ترکی

2۔ اردو مرثیہ کو عروج کس شہر میں حاصل ہوا؟

الف۔ دہلی ب۔ لاہور ج۔ لکھنؤ د۔ حیدرآباد

3۔ میرانیس کس صنف کے عظیم شاعر تھے؟

الف۔ غزل ب۔ قصیدہ ج۔ مثنوی د۔ مرثیہ

4۔ مرثیہ کا بنیادی موضوع کیا ہے؟

الف۔ عشق ب۔ فطرت ج۔ غم وشہادت د۔ طنز

5۔ مرزا دبیر کا تعلق کس صنفِ ادب سے تھا؟

الف۔ ناول ب۔ مرثیہ ج۔ ڈراما د۔ افسانہ

7.3: عمومی جائزہ

مرثیہ اردو ادب کی ایک اہم صنف ہے جو غم، رنج اور عظیم شخصیات کی یاد کو شاعرانہ انداز میں پیش کرتی ہے۔ اس صنف کی بنیاد عربی ادب میں ملتی ہے جہاں جنگوں اور سانحات میں مرنے والوں کے اوصاف بیان کیے جاتے تھے۔ بعد ازاں فارسی ادب نے بھی مرثیہ کو اپنایا اور پھر اردو ادب میں یہ صنف نہایت مقبول ہوئی۔ اردو مرثیہ کی ابتدا دکن سے ہوئی لیکن اسے اصل فروغ لکھنؤ میں ملا۔ لکھنؤ کے شعرا نے مرثیہ کو فنی

اعتبار سے بلند مقام عطا کیا اور اسے صرف غم کی شاعری تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس میں جذبات، کردار نگاری، منظر کشی اور انسانی اقدار کو بھی شامل کیا۔ مرثیہ کی سب سے اہم خصوصیت واقعۂ کربلا کی منظر کشی ہے۔ امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کی قربانی، صبر، شجاعت اور حق پرستی مرثیے کے بنیادی موضوعات ہیں۔ مرثیہ نگار ان واقعات کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ قاری کے دل میں غم اور عقیدت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ مرثیے میں نہ صرف واقعات بیان کیے جاتے ہیں بلکہ کرداروں کی نفسیات، ان کے جذبات اور ماحول کی تصویر کشی بھی کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرثیہ اردو شاعری کی ایک مکمل اور جامع صنف تصور کی جاتی ہے۔

میر انیس اور مرزا دبیر اردو مرثیہ کے دو عظیم شاعر ہیں۔ میر انیس نے اپنے مراثی میں زبان کی سادگی، فصاحت اور جذبات کی گہرائی پیدا کی جبکہ مرزا دبیر نے بلند آہنگ اسلوب اور الفاظ کی شان و شوکت کو اہمیت دی۔ ان دونوں شعرا نے مرثیہ نگاری کو بامِ عروج تک پہنچایا۔ ان کے مراثی آج بھی اردو ادب کے شاہکار مانے جاتے ہیں۔ مرثیہ کے فنی عناصر میں زبان و بیان، تشبیہات، استعارات، منظر نگاری، مکالمہ نگاری اور جذبات نگاری شامل ہیں۔ مرثیہ نگار واقعات کو اس مہارت سے بیان کرتا ہے کہ قاری خود کو میدانِ کربلا میں موجود محسوس کرتا ہے۔ مرثیہ میں درد و غم کے ساتھ ساتھ حوصلہ، عزم اور اخلاقی اقدار کا درس بھی دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرثیہ صرف مذہبی شاعری نہیں بلکہ انسانی جذبات اور اعلیٰ اخلاقیات کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ اردو ادب میں مرثیہ نے زبان کی ترقی میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ اس صنف کے ذریعے اردو زبان میں فصاحت، بلاغت اور ادبی وسعت پیدا ہوئی۔ مرثیہ نے نہ صرف ادبی حلقوں کو متاثر کیا بلکہ عوامی سطح پر بھی مقبولیت حاصل کی۔ آج بھی محرم کے ایام میں مرثیہ خوانی کی روایت موجود ہے جو اس صنف کی زندہ اہمیت کی علامت ہے۔ مرثیہ کا مطالعہ ہمیں ادب، تاریخ، تہذیب اور انسانی اقدار سے روشناس کراتا ہے اور اردو ادب میں اس کا مقام ہمیشہ نمایاں رہے گا۔

7.4: آپ نے کیا سیکھا؟

اس سبق کے مطالعے سے آپ نے مرثیہ کی تعریف، تاریخی پس منظر اور اس کی ادبی اہمیت کو سمجھا۔ آپ نے جانا کہ مرثیہ عربی ادب سے شروع ہو کر فارسی اور اردو ادب تک کیسے پہنچا اور اردو میں اسے کس طرح فروغ حاصل ہوا۔ آپ کو معلوم ہوا کہ لکھنؤ اردو مرثیہ کا اہم مرکز تھا اور میر انیس و مرزا دبیر نے اس صنف کو عظمت بخشی۔ آپ نے مرثیہ کے بنیادی موضوعات جیسے واقعہ کربلا، شہادت، صبر، قربانی، وفاداری اور شجاعت کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ آپ نے مرثیہ کے فنی عناصر مثلاً منظر نگاری، کردار نگاری، جذبات نگاری اور زبان و بیان کی خوبصورتی کو

بھی سمجھا۔اس سبق کے ذریعے آپ میں ادب سے دلچسپی پیدا ہوئی اور وہ اردو شاعری کی اس اہم صنف کی قدر و قیمت سے واقف ہوئے۔اس کے علاوہ آپ نے انسانی اقدار اور اخلاقی تعلیمات کو بھی بہتر انداز میں جانا۔

7.5:فرہنگ

مرثیہ : غم کی شاعری

رثا : مرنے والے کا ذکر

سانحہ : حادثہ

شہادت : حق کی خاطر جان دینا

عروج : بلندی

فصاحت : صاف اور عمدہ زبان

بلاغت : مؤثر اندازِ بیان

منظر نگاری: منظر کا بیان

کردار نگاری: کرداروں کی تصویر کشی

جذبات نگاری: احساسات کا بیان

استعارہ : مجازی معنی میں استعمال

تشبیہ : کسی چیز کو دوسری سے ملانا

قربانی : ایثار

وفاداری : سچی محبت اور ساتھ

صبر : برداشت

عقیدت : احترام و محبت

ہیئت : ساخت

اسلوب : اندازِ بیان

تہذیب : ثقافت

ادب فہمی : ادب کو سمجھنے کی صلاحیت

7.6:خود جانچ سوالات

1 مرثیہ کیا ہے؟

2 اردو مرثیہ کو عروج کہاں حاصل ہوا؟

3 میر انیس کی اہم ادبی خدمات کیا ہیں؟

4 مرثیہ کے بنیادی موضوعات کون سے ہیں؟

5 مرثیہ کے فنی عناصر بیان کریں۔

7.7:مشقی سوالات

1 مرثیہ کے تاریخی پس منظر پر تفصیلی نوٹ لکھیں۔

2 اردو مرثیہ کے ارتقا پر روشنی ڈالیں۔

3 میر انیس اور مرزا دبیر کی خدمات بیان کریں۔

4 مرثیہ کے فنی محاسن پر بحث کریں۔

5 واقعہ کربلا نے مرثیہ نگاری پر کیا اثر ڈالا؟

7.8:جواباتِ سرگرمی

1۔ ب۔عربی

2۔ ج۔لکھنؤ

3۔ د۔مرثیہ

4۔ ج۔غم وشہادت

5۔ ب۔مرثیہ

7.8.1:مشقی سوالات کے جوابات

1 مرثیہ کا تاریخی پس منظر عربی ادب سے ملتا ہے جہاں جنگوں میں مرنے والوں کی یاد میں شاعری کی جاتی تھی۔ بعد میں فارسی اور اردو ادب میں یہ صنف مقبول ہوئی۔

2 اردو مرثیہ دکن سے شروع ہوا مگر لکھنؤ میں اسے عروج حاصل ہوا۔ میر انیس اور مرزا دبیر نے اسے ترقی دی۔

3 میر انیس نے سادہ اور مؤثر زبان استعمال کی جبکہ مرزا دبیر نے بلند آہنگ اسلوب اپنایا۔ دونوں نے اردو مرثیہ کو عظمت بخشی۔

4 مرثیہ کے فنی محاسن میں منظر نگاری، جذبات نگاری، کردار نگاری، تشبیہات اور زبان و بیان کی خوبصورتی شامل ہیں۔

5 واقعہ کربلا مرثیہ نگاری کا بنیادی موضوع ہے۔ اس واقعے نے مرثیہ کو جذباتی، اخلاقی اور ادبی اعتبار سے بلند مقام عطا کیا۔

7.9:امدادی کتب

1۔اردو قصیدہ نگاری — ڈاکٹر محمد کمال الدین

2۔اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ — ڈاکٹر محمود الٰہی

3۔انتخاب قصائد اردو — مغیث الدین فریدی

4۔مرثیہ اور مرثیہ نگار — ڈاکٹر شاداب ردولوی

5۔اردو مرثیہ — سید علی عباس حسینی

6۔میر انیس اور دبیر — شبلی نعمانی

سبق نمبر 8: جنوبی ہند میں اردو مرثیہ

ساخت

8.0: اغراض ومقاصد
8.1: تعارف
8.2: جنوبی ہند میں اردو مرثیہ
8.2.1 : سرگرمی (آو! اپنی معلومات کو جانچیں)
8.3: عمومی جائزہ
8.4: آپ نے کیا سیکھا؟
8.5: فرہنگ
8.6: خود جانچ سوالات
8.7: مشقی سوالات
8.8: جواباتِ سرگرمی
8.8.1: مشقی سوالات کے جوابات
8.9: امدادی کتب

8.0:اغراض ومقاصد

اس سبق کا بنیادی مقصد آپ کو جنوبی ہند یعنی دکن میں اردو مرثیہ کی ابتدا، ارتقا اور اہمیت سے روشناس کرانا ہے۔ اس کے ذریعے آپ یہ جان سکیں گے کہ دکن اردو ادب کا ابتدائی مرکز تھا جہاں مختلف اصنافِ ادب کے ساتھ مرثیہ نگاری نے بھی ترقی کی۔ اس سبق کے مطالعے سے آپ دکنی تہذیب، مذہبی ماحول اور ادبی روایت کے اثرات کو سمجھ سکیں گے۔ مزید یہ کہ آپ دکن کے اہم مرثیہ نگاروں اور ان کے ادبی خدمات سے واقف ہوں گے۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ دکنی مرثیے کی زبان، اسلوب اور موضوعات میں کیا خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اس سبق کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ آپ واقعہ کربلا کے انسانی، اخلاقی اور روحانی پہلوؤں کو سمجھیں اور قربانی، صبر، شجاعت اور حق گوئی جیسی اعلیٰ اقدار کو اپنانے کی ترغیب حاصل کریں۔ اس کے علاوہ آپ اردو مرثیہ کے ارتقائی سفر میں دکن کے کردار کا ادبی اور تاریخی جائزہ لینے کے قابل ہو سکیں گے۔

8.1:تعارف

جنوبی ہند، خصوصاً دکن، اردو زبان و ادب کی ایک اہم سرزمین رہی ہے جہاں اردو نے ابتدائی دور ہی سے ترقی پائی۔ دکن میں اردو شاعری کی مختلف اصناف کے ساتھ مرثیہ نگاری نے بھی خاص فروغ حاصل کیا۔ مرثیہ ایسی صنفِ سخن ہے جس میں واقع؟ کربلا، حضرت امام حسینؑ اور ان کے رفقا کی شہادت، ان کے صبر و استقلال اور اسلامی اقدار کو نہایت دردانگیز انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ دکن میں مرثیہ نگاری کی ابتدا مذہبی اور تہذیبی ماحول کے زیرِ اثر ہوئی۔ یہاں کے حکمرانوں خصوصاً قطب شاہی اور آصف جاہی ادوار نے اردو ادب کی سرپرستی کی جس کے نتیجے میں مرثیہ کو بھی عروج حاصل ہوا۔ دکنی شعرا نے مرثیے میں مقامی رنگ، زبان کی سادگی اور جذباتی اثر آفرینی کو نمایاں کیا۔ دکن کے مرثیہ نگاروں نے نہ صرف مذہبی عقیدت کا اظہار کیا بلکہ انسانی اقدار، قربانی، حق پرستی اور ظلم کے خلاف جدوجہد کو بھی اپنے کلام کا حصہ بنایا۔ اس دور کے مرثیوں میں فارسی اثرات کے ساتھ دکنی تہذیب کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ ملا وجہی، غواصی اور نصرتی جیسے شعرا نے ابتدائی مرثیہ نگاری میں اہم کردار ادا کیا جبکہ بعد کے دور میں یہ صنف مزید نکھرتی گئی۔ دکن کے مرثیوں میں زبان کی سادگی، محاورات کی دلکشی اور جذبات کی شدت نمایاں ہے۔ یہی خصوصیات بعد میں شمالی ہند کے مرثیے کے لیے بنیاد ثابت ہوئیں۔ اس طرح دکن اردو مرثیہ کی تاریخ میں ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور اردو ادب کی اس اہم صنف کی تشکیل و ارتقا میں اس کا کردار ناقابلِ فراموش ہے۔

8.2: جنوبی ہند میں اردو مرثیہ

جہاں تک اردو میں مرثیے کے آغاز وارتقا کی بات ہے تو اس صنف نے بھی دکن کی سرزمین میں ہی آنکھیں کھولیں۔اب تک کی تحقیقات کے مطابق دکن کے قدیم ترین مرثیہ نگار راشرفؔ بیابانی کا ہی نام لیا جاتا ہے۔''نوسر ہار'' اس کے مرثیوں کا مجموعہ ہے جس میں اس نے حضرت امام حسینؓ اور قافلہ حسینؓ سے متعلق افراد کے سلسلے میں اپنے تاثر کو پیش کیا ہے۔اشرت کے مرثیوں کی زبان پر گہری دکنیت غالب ہے۔ملاوجہی کے یہاں بھی مرثیے ملتے ہیں حالانکہ وہ دکنی ادب میں اپنی نثر نگاری اور مثنوی نگاری کے سبب مشہور ہیں لیکن انہوں نے پرسوز مرثیے بھی لکھے ہیں۔غواصیؔ اور محمد قلی شاہ نے بھی مرثیہ کی روایت کو فروغ دینے کی کاوش کی۔غواصیؔ کے مرثیے زبان و بیان کے اعتبار سے نسبتاً صاف اور سہل ہیں۔ان کے علاوہ سلطان عبداللہ قلی قطب شاہ، لطیفؔ، کاظمؔ، افضلؔ، شاہیؔ، مرزا ملک خوشنود، شید میران ہاشمی، قطبیؔ، عابدؔ، فائزؔ، محبؔ اور متعدد دوسرے شاعروں نے بھی مرثیہ نگاری کی طرف توجہ کی۔قدیم دکنی شاعروں کی ان منظوم کاوشوں کے تنقیدی مطالعے سے اس کی وضاحت ہوتی ہے کہ دکن میں مرثیہ نگاری کی روایت بھی مقبول رہی تھی۔لیکن چونکہ اس وقت ایک مخصوص صنف سخن کے اعتبار سے مرثیہ گوئی کو اہمیت حاصل نہیں ہوئی تھی اس لئے رثائی شاعری کی طرف توجہ صرف مذہبی عقیدت کی بنا پر کی تھی۔اس لئے رثائی شاعری میں بہت زیادہ تنوع اور فنی مہارت نظر نہیں آتی۔البتہ چند شاعروں نے مثلاً لطیفؔ، شاہیؔ، مرزاؔ اور کاظمؔ نے مرثیہ نگاری میں اپنی انفرادیت قائم کر لی تھی۔دکن کے دور اوّل میں خاص طور سے شاہیؔ اور مرزا قابل ذکر ہیں۔جنہوں نے مرثیہ کو بالکل ایک نئی زندگی بخشی۔مرزا نے مرثیوں میں عنوانات قائم کئے اور طویل مرثیہ لکھنا شروع کیا۔اس نے حضرت علی اصغر کے حال کا مرثیہ، حضرت قاسم کی شادی، حضرت امام حسینؓ کی پیاس، میدان جنگ کا نقشہ وغیرہ سب کو الگ الگ نظم کیا ہے۔ان کی مرثیہ نگاری کے پیش نظر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس وقت تک لوگوں میں مرثیے کہنے اور لکھنے کا ذوق پیدا ہو گیا تھا اور صرف رونا رلانا ہی مقصد نہ تھا بلکہ واقعات کو مزین کرنا اور اس میں قصہ پن اور تنوع پیدا کرنے کا خیال آ گیا تھا۔ان ابتدائی مرثیوں میں جذبات نگاری اور کردار نگاری کی خصوصیات بھی نظر آتی ہیں۔

دکن مرثیوں میں ہیئت کی کوئی قید نہ تھی۔مرثیے غزل کی صورت میں بھی لکھے جاتے تھے۔مثنوی کی صورت اور مستزاد کی صورت میں بھی اور جیسے جیسے زمانہ بدلتا گیا بیانات میں زبان میں صفائی آتی گئی۔دور مغلیہ تک پہنچتے پہنچتے مرثیوں میں ایک زبردست تبدیلی آئی اور اب مرثیہ مربع، مخمس اور مسدس ہی میں زیادہ لکھا جانے لگا۔واقعہ نگاری اور جذبات نگاری بھی تیزی کے ساتھ ہونے لگی۔

شمالی ہندوستان میں مرثیوں کی روایت محمد شاہ کے عہد سے ملتی ہے۔محمد شاہ کے عہد سے پہلے ہمیں کسی مرثیہ نگار کا نام معلوم نہیں۔البتہ اس عہد میں تین مرثیہ گویوں کا نام ملتا ہے۔میاں مسکینؔ ، اوران کے دو بھائی حزیںؔ اور غمگیںؔ ۔ان مرثیہ گویوں کا کلام اب نایاب ہے۔ کچھ تذکروں میں اس دور کے دواور مرثیہ گویوں کے نام ملتے ہیں۔ایک پسر لطف علی خان اور دوسرا محمد نعیم ۔قائم نے اپنے تذکروں میں ان کے علاوہ دواور مرثیہ گویوں کا ذکر کیا ہے ایک مرزا علی قلی ندیم اور دوسرا میر تقی۔ یہ آخری دو مرثیہ گو سوؔدا کے ہم عصر تھے۔سوؔدا کے زمانے میں کثرت سے مرثیہ گوموجود تھے۔جن میں میر امانی اسدؔ، سید محمد تقی، سکندرؔ، مرتقی میر اور گداؔ خاص ہیں۔اسی زمانے'' بگڑا شاعر مرثیہ گو'' محاورہ بنتا ہے جس کے پس پردہ ایک اہم ادبی روایت ہے۔اس عہد کی سب سے بڑی دین یہ ہے کہ سوؔدا نے مسدس کی ہیئت میں مرثیہ لکھا جو بعد میں میر خلیقؔ اور میر ضمیرؔ کی کوششوں سے مسدس ہی مرثیہ کی ہیئت قرار پائی بہر کیف حیات و کائنات کی بدلتی ہوئی شکلوں نے شعر و ادب کے ارتقا کے دھارے کا رخ بھی بار ہا موڑا ہے۔ ہر صنف ادب میں وقت کے گزرے ہوئے کاروان کے نقش قدیم ملتے ہیں۔ نیاز مانہ اپنے ساتھ تبدیلیاں لاتا ہے۔ان کی بدولت ایک صنف ادب پچھلے دور سے یکسر مختلف ہو جاتی ہے۔ چنانچہ لکھنؤ کی سرزمین میں پہنچ کر مرثیہ ترقی کے نہ صرف مدارج طے کرتا ہے بلکہ معراج حاصل کرتا ہے اور جن شعرانے ان مرثیوں کو ایک صنف سخن کی حیثیت سے ایک خاص شکل وصورت عطا کی ان میں میر انیسؔ کے والد میر خلیقؔ اور مرزا دبیرؔ کے استاد میر ضمیرؔ ہیں۔اردو مرثیے کے ارتقا میں میر ضمیر کو اہم مقام حاصل ہے۔انہوں نے مرثیہ نگاری کی صنف میں کمال پیدا کیا اور مرثیہ کے لئے ہیئت مقرر کی۔میر ضمیر کے سلسلے میں شبلی نعمانی لکھتے ہیں:۔

''سب سے پہلے جس شخص نے مرثیے کو موجودہ طرز کا خلعت پہنایا وہ میر ضمیرؔ، دبیرؔ کے استاد ہیں......انہوں نے مرثیے میں جو جدّتیں پیدا کی ہیں وہ حسب ذیل ہیں......''

۱۔ رزمیہ لکھا۔

۲۔ سراپا ایجاد کیا۔

۳۔ گھوڑے، تلوار اور اسلحہ جنگ کے الگ الگ اوصاف لکھے۔

۴۔ واقعہ نگاری کی بنیاد ڈالی۔

اوران کوششوں کو مزید جلا بخشنے والوں میں میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ ہیں۔آسمان مرثیہ میں ایک چاند ہے تو دوسرا ستارہ۔انہوں نے اپنے فن کے تمام تر کمالات کا اظہار اسی صنف میں کیا اور مرثیہ کو معراج تک پہنچایا۔ان کے مراثی میں ہندوستانی تہذیب وثقافت رچی بسی ہوئی

ہے۔اس کے علاوہ انسانی واخلاقی قدریں، زبان وبیان کی لطافت، طرزِ بیان کی سحر آفرینی، اظہار واسلوب کی سحر کاری، واقعہ نگاری اور جذبات نگاری کا کمال اور فصاحت وبلاغت بدرجہ اتم موجود ہے۔ گویا انیسؔ و دبیرؔ نے مرثیہ کی صنف کو اس قدر وسعت اور تنوع بخشا کہ مرثیے نے دیگر شعری اصناف میں اپنی ایک مخصوص شناخت بنالی۔

8.2.1: سرگرمی (آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں)

1۔ جنوبی ہند میں اردو ادب کا اہم مرکز کون سا تھا؟

الف) پنجاب ب) دکن ج) بنگال د) گجرات

2۔ مرثیہ میں بنیادی طور پر کس واقعے کو بیان کیا جاتا ہے؟

الف) جنگِ بدر ب) ہجرتِ مدینہ ج) واقعِ کربلا د) فتحِ مکہ

3۔ دکن میں اردو کی سرپرستی کس خاندان نے کی؟

الف) مغل خاندان ب) لودھی خاندان ج) قطب شاہی خاندان د) تغلق خاندان

4۔ دکنی مرثیوں کی ایک نمایاں خصوصیت کیا ہے؟

الف) مشکل زبان ب) فلسفیانہ بحث ج) زبان کی سادگی د) طنزیہ انداز

5۔ مرثیہ کا بنیادی مقصد کیا ہے؟

الف) تفریح ب) عشق کا بیان ج) شہدائے کربلا کو خراجِ عقیدت د) موسم کی منظر نگاری

8.3: عمومی جائزہ

جنوبی ہند کا علاقہ دکن اردو زبان وادب کی قدیم اور اہم سرزمین ہے۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں دکن کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہاں کے حکمرانوں نے اردو زبان کی سرپرستی کی جس کے نتیجے میں مختلف ادبی اصناف نے ترقی پائی۔ انہی اصناف میں مرثیہ بھی شامل ہے۔ مرثیہ ایک مذہبی اور جذباتی صنفِ شاعری ہے جس میں حضرت امام حسینؓ اور شہدائے کربلا کی قربانیوں کو بیان کیا جاتا ہے۔ دکن میں مرثیہ نگاری کا

آغاز مذہبی عقیدت اور اہلِ بیتؑ سے محبت کے جذبے کے تحت ہوا۔ قطب شاہی دور میں اردو ادب کو خاص فروغ حاصل ہوا۔ اس دور کے شعرا نے دکنی زبان میں مرثیے لکھے جن میں سادگی، جذباتیت اور اثر آفرینی نمایاں تھی۔ دکن کے مرثیہ نگاروں نے واقعۂ کربلا کو نہایت دردانگیز انداز میں بیان کیا۔ ان مرثیوں میں مذہبی جذبات کے ساتھ انسانی ہمدردی اور اخلاقی اقدار بھی شامل تھیں۔ دکنی مرثیے میں مقامی تہذیب اور ثقافت کی جھلک بھی ملتی ہے۔ ملا وجہی، نصرتی اور غواصی جیسے شعرا نے دکن میں مرثیہ نگاری کی روایت کو مضبوط کیا۔ ان کے کلام میں زبان کی مٹھاس، سادہ اسلوب اور جذبات کی شدت نمایاں ہے۔ دکن کے مرثیوں میں فارسی زبان کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی زبان عام فہم اور دلکش ہے۔ دکنی مرثیہ نگاری نے بعد میں شمالی ہند خصوصاً لکھنؤ کے مرثیہ نگاروں کے لیے بنیاد فراہم کی۔

مرثیہ صرف مذہبی شاعری نہیں بلکہ ایک اخلاقی درس بھی ہے۔ اس میں صبر، قربانی، شجاعت، وفاداری اور حق پرستی جیسے اوصاف کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ دکن کے شعرا نے ان اقدار کو اپنے مرثیوں کے ذریعے عام کیا۔ اس صنف نے عوام کے دلوں میں اہلِ بیتؑ کی محبت پیدا کی اور اسلامی تعلیمات کو عام کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ دکن میں مرثیہ نگاری کی روایت نے اردو ادب کو ایک نئی سمت عطا کی۔ اس صنف کے ذریعے نہ صرف مذہبی جذبات کی ترجمانی ہوئی بلکہ زبان و بیان کی خوبصورتی کو بھی فروغ ملا۔ دکن کے مرثیے اردو ادب کے ابتدائی سرمایہ کا اہم حصہ ہیں اور ان کی ادبی و تاریخی اہمیت آج بھی مسلم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنوبی ہند میں اردو مرثیہ کی روایت اردو ادب کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔

8.4: آپ نے کیا سیکھا؟

اس سبق کے مطالعے سے طلبہ نے جنوبی ہند یعنی دکن میں اردو مرثیہ کی ابتدا اور ترقی کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ انہوں نے جانا کہ دکن اردو زبان و ادب کا ایک اہم مرکز تھا جہاں مرثیہ نگاری نے خصوصی فروغ پایا۔ طلبہ کو یہ بھی معلوم ہوا کہ مرثیہ ایک مذہبی اور ادبی صنف ہے جس میں واقعۂ کربلا اور شہدائے کربلا کی قربانیوں کو بیان کیا جاتا ہے۔ طلبہ نے دکن کے اہم مرثیہ نگاروں جیسے ملا وجہی، غواصی اور نصرتی کے ادبی کردار کو سمجھا۔ انہوں نے دکنی مرثیے کی زبان، اسلوب اور موضوعات کی خصوصیات کا مطالعہ کیا۔ اس کے علاوہ طلبہ نے یہ سیکھا کہ مرثیہ صرف غم اور ماتم کا اظہار نہیں بلکہ صبر، شجاعت، وفاداری اور حق پرستی کا پیغام بھی دیتا ہے۔ اس سبق نے طلبہ میں اردو ادب کی اہم صنف مرثیہ کے بارے میں ادبی شعور پیدا کیا۔

8.5: فرہنگ

1۔ مرثیہ — سوگ کی شاعری

2۔ دکن — جنوبی ہند کا علاقہ

3۔ شہادت — حق کی خاطر جان دینا

4۔ عقیدت — احترام اور محبت

5۔ جذباتیت — احساسات کی شدت

6۔ تہذیب — ثقافت

7۔ اثر آفرینی — دل پر اثر ڈالنے کی صلاحیت

8۔ اسلوب — اندازِ بیان

9۔ روایت — چلن

10۔ قربانی — ایثار

11۔ شجاعت — بہادری

12۔ وفاداری — سچا ساتھ دینا

13۔ صبر — برداشت

14۔ اخلاقی اقدار — اچھے اوصاف

15۔ فروغ — ترقی

16۔ سرپرستی — حمایت

17۔ فصاحت — زبان کی صفائی

18۔ بلاغت — مؤثر اندازِ بیان

19۔ انسانیت — انسانی ہمدردی

20۔ ارتقا — ترقی کا عمل

8.6: خود جانچ سوالات

1۔ دکن میں اردو مرثیہ کی ابتدا کیسے ہوئی ؟

2۔ مرثیہ کا بنیادی موضوع کیا ہے؟

3۔ دکن کے اہم مرثیہ نگار کون تھے؟

4۔ دکنی مرثیے کی نمایاں خصوصیات کیا ہیں؟

5۔ مرثیہ سے ہمیں کیا اخلاقی سبق ملتا ہے؟

8.7: مشقی سوالات

1۔ جنوبی ہند میں اردو مرثیہ کی تاریخ بیان کریں۔

2۔ دکنی مرثیے کی خصوصیات پر تفصیلی نوٹ لکھیں۔

3۔ دکن کے اہم مرثیہ نگاروں کا تعارف پیش کریں۔

4۔ مرثیہ کی ادبی اور مذہبی اہمیت واضح کریں۔

5۔ واقعۂ کربلا نے اردو مرثیہ پر کیا اثرات مرتب کیے؟

8.8: جواباتِ سرگرمی

1۔ ب) دکن

2۔ ج) واقعۂ کربلا

3۔ ج) قطب شاہی خاندان

4۔ ج) زبان کی سادگی

5۔ ج) شہدائے کربلا کوخراجِ عقیدت

8.8.1: مشقی سوالات کے جوابات

1۔ جنوبی ہند میں اردو مرثیہ کی ابتدا دکن سے ہوئی جہاں قطب شاہی اور آصف جاہی حکمرانوں نے اردو ادب کی سرپرستی کی۔ مذہبی عقیدت اور واقعہ کربلا کے اثرات نے مرثیہ نگاری کو فروغ دیا۔

2۔ دکنی مرثیے کی خصوصیات میں زبان کی سادگی، جذبات کی شدت، مقامی تہذیب کی جھلک، فارسی اثرات اور دردانگیز انداز شامل ہیں۔

3۔ دکن کے اہم مرثیہ نگاروں میں ملا وجہی، نصرتی اور غواصی شامل ہیں جنہوں نے اردو مرثیہ کو ابتدائی دور میں فروغ دیا۔

4۔ مرثیہ کی ادبی اہمیت یہ ہے کہ اس نے اردو شاعری کو وسعت دی جبکہ مذہبی اہمیت یہ ہے کہ اس میں شہدائے کربلا کی قربانیوں کو خراجِ عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔

5۔ واقعہ کربلا نے اردو مرثیہ کو بنیادی موضوع فراہم کیا۔ اس واقعے نے قربانی، صبر، وفاداری اور حق پرستی جیسے موضوعات کو اردو شاعری میں نمایاں کیا۔

8.9: امدادی کتب

1۔ اردو قصیدہ نگاری — ڈاکٹر محمد کمال الدین

2۔ اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ — ڈاکٹر محمود الٰہی

3۔ انتخاب قصائد اردو — مغیث الدین فریدی

4۔ مرثیہ اور مرثیہ نگار — ڈاکٹر شاداب ردولوی

5۔ اردو مرثیہ — سید علی عباس حسینی

6۔ میر انیس اور دبیر — شبلی نعمانی

سبق نمبر 9: شمالی ہند میں اردو مرثیہ

ساخت

9.0: اغراض ومقاصد
9.1: تعارف
9.2: شمالی ہند میں اردو مرثیہ
9.2.1 : سرگرمی (آو! اپنی معلومات کو جانچیں)
9.3: عمومی جائزہ
9.4: آپ نے کیا سیکھا؟
9.5: فرہنگ
9.6: خود جانچ سوالات
9.7: مشقی سوالات
9.8: جواباتِ سرگرمی
9.8.1: مشقی سوالات کے جوابات
9.9: امدادی کتب

9.0: اغراض و مقاصد

اس سبق کا بنیادی مقصد آپ کو شمالی ہند میں اردو مرثیہ کی ادبی اور فنی اہمیت سے روشناس کرانا ہے۔اس کے ذریعے آپ مرثیہ کی ابتدا، ارتقا اور اس کی تہذیبی حیثیت کو سمجھ سکیں گے۔اس سبق کے مطالعے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ مرثیہ صرف غم والم کا اظہار نہیں بلکہ اخلاقی اقدار، انسانی ہمدردی، قربانی اور حق و باطل کی کشمکش کی بہترین عکاسی بھی ہے۔اس سبق کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ آپ میر انیس اور مرزا دبیر جیسے عظیم مرثیہ نگاروں کی خدمات سے آگاہ ہوں اور ان کے فنی کمالات کو سمجھ سکیں۔آپ مرثیہ کے اسلوب، زبان، منظر نگاری، کردار نگاری اور جذبات نگاری کا مطالعہ کریں گے جس سے آپ کی ادبی بصیرت میں اضافہ ہوگا۔اس سبق کے ذریعے اردو ادب میں شمالی ہند کے تہذیبی کردار کو بھی واضح کیا جائے گا۔مزید یہ کہ آپ میں تنقیدی شعور پیدا کرنا، ادبی ذوق کو فروغ دینا اور اردو شاعری کی مختلف اصناف سے واقفیت پیدا کرنا بھی اس سبق کے اہم مقاصد ہیں۔

9.1: تعارف

شمالی ہند میں اردو مرثیہ کی روایت اردو ادب کی نہایت اہم اور مؤثر صنف شمار ہوتی ہے۔مرثیہ دراصل کسی غمناک واقعہ یا شخصیت کے غم میں کہی جانے والی نظم کو کہتے ہیں، مگر اردو ادب میں اس کا تعلق خاص طور پر واقعۂ کربلا اور شہدائے کربلا سے وابستہ ہو گیا۔شمالی ہند، خصوصاً لکھنؤ، دہلی اور فیض آباد کے علاقوں میں مرثیہ نگاری نے غیر معمولی ترقی کی۔اس صنف نے نہ صرف مذہبی جذبات کی ترجمانی کی بلکہ تہذیبی، ادبی اور فنی ارتقا میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں اودھ کے نوابوں کی سرپرستی نے مرثیہ کو عروج عطا کیا۔اس دور میں مجالسِ عزا منعقد کی جاتی تھیں جن میں مرثیہ خوانی ایک اہم جز تھی۔میر انیس اور مرزا دبیر نے مرثیہ نگاری کو بلندیوں تک پہنچایا اور اپنی شاعری میں واقعۂ کربلا کے کرداروں کی شجاعت، قربانی، وفاداری اور انسانی عظمت کو اس انداز سے پیش کیا کہ مرثیہ صرف مذہبی ادب نہ رہا بلکہ اعلیٰ ادبی فن پارہ بن گیا۔شمالی ہند کے مرثیوں میں زبان کی شستگی، بیان کی قوت، منظر نگاری، جذبات نگاری اور مکالمہ نگاری نمایاں خصوصیات ہیں۔ان مرثیوں میں انسانی جذبات کا گہرا شعور پایا جاتا ہے۔مرثیہ نے اردو زبان کو وسعت دی اور اس میں فصاحت و بلاغت کے نئے امکانات پیدا کیے۔یہی وجہ ہے کہ شمالی ہند کی مرثیہ نگاری اردو ادب کا ایک درخشاں باب تصور کی جاتی ہے

9.2: شمالی ہند میں اردو مرثیہ

اردو کی دیگر اصناف کی طرح مرثیہ نگاری بھی دکن کے مقابلے میں شمالی ہند میں دیر سے شروع ہوئی۔شمالی ہند میں مرثیہ نگاری کی

ابتدا کب ہوئی،اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن ایک عام متفقہ رائے کے مطابق قائم دہلوی کو شمالی ہند کا پہلا مرثیہ گو کہا جاتا ہے۔بعض محققین نے یہ گمان بھی کیا ہے کہ روشن علی سہارنپوری نے جنہوں نے ''ورضہ الشہدا'' کے انداز کی ایک طویل نظم ''عاشورنامہ'' لکھی ہے۔اگرانہوں نے مرثیے بھی کہے ہیں تو ان کو شمالی ہند کا پہلا مرثیہ گو کہا جائے گا۔لیکن یہ سب قیاس کی باتیں ہیں۔شمالی ہند میں اٹھارہویں صدی کی ابتدا سے ہی مرثیہ نگاری کے نمونے ملنے شروع ہوجاتے ہیں۔اس عہد کے مرثیہ نگاروں کی تعداد محققین نے تیرہ بتائی ہے اور انہیں قدیم تذکروں میں نمایاں جگہ دی ہے۔ان شعرانے ریختہ گوئی کے ساتھ ساتھ مرثیہ گوئی پر بھی اپنی طبع آزمائی کی۔لیکن ان میں سے چند شعرا کے ہی کلام کے نمونے ملتے ہیں۔اس عہد میں شاہ حاتمؔ،میر محمد،قائمؔ،آبروؔ،سعادتؔ،یک رنگؔ اور عاصیؔ کے نام بطور خاص لئے جاتے ہیں۔میر محمد مہدی مسکینؔ اوران کے دو بھائیوں کے نام خالص مرثیہ گو شعرا میں لیا جاتا ہے۔اس دور میں مرثیے منفرد انداز سے کہے جاتے تھے۔لیکن زیادہ تر مرثیے مربع کی شکل میں ہی ملتے ہیں۔

اٹھارہویں صدی کے نصف میں مرثیہ کہنے والوں کو فہرست بہت لمبی ہوجاتی ہے۔اس دور مے مستند مرثیہ نگاروں میں عبداللہ مسکینؔ، سکندرؔ،سوداؔ،میر گھاسیؔ،قائمؔ چاند پوری،میر حسنؔ،مصحفیؔ،ندیمؔ،علی قلی خان،حافظ اشرف اور جرأتؔ کے نام لئے جاتے ہیں۔اٹھارہویں صدی کا یہ دور وہ دور تصور کیا جاتا ہے جہاں مرثیے کے پیکر کی تلاش جاری تھی۔اس دور میں نظم کی تمام شکلوں میں مرثیے لکھے جارہے تھے۔نظم کی ہر شکل کو آزمایا گیا۔اس دور میں مربع اور مسدس کی شکل کو زیادہ اہمیت دی گئی اوراس میں بھی مسدس کی شکل مرثیے کے لئے زیادہ موزوں سمجھی گئی۔شمالی ہند میں مسدس کی شکل میں سب سے پہلے سوداؔ نے طبع آزمائی کی۔گرچہ شجاعت علی سندیلوی نے سکندرؔ کو پہلا مرثیہ گو کہا ہے جس نے مرثیے کے لئے مسدس کی ہیئت سب سے پہلے استعمال کی۔اس دور میں مرثیے کی زبان میں بڑی صفائی آگئی اور بیان میں ادبی خوبیاں ابھرآئیں۔مرثیہ کہنے والے شعرانے تشبیہ اور استعاروں سے اپنے کلام کے حسن کو دوبالا کرنے کی طرف خصوصی توجہ دی۔آگے چل کر مرثیے کے جو اجزائے ترتیبی مرتب ہوئے ان کی ابتدا بھی اس وقت کے مرثیوں میں ملتی ہے۔چہرہ رزم،منظرکشی اور واقعہ نگاری کے نمونے اس دور میں اچھی صورت میں ابھر کر سامنے آئے۔

میرؔ و سوداؔ کے بعد جب لکھنؤ مرثیہ گوئی کا مرکز ثقل بنا تو یہاں سے مرثیہ گوئی کے فروغ کی ابتداء ہوئی۔جب غازی الدین حیدر نے اپنی ایک منت پوری کرنے کے لئے عزاداری کو ترقی دے کر چہلم تک بڑھایا تو ان باتوں کا عوام پر بڑا اثر ہوا اور لکھنؤ کی فضا عزاداری سے رچ بس گئی اور مرثیے سے رونے رلانے کا کام بھی لیا جانے لگا۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر ضمیرؔ نے شاعری کا فن مرثیہ کہنے کی خاطر حاصل کیا تھا۔مرخلیقؔ بھی

کسی طرح ان سے پیچھے نہ تھے۔

مرثیے کے لئے مسدس کی ہیئت کو میر ضمیرؔ اور میر خلقؔ نے مل کر نہ صرف یہ کہ پورے طور پر اپنایا بلکہ مرثیہ نگاری کے لئے اس ہیئت کو مقرر کر کے اس کے حسن کو دوبالا کر دیا۔ میر ضمیرؔ نے مرثیہ کے ربط و تسلسل پر زور دیا۔ مرثیے میں گرچہ سیرت نگاری، جذبات نگاری، معالمہ نگاری اور عناصر ترکیبی میں رخصت، آمد، جنگ، گھوڑے اور تلوار کی تعریف کا رواج ہو چلا تھا لیکن باضابطہ اس کی ترتیب کو میر ضمیرؔ نے مرثیے کے لئے متعین کر دیا اور ان میں مزید چہرہ اور سراپا کا اضافہ کیا۔ انہوں نے واقعہ کربلا سے متعلق روایات اور بعض ضمنی واقعات کو بھی اپنے مرثیوں میں خاص طور سے جگہ دی۔ مرثیے کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرثیہ کے لئے بھی کوئی خاص ہیئت متعین نہیں رہی اور اگر حقیقت پر غور کیا جائے تو آج بھی اس کے لئے کوئی خاص ہیئت مقرر نہیں ہے۔ ہاں اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسدس مرثیے کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہیئت ہے۔ لیکن شروع میں بہت سے مرثیے غزل کی شکل میں لکھے گئے اور بہت بعد تک لکھے جاتے رہے۔ غالبؔ نے اپنا مشہور مرثیہ اسی ہیئت میں لکھا ہے۔ مثنوی کی ہیئت بھی مرثیے کے مقبول رہی ہے۔ اقبالؔ نے ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' مرثیہ مثنوی کی ہیئت میں ہی لکھا ہے۔ حالیؔ نے غالبؔ کا مرثیہ ترکیب بند کی ہیئت میں لکھا ہے۔ علاوہ ازیں قطعے، رباعی، مخمس وغیرہ بھی مرثیے کی مقبول ہیئتیں رہی ہیں۔ بالآخر مسدس ہی وہ ہیئت ٹھہری جو منفقہ طور پر مرثیے کے لئے طے کر لی گئی اور اس کے آٹھ اجزا بھی طے کئے گئے۔ ان میں چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، رزم، شہادت، بین کو مراثی میں شعوری طور پر برتا جانے لگا۔

ایوان مرثیہ کے چار ستونوں میں ایک ستون کی حیثیت میر خلیقؔ کو حاصل ہے۔ میر خلیقؔ، میر حسنؔ کے لڑکے اور میر انیسؔ کے والد محترم تھے۔ انہوں نے فیض آباد اور لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی تھی اور شیخ مصحفیؔ سے شاعری میں اصلاح لیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی عمر صرف مرثیہ گوئی اور غزل گوئی میں صرف کی۔ مولانا شبلی نے بجا طور پر مرثیہ نگاری کے فن میں میر خلیقؔ کو میر ضمیر کا مدمقابل بتایا ہے اور دونوں کے کارنامے کو مشابہ قرار دیا ہے۔ میر خلیقؔ کے مراثی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے زبان کی سادگی اور صفائی پر خصوصی توجہ دی ہے۔ ان کے مرثیوں میں محاورے بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ عام طور سے ان کے مرثیوں میں روایات کا نظم ملتا ہے۔ تشبیہات اور استعارات کا کم سے کم استعمال اور تسلسل بیان پر زیادہ زور ملتا ہے۔ واقعات کی مصوری میں بڑی سادگی پائی جاتی ہے تحلیل نفسی میں فنی چابکدستی کا مظاہرہ ملتا ہے۔ یہ عام طور سے کہا جاتا ہے کہ خلیقؔ کی مرثیہ گوئی رخصت اور بین کی شاعری ہے۔ ان کے مرثیوں میں غم انگیز واقعات پر زیادہ زور ملتا ہے۔ خصوصاً جناب قاسم کے حال کے مرثیوں میں انہیں ید طولیٰ حاصل ہے۔

میر ضمیرؔ کو اردو مرثیے کے ارتقا میں سنگ میل کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ یہ بھی مصحفیؔ کے شاگرد تھے اور عہد آصف الدولہ میں فیض آباد سے لکھنؤ آ کر بس گئے تھے۔ میر ضمیرؔ گرچہ خاندانی شاعر نہ تھے مگر کہا جاتا ہے کہ آسمان مرثیہ گوئی پر آفتاب و مہتاب بن کر چمکے۔ مرثیہ کو ایک نئی سمت اور ایک نیا رخ عطا کیا ہوا ضمیرؔ کا ہی ہے۔ انہوں نے اردو مرثیہ میں چار اہم جدتیں پیدا کیں۔

ا۔ رزمیہ لکھا۔

۲۔ سراپا ایجاد کیا۔

۳۔ گھوڑے تلوار اور اسلحہ جنگ کے الگ الگ اوصاف بیان کئے۔

۴۔ اور واقعہ نگاری کی بنیاد ڈالی۔

میر ضمیرؔ نے ہی مسدس کو مرثیے کی ہیئت کے لئے عام رواج عطا کیا۔ گرچہ اس میں میر خلیقؔ کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ میر ضمیرؔ لکھتے ہیں:۔

جس سال لکھے وصف یہ ہم شکل نبی کے
سن بارہ سو انچاس تھے ہجر نبوی کے
آگے تو یہ انداز سُنے تھے نہ کسی کے
اب سب یہ مقلد ہوئے اس طرزِ نئی کے
دس میں کوں، سو میں کہوں یہ ورد ہے مرا
اس طرز میں جو جو کہے شاگرد ہے مرا

میر ضمیرؔ نے مرثیے کی جدید شکل میں بہت سہارا دیا۔ انہوں نے بہت سے نامانوس الفاظ ترک کر دئے۔ ضمیرؔ نے مرثیے کو روایت کے مقابلے میں زیادہ طویل کیا۔ تا اینجا کہ ان کے بعض مرثیے سو بند سے بھی تجاوز کر گئے۔ سراپا اور رزمیہ کا التزام ان کے مرثیوں میں خاص طور سے ملتا ہے۔ جذبات نگاری اور منظر نگاری کو ان کے مرثیوں میں ایک مستقل حیثیت حاصل ہے۔ ان کی زبان سادہ اور سلیس ہوتی ہے۔ انہوں نے تشبیہات کو مفرد اور قریب الفہم بنا کر استعمال کیا ہے۔ ضمیرؔ، خلیقؔ، فصیحؔ اور دلگیرؔ کے بعد جو دور شروع ہوتا ہے اسے مرثیے کا عہد زریں کہا گیا ہے۔ یہ وہ دور ہے جہاں انیسؔ اور دبیرؔ جیسے دیو قامت شعراُ کے مرثیے نمودار ہوئے۔ مرثیے کے اس ترقی یافتہ دور نے عام اور شاعری پر بھی اثر ڈالا اور اس کی سطح کو بھی اونچا کیا اور بجا طور پر کہا گیا ہے کہ۔

سبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر
مگر ہم نے پلّہ گراں کر دیا

پھراس کے بعد کسی کی ہمت نہ رہی جو وہ یہ بات دہرا سکیں کہ ''بگڑا شاعر مرثیہ گو'' ہوتا ہے۔اس وقت مرثیہ کہنے والے بہت شعرائ تھے لیکن دبیرؔ، انیسؔ، میر عشقؔ، مرزا آتشؔ کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔اس وقت عوام میں دبیر کی کافی پذیرائی ہو رہی تھی۔انہوں نے شعر کے بہت سے نوک پلک درست کئے۔ مرثیے کے حسن کو دوبالا کرنے میں اپنا خون پانی کر دیا لیکن معنی اور حسن میں توازن برقرار رکھنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔پھر میر انیسؔ میدان مرثیہ میں آئے۔ابتدا میں کسی نے بھی میر انیسؔ کے کلام پر توجہ نہیں کی مگر انیسؔ نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی زور آزمائی شروع کر دی اور آہستہ آہستہ لوگوں کے رجحان کو موڑنے میں کامیاب ہو گئے۔انیسؔ و دبیرؔ کے کلام کا مطالع کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اپنے کلام میں مرثیہ کی ہیئت اور اجزا کو دونوں نے بڑی صفائی اور خوب صورتی سے برتا ہے لیکن فن کے معاملے میں دونوں دوزاوئے پر ٹکے ہوئے ہیں۔میر دبیرؔ کے یہاں بلاغت اپنے عروج پر اپنا حسن کمال دکھا رہی ہے تو میر انیسؔ کے یہاں فصاحت اپنی بہاریں دکھا رہی ہے۔اس دور کے مرثیہ نگاروں میں ایک نام مونس کا بھی بہت اہم ہے۔لیکن اس دور میں لوگ انیسؔ و دبیرؔ میں اس قدر گم ہوئے کہ میر مونسؔ کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں گیا۔پھر انیسیے اور دبیریے کی نسل نے آپسی تناؤ کے ذریعہ اردو مرثیہ میں بہت اضافہ کیا جس کے نتیجے میں مرثیے کی شکل میں اردو شاعری کو ایسے ایسے جواہر پارے ہاتھ آئے جن سے دنیا کے اچھے اچھے ادیبوں کی مجلس میں جگہ پانے کے لائق ہو گئیں۔اس کے بعد جو اردو مرثیہ نگاری میں نسل آئی ان میں وحیدؔ، رشیدؔ، کاملؔ، نفیسؔ، اوجؔ اور تعشقؔ کے نام بطور خاص لئے جاتے ہیں۔نفیسؔ نے انیسؔ کی زبان اختیار کی، پیارے صاحب رشید نے مرثیہ کو بہار اور ساقی نامے میں ایسا کھپایا کہ ہر چہار سمت سے داد ملی۔وحید نے زبان و بیان، شدت جذبات اور فن کو مزید توانائیوں سے ہمکنار کیا۔انیسویں صدی کی آخری چوتھائی آنے پر تین ایسے مرثیہ گو ابھرے جنہوں نے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کیا اور جن کے کلام واقعتاً اساتذہ کے کلام کے ہم پلّہ تصور کیا گیا۔ان میں شادؔ عظیم آبادی، شمیمؔ امروہی اور عارفؔ لکھنوی کے نام لئے جاتے ہیں۔شادؔ عظیم آبادی نے اپنے مرثیے میں تصوف اور الٰہیات داخل کر کے مرثیے میں ایسی وسعت پیدا کی جس کی پیروی عام کے بس کی بات نہ تھی۔شادؔ کے بعد مرزا اوج لکھنوی کا نام بھی مرثیہ نگاروں میں اہم ہے۔عروجؔ، مودبؔ اور قدیمؔ کے نام بھی فراموش نہیں کئے جاسکتے۔

بیسویں صدی کی دوسری چوتھائی میں مرثیے کی تاریخ میں ایک بڑا انقلاب پیدا ہوا اور اس دور کے مرثیہ نگاروں نے نئے زمانے اور زندگی کی سفاکیوں کو ایک نئے انداز سے پیش کرنا شروع کیا۔ابن مرثیے میں ساری مظلوم انسانیت اس کا موقوع بن گئی اور حضرت امام حسینؑ

اس مظلوم انسانیت کا ایک ایسا سہارا نظر آئے جن کے جرآت ہمت مستعار لی گئیں ۔اس رنگ کے مرثیے کی ایجاد جوش اور جمیل مظہری نے کی اوراس کے فوراً بعد جونسل ان راہوں پر گامزن ہوئی ان میں نسیم امروہی، نجم آفندی، آل رضا آفندی اور وحید اختر کے نام بطور خاص لئے جاتے ہیں۔لیکن آج بھی ان جدید طرز کے مرثیوں کے ساتھ روایتی طرز کے بھی مرثیے بکثرت لکھے جا رہے ہیں ۔لیکن افسوس کہ ادب میں اس صنف مرثیہ کا ذکر دھیرے دھیرے پست ہوتا جا رہا ہے۔بطور صنف ادب مرثیہ کے سرمائے کی حفاظت ہمارا عین فریضہ ہے۔

9.2.1 : سرگرمی (آو! اپنی معلومات کو جانچیں)

1۔ اردو مرثیہ کی سب سے زیادہ ترقی کہاں ہوئی؟

الف) پنجاب　　ب) لکھنؤ　　ج) سندھ　　د) کشمیر

2۔ مرثیہ کا تعلق زیادہ تر کس واقعہ سے ہے؟

الف) جنگِ بدر　　ب) جنگِ پلاسی　　ج) واقعۂ کربلا　　د) تحریکِ آزادی

3۔ میر انیس کس صنفِ ادب کے مشہور شاعر تھے؟

الف) غزل　　ب) قصیدہ　　ج) مثنوی　　د) مرثیہ

4۔ مرزا دبیر کا تعلق کس ادبی صنف سے تھا؟

الف) مرثیہ　　ب) رباعی　　ج) نظم　　د) حمد

5۔ مرثیہ میں سب سے نمایاں جذبہ کون سا ہوتا ہے؟

الف) خوشی　　ب) طنز　　ج) غم　　د) حیرت

9.3: عمومی جائزہ

شمالی ہند میں اردو مرثیہ نے ایک منفرد ادبی حیثیت حاصل کی۔ابتدا میں مرثیہ مختصر اور سادہ انداز میں لکھا جاتا تھا،مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں فنی پختگی پیدا ہوئی۔خاص طور پر اودھ کے دورِ حکومت میں مرثیہ نگاری کو سرکاری سرپرستی حاصل ہوئی۔لکھنؤ مرثیہ نگاری کا مرکز

بن گیا جہاں مجالسِ عزا میں مرثیہ خوانی کی روایت عام ہوئی۔اس ماحول نے مرثیہ کو ترقی دی اور کئی بڑے شعرا سامنے آئے۔اردو مرثیہ کا بنیادی موضوع واقعۂ کربلا ہے۔اس میں حضرت امام حسینؑ، ان کے اہلِ بیت اور رفقا کی قربانیوں کو نہایت دردناک اور مؤثر انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔مرثیہ نگاروں نے شہدائے کربلا کے کرداروں کو عظمت، شجاعت، صبر اور وفاداری کی علامت بنا کر پیش کیا۔اس صنف میں نہ صرف مذہبی عقیدت شامل ہے بلکہ انسانی ہمدردی اور اخلاقی تعلیمات بھی پائی جاتی ہیں۔

میر انیس اور مرزا دبیر اردو مرثیہ کے دو عظیم ستون سمجھے جاتے ہیں۔میر انیس نے اپنے مرثیوں میں جذبات نگاری، منظر کشی اور کردار نگاری کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔ان کے مرثیوں میں زبان کی سادگی اور بیان کی قوت نمایاں ہے۔مرزا دبیر نے بھی مرثیہ کو فنی بلندی عطا کی اور اپنے منفرد اسلوب کے ذریعے شہرت حاصل کی۔دونوں شعرا کے درمیان ادبی مقابلہ بھی مشہور رہا جس سے مرثیہ نگاری کو مزید فروغ ملا۔شمالی ہند کے مرثیوں میں تہذیبی زندگی کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ان مرثیوں میں اس دور کے رسم و رواج، لباس، رہن سہن اور معاشرتی اقدار کی عکاسی موجود ہے۔مرثیہ نگاروں نے مکالمہ نگاری، منظر نگاری اور جذباتی کیفیت کو اس مہارت سے پیش کیا کہ قاری خود کو واقعۂ کربلا کے ماحول میں محسوس کرتا ہے۔مرثیہ نے اردو زبان و ادب کو بے شمار ادبی خوبیاں عطا کیں۔اس صنف نے اردو زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کیا اور بیان و اسلوب میں وسعت پیدا کی۔مرثیہ آج بھی اردو ادب کی ایک زندہ اور مؤثر صنف مانی جاتی ہے اور شمالی ہند کی ادبی روایت میں اس کا مقام نہایت بلند ہے۔

9.4: آپ نے کیا سیکھا؟

طلبہ نے اس سبق کے ذریعے شمالی ہند میں اردو مرثیہ کی اہمیت، اس کی ابتدا اور ارتقا کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔انہوں نے میر انیس اور مرزا دبیر کی ادبی خدمات کو سمجھا اور مرثیہ کی فنی خصوصیات جیسے منظر نگاری، جذبات نگاری اور کردار نگاری سے واقفیت حاصل کی۔طلبہ نے یہ بھی جانا کہ مرثیہ صرف غم کی شاعری نہیں بلکہ اخلاقی اقدار، قربانی، شجاعت اور انسانی ہمدردی کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔

9.5: فرہنگ

مرثیہ : غم کی نظم

عزا : سوگ

شہداء : جان قربان کرنے والے

کربلا : عراق کا مشہور مقام

شجاعت : بہادری

وفاداری : نبھانا

جذبات نگاری: احساسات کا بیان

منظر نگاری: منظر کی تصویر کشی

کردار نگاری: کرداروں کی عکاسی

بلاغت : مؤثر اندازِ بیان

فصاحت : صاف اور عمدہ زبان

اسلوب : اندازِ تحریر

عقیدت : احترام اور محبت

روایت : رسم یا طریقہ

تہذیب : ثقافت

مکالمہ : گفتگو

قربانی : جان یا چیز دینا

ادبی بصیرت: ادبی سمجھ

معاشرت : سماجی زندگی

ارتقا : ترقی

9.6:خود جانچ سوالات

1۔ اردو مرثیہ کی ترقی میں لکھنؤ کا کیا کردار تھا؟

2۔ مرثیہ کا بنیادی موضوع کیا ہے؟

3۔ میر انیس کی شاعری کی اہم خصوصیات بیان کریں۔

4۔ مرزا دبیر نے مرثیہ نگاری میں کیا خدمات انجام دیں؟

5۔ مرثیہ اردو ادب میں کیوں اہم سمجھا جاتا ہے؟

9.7:مشقی سوالات

1۔ شمالی ہند میں اردو مرثیہ کی ابتدا اور ارتقا بیان کریں۔

2۔ میر انیس کی مرثیہ نگاری پر تفصیلی نوٹ لکھیں۔

3۔ مرزا دبیر کے فنی کمالات بیان کریں۔

4۔ مرثیہ کی ادبی اور تہذیبی اہمیت پر روشنی ڈالیں۔

5۔ اردو مرثیہ کی نمایاں خصوصیات بیان کریں۔

9.8:جواباتِ سرگرمی

1۔ ب)لکھنؤ

2۔ ج)واقعہ کربلا

3۔ د)مرثیہ

4۔ الف)مرثیہ

5۔ ج)غم

9.8.1: مشقی سوالات کے جوابات

1۔ شمالی ہند میں اردو مرثیہ کی ابتدا دکن سے متاثر ہوکر ہوئی لیکن اس نے اصل ترقی لکھنؤ میں حاصل کی۔نوابینِ اودھ کی سرپرستی میں مرثیہ نگاری کو فروغ ملا اور میر انیس و مرزا دبیر نے اسے عروج تک پہنچایا۔

2۔ میر انیس اردو مرثیہ کے عظیم شاعر تھے۔ان کی شاعری میں جذبات نگاری، منظر نگاری، سادگی اور فصاحت نمایاں ہے۔انہوں نے واقع؟ کربلا کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا۔

3۔ مرزا دبیر نے مرثیہ نگاری میں بلند پایہ زبان، شاندار منظر کشی اور پراثر بیان کے ذریعے شہرت حاصل کی۔ان کا اسلوب منفرد اور پرشکوہ تھا۔

4۔ مرثیہ کی ادبی اہمیت یہ ہے کہ اس نے اردو زبان کو وسعت دی اور شاعری میں جذباتی گہرائی پیدا کی، جبکہ تہذیبی اہمیت یہ ہے کہ اس میں شمالی ہند کی معاشرت اور ثقافت کی جھلک ملتی ہے۔

5۔ اردو مرثیہ کی نمایاں خصوصیات میں جذبات نگاری، منظر نگاری، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، زبان کی فصاحت اور واقع؟ کربلا کی مؤثر عکاسی شامل ہیں۔

9.9: امدادی کتب

1۔اردو قصیدہ نگاری — ڈاکٹر محمد کمال الدین

2۔اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ — ڈاکٹر محمود الٰہی

3 ۔انتخاب قصائد اردو — مغیث الدین فریدی

4 ۔مرثیہ اور مرثیہ نگار — ڈاکٹر شاداب ردولوی

5 ۔اردو مرثیہ — سید علی عباس حسینی

6 ۔میر انیس اور دبیر — شبلی نعمانی

سبق نمبر 10 اردو مرثیے کا سنہری دور (انیس اور دبیؔر کے حوالے سے)

ساخت

10.0: اغراض ومقاصد

10.1: تعارف

10.2: اردو مرثیے کا سنہری دور (انیس اور دبیؔر کے حوالے سے)

10.2.1 : سرگرمی (آو! اپنی معلومات کو جانچیں)

10.3: عمومی جائزہ

10.4: آپ نے کیا سیکھا؟

10.5: فرہنگ

10.6: خود جانچ سوالات

10.7: مشقی سوالات

10.8: جواباتِ سرگرمی

10.8.1: مشقی سوالات کے جوابات

10.9: امدادی کتب

10.0:اغراض ومقاصد

اس سبق کا مقصد آپ کو اردو مرثیے کے سنہری دور سے روشناس کرانا ہے تاکہ وہ مرثیہ نگاری کی ادبی اور فنی اہمیت کو سمجھ سکیں۔اس سبق کے ذریعے آپ میر انیس اور مرزا دبیر کی خدمات اور ان کے منفرد اسلوب سے واقف ہوں گے۔آپ یہ جان سکیں گے کہ مرثیہ صرف غم کی شاعری نہیں بلکہ اس میں انسانی اقدار، قربانی، شجاعت، صبر اور حق و باطل کی کشمکش کو بھی مؤثر انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔اس سبق کا ایک اہم مقصد آپ میں ادبی ذوق پیدا کرنا اور انہیں اردو شاعری کی مختلف اصناف سے متعارف کرانا بھی ہے۔اس مطالعے کے ذریعے آپ مرثیہ کی فنی خصوصیات جیسے منظر نگاری، جذبات نگاری، کردار نگاری اور مکالمہ نگاری کو سمجھ سکیں گے۔مزید یہ کہ آپ لکھنؤ کی تہذیبی فضا اور نوابی دور کی ادبی خدمات سے بھی آگاہ ہوں گے۔اس سبق کے مطالعے سے آپ میں تنقیدی شعور پیدا ہوگا اور آپ اردو ادب میں مرثیہ کے مقام و مرتبے کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔

10.1:تعارف

اردو ادب میں مرثیہ ایک نہایت اہم اور مؤثر صنفِ سخن ہے جس نے خصوصاً شمالی ہند میں غیر معمولی ترقی کی۔مرثیہ کا بنیادی موضوع واقع؟ کربلا اور حضرت امام حسینؑ اور ان کے رفقا کی عظیم قربانیوں کا بیان ہے۔اردو مرثیے کا سنہری دور انیسویں صدی میں آیا جب لکھنؤ علم و ادب کا مرکز بن چکا تھا۔اس دور میں مرثیہ نگاری نے ایسی بلندی حاصل کی کہ اسے اردو شاعری کی عظیم ترین اصناف میں شمار کیا جانے لگا۔اس ترقی میں دو بڑے شعرا، میر انیس اور مرزا دبیر، کا کردار سب سے نمایاں ہے۔ان دونوں شاعروں نے مرثیہ کو فنی، ادبی اور فکری اعتبار سے کمال تک پہنچایا۔لکھنؤ کے نوابی دور میں مجالسِ عزا اور مذہبی اجتماعات عام تھے جہاں مرثیہ خوانی کو خاص اہمیت حاصل تھی۔اسی ماحول نے مرثیہ نگاری کو فروغ دیا۔میر انیس نے اپنے مرثیوں میں جذبات نگاری، کردار نگاری، منظر کشی اور زبان کی سادگی کو اس مہارت سے پیش کیا کہ ان کے اشعار دل پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔دوسری طرف مرزا دبیر نے بلند آہنگ اسلوب، شاندار الفاظ اور پرشکوہ منظر نگاری کے ذریعے مرثیہ کو عظمت عطا کی۔

اردو مرثیے کے اس سنہری دور میں صرف مذہبی عقیدت ہی نمایاں نہیں تھی بلکہ انسانی اقدار، اخلاقیات، بہادری، صبر اور قربانی کے تصورات بھی اجاگر ہوئے۔مرثیہ نگاری نے اردو زبان کو فصاحت، بلاغت اور ادبی وسعت عطا کی۔یہی وجہ ہے کہ میر انیس اور مرزا دبیر کو اردو مرثیے کے دو عظیم ستون کہا جاتا ہے اور ان کا دور اردو مرثیے کا سنہری دور تصور کیا جاتا ہے۔

10.2: اردو مرثیے کا سنہری دور (انیسؔ اور دبیرؔ کے حوالے سے)

وسط انیسویں صدی کو اردو مرثیہ نگاری کا دور عروج تصور کیا جاتا ہے۔ یہ دور اردو مرثیہ نگاری کا وہ دور ہے جہاں "بگڑا شاعر مرثیہ گو" کہنے والوں کی زبان مقفل ہوگئی اور ترازوئے شعر جو سبک ہو رہی تھی وہ گراں مایہ ہوگئی۔ لکھنؤ کے مذہبی ماحول میں مجالس عزا کی کثرت اور اس کے ساتھ خواص و عوام کی قدردانی مرثیہ کے ارتقا میں بہت مفید ثابت ہوئی۔ انیسویں صدی کے نصف میں جب ہم اردو مرثیے کا جائزہ لیتے ہیں تو اس دور میں لکھنؤ میں مرثیہ نگاروں کی ایک کثیر تعداد ابھر کر سامنے آتی ہے جن میں افسردہ، گداؔ، محمد تقی ہوسؔ، دلگیرؔ، خلقؔ، ضمیرؔ، خلیقؔ اور فصیحؔ وغیرہ کے ساتھ مرثیہ کے بے تاج بادشاہ مرزا دبیرؔ اور میر انیسؔ کے نام تارخورشید کی طرح صفحۂ فن پر منور نظر آتے ہیں۔ ان شعرأ میں ضمیرؔ اور خلیقؔ ایسے مرثیہ گو ہیں جنہوں نے مرثیہ کا فن اور معیار متعین کیا۔ انہوں نے بعد کے مرثیہ گویوں کے لئے لافانی نقوش چھوڑے۔ دلگیرؔ اور فصیحؔ نے بھی مرثیے میں ایسے نقوش چھوڑے جنہیں آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دلگیرؔ شاعری میں شیخ ناسخؔ کے شاگرد تھے اور ان کی قادر کلامی کو لوگوں نے بجا طور پر تسلیم کیا۔ انہوں نے کئی ہزار اشعار کے سرمائے چھوڑے ہیں۔ ان کے مرثیے مختصر، رواں اور صاف و شستہ ہوتے ہیں۔ دلگیرؔ کے مرثیے سوز خوانی کے طرز کے لئے بہت مشہور ہیں۔ ان کے مرثیے میں کہیں کہیں تعقید لفظی اور متروک الفاظ بھی ملتے ہیں۔ عربی فارسی کی دقیق ترکیبوں اور مشکل الفاظ سے انہوں نے حتیٰ الوسیع احتراز کیا ہے۔ فنی اعتبار سے بھی ان کے مرثیے ضمیرؔ، خلیقؔ، اور فصیح سے کسی معنوں میں کم نہیں۔

مرزا جعفر علی فصیحؔ کا شمار بھی اس دور کے مشہور گویوں میں ہوتا ہے۔ لیکن ان کے بیشتر ایام دیار مکہؔ میں گزرے اس لئے لکھنؤ میں زیادہ مشہور نہ ہوئے۔ ان کے مرثیوں میں جذبات نگاری اور واقعہ نگاری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ زبان بہت صاف، رواں اور بامحاورہ ہے۔ المیہ اور رزمیہ عناصر کو انہوں نے ایک مستقل جزو کی حیثیت سے مرثیہ میں قائم کیا۔

میر خلیقؔ ایک ایسے مرثیہ گو ہیں جن کا شمار ایوان مرثیہ کے چار ستونوں میں ہوتا ہے۔ میر خلیقؔ، میر حسنؔ کے صاحبزادے اور میر انیسؔ کے والد تھے۔ شاعری میں مصحفیؔ کے شاگرد تھے۔ شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ میر خلیقؔ نے میر ضمیرؔ سے کم اس فن پر احسان نہیں کیا ہوگا لیکن افسوس کہ ان کا کلام نہیں ملتا۔ پھر بھی جو تھوڑے بہت ان کے کلام ملتے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی زبان سادہ، صاف اور بامحاورہ ہے۔ تشبیہات اور استعارات بھی ان کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ واقعات کی مصوری میں انہیں کامیابی حاصل ہے۔ ان کے یہاں کردار نگاری کی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ ان کی زبان کا اندازہ اس شعر سے تو کیجئے۔

ہاتھ رکھ رکھ کر دھڑک دیکھو میرے سینے کی
جیتی بھی رہتی کوئی دن تو نہیں جینے کی

میر خلیقؔ کے ساتھ میر ضمیرؔ کا نام اردو مرثیہ گوئی میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ میر ضمیرؔ بھی مصحفیؔ کے شاگرد تھے اور فیض آباد سے لکھنؤ آ کر مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ گرچہ خاندانی مرثیہ گو نہ تھے لیکن آسمان مرثیہ پر آفتاب و مہتاب بن کر چمکے۔ مرثیہ کی تکمیل نو کا سہرا انہیں کے سر باندھا جاتا ہے۔ انہوں نے مرثیے میں جو جدتیں اختراع کیں ان میں رزمیہ، سراپا، گھوڑے، تلوار اور اسلحہ جنگ کے اوصاف اور واقعہ نگاری کی بنیاد پر ضمیرؔ کی اہم کوشش تسلیم کی جاتی ہے۔ جس سلیقے سے انہوں نے مرثیے کے اجزا کو نبھانے کا رواج عام کیا، متاخرین پر اس کا بہت گہرا چھاپ پڑا۔ ان کے بعض مرثیے بہت طویل ہیں اور سو بندوں سے بھی تجاوز کر جاتے ہیں۔ ان کی تشبیہیں مفرد اور قریب الفہم ہوتی ہیں۔

ضمیرؔ، خلیقؔ، فصیحؔ اور دلگیرؔ کے بعد میر و مرزا آسمان مرثیہ پر اس طرح نمودار ہوئے کہ ان کی تابانی دیگر خط روشن کو ماند کر گئی۔

میر انیسؔ میدان مرثیہ کے ایک بڑے قادر الکلام شاعر تصور کئے جاتے ہیں۔ بلکہ عام اعتراضات کو پرے رکھ کر سوچا جائے اور انیسؔ کے فن کو موازنے کے بعد غور کیا جائے تو انیسؔ بلا مبالغہ مرثیہ کے عروج کی انتہا پر جا کھڑے ہوتے ہیں۔ میر انیسؔ نازک سے نازک خیال اور طبیعت پر لطیف سے لطیف کیفیت کو نہایت ہی عام فہم انداز میں بیان کر کے ایک گہرا نقش چھوڑ جانے کے ہنر سے واقف ہیں۔ انیسؔ جیسا خیال بیان کرنا چاہتے ہیں ویسا ہی ذخیرہ الفاظ بھی ذہن کے نہاں خانوں سے باہر لاتے ہیں اور من وعن سامع کے ذہن پر عکس قائم کر دیتے ہیں۔ اختصار اور طویل پر انہیں قدرت کاملہ حاصل ہے۔ لفظوں سے کھیلنے کا ہنر انہیں خوب آتا ہے۔ ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کا ہنر جانتے ہیں۔ واقعہ نگاری میں انیسؔ کو کمال حاصل ہے اور واقعہ نگاری میں بھی اجمالی بیان میں تفصیل و توضیح کا ہنر پایا جاتا ہے۔ منظر نگاری کا ہنر انہیں خوب آتا ہے اور مبالغہ میں بھی وہ حسن پیدا کر کے بیان کرتے ہیں کہ اس کا گمان حقیقت کی طرف ہونے لگتا ہے۔ صبح کی رونق، شام کا سناٹا، بہار کا جوش، گرمی کی شدت اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اس شاعرانہ انداز پر بے ساختہ دل پھڑک اٹھتا ہے۔ ایک پیاس کی شدت کو ہی لیجئے، وہ کس انداز سے بیان کرتے ہیں۔

پیاسی تھی جو سپاہِ خُدا تین رات کی
ساحل سے سر پٹکی تھیں موجیں فرات کی

جذبات کے اظہار میں تو میر انیسؔ کو قدرت صاحل ہے۔ خواہ وہ جذبات خوشی کے ہوں، غم، حیرت اور غصے کے ہوں، ان جذبات کے

اندر مدارج کو ملحوج رکھنا اوران کا اظہار کر لینا ہی انیسؔ کا طرہ امتیاز ہے۔علی اصغر کی موت پر ان کی ماں کیسی دل برادشتہ ہوتی ہیں۔ذا رس کی فطری حقیقت پر تو غور کیجئے

لاشوں پہ لائیں بیویاں زینب کو تھام کر
ماتم کی صف پہ گر پڑیں وہ سوختہ جگر
بولیں بڑھا کے دست مبارک اِدھر اُدھر
بیٹے کہاں ہیں، مجھ کو کچھ آتا نہیں نظر
کیسی دھڑا دھڑ ہے یہ کیوں بین ہوتے ہیں
لوگو نہ غُل مچاؤ میرے لال سوتے ہیں

اور سیرت نگاری تو گو میا میر انیسؔ سے پہلے تھی ہی نہیں۔انہوں نے افراد کربلا کے مزاج و معیار کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اوران کی سیرتوں کو ان کے معیار کے حساب سے پیش کیا۔کہتے ہیں کہ ان کی سیرت نگاری میں عربی و عجمی مزاج کا امتزاج پایا جاتا ہے۔اخلاقی شاعری کے اعتبار سے بھی انیسؔ کے مرثیوں کا پایہ بہت بلند ہے۔ان کے تمام کلام میں بلند اخلاق کی ایک لہر دوڑی ہوئی ہے۔سلاست ،روانی، شگفتگی اور فصاحت کے دوسرے لوازم انیسؔ کے کلام میں اس قدر نمایاں ہیں کہ قاری کی نظر بلا توجہ دلائے اس پر مرکوز ہو جاتی ہے۔رعایت لفظی، حسن تعلیل، تشبیہات اوستعارات ، رواں فارسی کی تراکیب جن سے شاعری ایک ایک روایتی حسن پیدا ہوتا ہے، وہ انیسؔ کے یہاں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔سلاست، اختصا اور طوالت جب جیسا چاہتے ہیں بیان کرتے ہیں۔ان کے مرثیوں میں گفتگو اور جو مکالمے کا انداز ہے اس کے مقابل کوئی شاعری پہنچ نہیں سکا۔ترتیب اور تسلسل کا خاصا خیال رکھتے ہیں۔رزم و بزم سے لے کر مرثیہ کے تمام اجزأ کو برتنے کا ہنر ان میں کوٹ کوٹ کر پایا جاتا ہے۔

مرزا سلالت علی دبیرؔ کا نام میر انیسؔ کے ہم عصروں میں اس طرح قائم ہے کہ ان دونوں کے کلام مرثیہ کے موازنے ہر دور میں ہوتے رہے ہیں۔کسی نے میر انیسؔ کو بڑا مرثیہ تسلیم کیا تو کسی نے مرزا دبیرؔ کو مرثیہ گوئی میں بزرگ و برتر تصور کیا۔بعض ایسے اہل نظر بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ اگر مرثیہ میں فصاحت کی عمدہ مثال تلاش کرنی ہو تو انیسؔ کے مرثیوں کا مطالعہ کرو اور اگر مرثیے میں بلاغت کے نمونے دیکھنے ہوں تو بڑا مرثیہ گو رہا ہے یا مرزا دبیرؔ بہر حال یہ معاصرانہ چشمک تو دبستان لکھنؤ کی دیرینہ روایت تھی جو دور میر و مرزا میں بھی دیکھی جاتی ہے۔مولانا شبلی نے

تنقیدی کتاب موازنہ انیسؔ و دبیرؔ لکھی ہے، اس میں سارے بیانات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ بہر حال اعتراضات اور موازنے سے پرے جب ہم دبیرؔ کے مرثیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کے یہاں مضمون آفرینی اور مشکل پسندی اپنے جملہ لوازم کے ساتھ ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ جیسے مرزا دبیرؔ کا یہ مشہور مصرع ہے جس میں شام کے نمودار ہونے کی بات کی گئی ہے۔

پیدا شعاع مہر کی مقراض جب ہوئی

ان کے مرثیوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ تخیل آرائی، مبالغہ، دقیق تشبیہات واستعارات، غیر معروف تلمیحات، مشکل الفاظ وتراکیب اور صنعتوں کے استعمال پر انہوں نے بڑا زور صرف کیا ہے۔ ان کی شاعری کا ایک بڑا مقصد علم وفن کا مظاہرہ تخیلی نزاکتیں اور لفظی ومعنوی صنعتیں ہیں۔ وہ جب کسی چیز کا بیان کرتے ہیں تو اصلیت محض ایک بنیادی حیثیت سے ہی قائم رہتی ہے۔ عام طور سے ان کی مرثیہ نگاری کی تین درجات متعین کئے جاتے ہیں۔ پہلا درجہ تو وہ ہے جہاں ان کی مشکل پسندی اور معنی آفرینی پڑھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ دوسرا درجہ وہ ہے جہاں اس کو گوارا کہا جا سکتا ہے اور تیسرا درجہ وہ ہے جہاں وہ محض ذہنی بازی گری ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس طرح جہاں کہیں بھی انہیں مضمون آرائی کی گنجائش نظر آتی ہے وہ تینوں درجوں سے گزرنے کا ہنر اپناتے ہیں۔ تخیل کی جوالانی، مضمون کی بلندی، عالمانہ اسلوب سے وہ اپنے مرثیوں میں شان وشوکت پیدا کرتے ہیں۔ ان کے مرثیے رزمیہ کے زیادہ قریب ہیں۔ شان وشوکت کی مثال دیکھئے۔

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رن ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے
رُستم کا بدن زیر کفن کانپ رہا ہے
ہر قصرِ سلاطین زمن کانپ رہا ہے
شمشیر بکف دیکھ کے حیدر کے پسر کو
جبریل لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو

انیسؔ کی طرح دبیرؔ کے یہاں بھی کلام کی اصلی ترتیب قائم ہے۔ روز مرہ محاورہ کا حسن استعمال بھی ان کے یہاں ملتا ہے۔ مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے الفاظ ڈھونڈ لاتے ہیں جو انیسؔ کی فصاحت ثقالت پر محمول ہوتے ہیں۔ تشبیہات واستعارات کی جدت ولطافت بھی ان کے یہاں پائی جاتی ہے۔ واقعہ نگاری اور جذبات نگاری پر بھی قدرت حاصل ہے۔ اسلوب میں فطری پن موجود ہے جس میں روانی اور برجستگی کے

عناصر تلاش کئے جاسکتے ہیں۔تلوار کی تعریف میں دو شعر دیکھئے۔

اُٹھی گِری، بُلند ہوئی پست ہوگئی
پی پی کے میکشوں کا لہو مست ہوگئی
گزری جو چار آئینے سے منھ کو موڑ کے
غُل تھا پری نکل گئی شیشے کو توڑ کے

مرانیسؔ اور مرزا دبیرؔ نے جب مرثیے کو اپنے عروج کی انتہا پر پہنچا دیا تو ان کے بعد آنے والی نسلوں میں انیسے اور دبیرؔے کی دو گروہیں قائم ہوگئیں اور دونوں گروہوں نے اپنے اپنے محسن کے چھوڑے ہوئے نقوش پر مرثیہ گوئی میں زور آزمائی شروع کردی۔

10.2.1 : سرگرمی (آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں)

1۔ اردو مرثیے کا سنہری دور کس شہر سے وابستہ ہے؟

الف) لاہور　ب) دہلی　ج) لکھنؤ　د) حیدرآباد

2۔ میر انیس کس صنفِ ادب کے عظیم شاعر تھے؟

الف) غزل　ب) قصیدہ　ج) مرثیہ　د) مثنوی

3۔ مرزا دبیر کی شاعری کی نمایاں خصوصیت کیا تھی؟

الف) مزاح　ب) سادگی　ج) طنز　د) بلند آہنگ اسلوب

4۔ اردو مرثیے کا بنیادی موضوع کیا ہے؟

الف) عشق　ب) فطرت　ج) واقعہ کربلا　د) حب الوطنی

5۔ میر انیس اور مرزا دبیر کا تعلق کس دور سے ہے؟

الف) جدید دور　ب) سنہری دور　ج) ترقی پسند دور　د) کلاسیکی دور

10.3: عمومی جائزہ

اردو مرثیے کا سنہری دور انیسویں صدی میں لکھنؤ کے ادبی ماحول میں پروان چڑھا۔ اس دور میں مرثیہ نگاری کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی اور اسے اردو ادب کی ایک عظیم صنف کا درجہ ملا۔ نوابینِ اودھ کی سرپرستی، مذہبی مجالس اور علمی فضا نے مرثیہ کو ترقی دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ مرثیہ کا بنیادی موضوع واقعہ کربلا ہے جس میں حضرت امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کی قربانی، شجاعت اور صبر کو نہایت دردناک اور مؤثر انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ اس سنہری دور کے دو سب سے بڑے شاعر میر انیس اور مرزا دبیر تھے۔ میر انیس نے مرثیہ نگاری میں جذبات نگاری، منظر کشی، کردار نگاری اور زبان کی سادگی کو خاص اہمیت دی۔ ان کے مرثیے انسانی جذبات سے بھرپور ہوتے تھے اور قاری یا سامع پر گہرا اثر چھوڑتے تھے۔ انہوں نے کربلا کے کرداروں کو نہایت جاندار انداز میں پیش کیا۔ ان کی شاعری میں روانی، فصاحت اور حقیقت نگاری نمایاں نظر آتی ہے۔

مرزا دبیر نے بھی اردو مرثیے کو عظمت عطا کی۔ ان کا اندازِ بیان بلند، شاندار اور پرشکوہ تھا۔ انہوں نے اپنے مرثیوں میں الفاظ کی شان و شوکت، مشکل تراکیب اور وسیع منظر نگاری سے کام لیا۔ ان کی شاعری میں فنی مہارت اور زبان کی قوت نمایاں تھی۔ دبیر کے مرثیوں میں جنگی مناظر اور خطیبانہ انداز خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ میر انیس اور مرزا دبیر کے درمیان ادبی مقابلہ بھی مشہور تھا۔ دونوں کے مداح الگ الگ گروہوں میں تقسیم تھے۔ اس مقابلے نے مرثیہ نگاری کو مزید ترقی دی اور اردو ادب کو بے شمار اعلیٰ تخلیقات عطا کیں۔ اگرچہ دونوں کا انداز مختلف تھا، لیکن دونوں نے مرثیہ کو بلندیوں تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔

اردو مرثیے کے سنہری دور کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں صرف مذہبی پہلو ہی نہیں بلکہ اخلاقی، تہذیبی اور انسانی اقدار بھی شامل تھیں۔ مرثیہ نگاروں نے وفاداری، قربانی، صبر، ایثار اور حق پسندی جیسے اوصاف کو نمایاں کیا۔ اس صنف نے اردو زبان کو ادبی وسعت عطا کی اور اس کے ذخیرِ الفاظ میں اضافہ کیا۔ مرثیہ نگاری نے لکھنؤ کی تہذیب اور معاشرت کو بھی محفوظ کیا۔ اس دور کے مرثیوں میں لباس، رسم و رواج، رہن سہن اور معاشرتی زندگی کی جھلک واضح طور پر نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو مرثیے کا سنہری دور اردو ادب کی تاریخ میں ایک درخشاں باب کی حیثیت رکھتا ہے۔

10.4: آپ نے کیا سیکھا؟

طلبہ نے اس سبق کے ذریعے اردو مرثیے کے سنہری دور کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ انہوں نے میر انیس اور مرزا دبیر کی ادبی

خدمات اور ان کے اسلوب کا مطالعہ کیا۔ طلبہ نے مرثیہ کی فنی خصوصیات جیسے جذبات نگاری، منظر نگاری اور کردار نگاری کو سمجھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہ بھی جانا کہ مرثیہ صرف غم کی شاعری نہیں بلکہ انسانی اقدار، قربانی، وفاداری اور شجاعت کی بہترین عکاسی بھی کرتا ہے۔

10.5: فرہنگ

مرثیہ : غم کی نظم

عزا : سوگ

شجاعت : بہادری

ایثار : قربانی دینا

فصاحت : صاف زبان

بلاغت : مؤثر اندازِ بیان

منظر نگاری: منظر کی تصویر کشی

کردار نگاری: کرداروں کی عکاسی

جذبات نگاری: احساسات کا بیان

روانی : بہاؤ

اسلوب : اندازِ بیان

خطیبانہ : تقریری انداز

عقیدت : احترام اور محبت

تہذیب : ثقافت

معاشرت : سماجی زندگی

حقیقت نگاری: سچی تصویر کشی

پرشکوہ : عظیم اور شان دار

تخلیق : ادبی کام

وسعت : پھیلاؤ

ادبی بصیرت: ادبی سمجھ

10.6 خود جانچ سوالات:

1۔ اردو مرثیے کا سنہری دور کیوں کہلاتا ہے؟

2۔ میر انیس کی شاعری کی نمایاں خصوصیات کیا ہیں؟

3۔ مرزا دبیر کے اسلوب کی اہم خصوصیات بیان کریں۔

4۔ لکھنؤ نے مرثیہ نگاری کی ترقی میں کیا کردار ادا کیا؟

5۔ مرثیہ میں کن انسانی اقدار کو بیان کیا جاتا ہے؟

10.7: مشقی سوالات

1۔ اردو مرثیے کے سنہری دور پر تفصیلی نوٹ لکھیں۔

2۔ میر انیس کی مرثیہ نگاری کا تنقیدی جائزہ پیش کریں۔

3۔ مرزا دبیر کے فنی کمالات بیان کریں۔

4۔ میر انیس اور مرزا دبیر کے اسلوب کا تقابلی مطالعہ کریں۔

5۔ اردو مرثیے کی ادبی اور تہذیبی اہمیت بیان کریں۔

10.8: جواباتِ سرگرمی

1۔ ج) لکھنؤ

2۔ ج) مرثیہ

3۔ د) بلند آہنگ اسلوب

4۔ ج) واقعۂ کربلا

5۔ ب) سنہری دور

10.8.1: مشقی سوالات کے جوابات

1۔ اردو مرثیے کا سنہری دور انیسویں صدی میں لکھنؤ میں قائم ہوا۔ اس دور میں مرثیہ نگاری کو بے حد ترقی ملی اور میر انیس و مرزا دبیر نے اسے عروج تک پہنچایا۔

2۔ میر انیس نے مرثیہ نگاری میں جذبات نگاری، منظر کشی، سادگی اور حقیقت نگاری کو فروغ دیا۔ ان کے مرثیے دل پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔

3۔ مرزا دبیر نے بلند آہنگ اسلوب، شان دار الفاظ اور جنگی مناظر کی عمدہ تصویر کشی کے ذریعے مرثیہ کو عظمت عطا کی۔

4۔ میر انیس کی شاعری سادہ، جذباتی اور حقیقت سے قریب ہے جبکہ مرزا دبیر کی شاعری شاندار، بلند آہنگ اور لفظی شان و شوکت سے بھرپور ہے۔

5۔ اردو مرثیے نے اردو زبان کو فصاحت و بلاغت عطا کی، اخلاقی اقدار کو فروغ دیا اور لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت کو محفوظ کیا۔

10.9: امدادی کتب

1۔ اردو قصیدہ نگاری — ڈاکٹر محمد کمال الدین

2۔ اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ — ڈاکٹر محمود الٰہی

3 ۔ انتخاب قصائد اردو — مغیث الدین فریدی

4 ۔ مرثیہ اور مرثیہ نگار — ڈاکٹر شاداب ردولوی

5 ۔ اردو مرثیہ — سید علی عباس حسینی

6 ۔ میر انیس اور دبیر — شبلی نعمانی

سبق نمبر 11 شخصی مرثیہ : آغاز وارتقا

ساخت

11.0 اغراض ومقاصد

11.1 تعارف

11.2 شخصی مرثیہ : مفہوم، آغاز وارتقا

11.2.1 عربی اور فارسی میں شخصی مرثیہ

11.2.2 اردو میں شخصی مرثیہ کی روایت

11.2.3 شخصی مرثیہ کی خصوصیات

11.2.4 سرگرمی 1 آؤ اپنی معلومات جانچیں

11.3 غالب۔حالی اور شخصی مرثیہ

11.3.1 سرگرمی 2 آؤ اپنی معلومات جانچیں

11.4 عمومی جائزہ

11.5 فرہنگ

11.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

11.7 مشقی سوالات

11.8 مشقی سوالات کے جوابات / جواباتِ سرگرمی

11.8.3 مشقی سوالات کے جوابات

11.9 امدادی کتب

11.0: اغراض ومقاصد

اس سبق کا مقصد آپ کو شخصی مرثیہ کے آغاز، ارتقا اور ادبی اہمیت سے آگاہ کرنا ہے۔ اس کے ذریعے آپ یہ سمجھ سکیں گے کہ شخصی مرثیہ کس طرح اردو ادب میں ایک مستقل صنف کے طور پر ابھرا اور وقت کے ساتھ ترقی کرتا گیا۔ اس سبق میں آپ کو یہ بھی بتایا جائے گا کہ شخصی مرثیہ صرف غم واندوہ کا اظہار نہیں بلکہ مرحوم شخصیت کی خدمات، کردار اور اخلاق کو اجاگر کرنے کا مؤثر ذریعہ بھی ہے۔ اس سبق کے مطالعے سے آپ حالؔی، اقبالؔ، جوشؔ اور فیضؔ جیسے شعرا کی مرثیہ نگاری سے واقف ہوں گے۔ آپ شخصی مرثیے کی فنی خصوصیات، زبان و بیان، جذبات نگاری اور شخصیت نگاری کو سمجھ سکیں گے۔ اس سبق کا ایک مقصد آپ میں ادبی ذوق پیدا کرنا اور آپ کی تنقیدی صلاحیتوں کو فروغ دینا بھی ہے۔ مزید یہ کہ آپ اردو ادب میں شخصی مرثیے کے مقام اور اس کے تہذیبی و سماجی اثرات کا بھی مطالعہ کریں گے

11.1: تعارف

اردو ادب میں مرثیہ ایک اہم صنفِ سخن ہے جس کا بنیادی مقصد کسی مرحوم شخصیت کے غم، اوصاف اور خدمات کو منظوم انداز میں بیان کرنا ہوتا ہے۔ مرثیہ کی کئی اقسام ہیں جن میں شخصی مرثیہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ شخصی مرثیہ اس مرثیے کو کہا جاتا ہے جس میں کسی خاص فرد، رہنما، عالم، شاعر یا عزیز شخصیت کی وفات پر غم واندوہ کا اظہار کیا جائے۔ اردو ادب میں شخصی مرثیہ کی ابتدا قدیم شعری روایت سے ہوئی، مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس نے ایک مستقل ادبی حیثیت اختیار کر لی۔ ابتدائی دور میں مرثیہ زیادہ تر مذہبی نوعیت کا تھا اور واقع؟ کربلا اس کا مرکزی موضوع سمجھا جاتا تھا، لیکن بعد میں شعرا نے معاشرتی اور شخصی موضوعات کو بھی مرثیے میں شامل کرنا شروع کیا۔ اس طرح شخصی مرثیہ وجود میں آیا۔ شخصی مرثیوں میں شعرا اپنے جذبات، محبت، عقیدت اور غم کا اظہار نہایت مؤثر انداز میں کرتے ہیں۔ اس صنف میں مرحوم کی شخصیت، کردار، اخلاق، خدمات اور کارناموں کو خراجِ عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔ اردو ادب میں حالی، علامہ اقبال، جوش ملیح آبادی اور فیض احمد فیض جیسے شعرا نے شخصی مرثیے کو نئی وسعت عطا کی۔ حالی کا ''مرثیہ غالب'' اردو کے مشہور شخصی مرثیوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس مرثیے میں حالی نے مرزا غالب کی ادبی عظمت اور شخصیت کو نہایت مؤثر انداز میں بیان کیا۔ اسی طرح دیگر شعرا نے قومی رہنماؤں، ادیبوں اور سماجی شخصیات پر مرثیے لکھ کر اس صنف کو ترقی دی۔ شخصی مرثیہ صرف غم کا اظہار نہیں بلکہ یہ تاریخ، تہذیب اور شخصیت نگاری کا اہم ذریعہ بھی ہے۔ اس صنف نے اردو ادب میں جذباتی گہرائی اور فکری وسعت پیدا کی اور آج بھی یہ صنف ادبی دنیا میں اپنی اہمیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔

11.2 شخصی مرثیہ : مفہوم، آغاز وارتقا

شخصی مرثیہ ایسی شاعری ہے جس میں کسی معروف یا محبوب شخصیت کی وفات پر اس کے اوصاف، کردار، خدمات اور یادوں کو منظوم شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں غم واندوہ کے ساتھ عقیدت، محبت اور احترام کے جذبات بھی شامل ہوتے ہیں۔ شخصی مرثیہ کا آغاز انسانی فطرت سے وابستہ ہے۔ انسان ہمیشہ اپنے محبوب افراد کی جدائی پر افسوس اور رنج کا اظہار کرتا آیا ہے۔ یہی جذبات جب ادبی اظہار کی صورت اختیار کرتے ہیں تو شخصی مرثیہ وجود میں آتا ہے۔ اردو ادب میں اس روایت نے مختلف ادوار میں ترقی کی اور ہر دور کے شعرا نے اپنے عہد کی ممتاز شخصیات کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ شخصی مرثیہ اور کربلائی مرثیہ دونوں کے لیے اردو میں صرف مرثیہ کا لفظ ہی رائج ہے۔ مرثیہ عربی لفظ ''رثا'' سے ماخوذ ہے جس کے لغوی معنی کسی کی موت پر رونا یا آہ وزاری کے ہیں۔ شاعری کی اصطلاح میں مرثیہ اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی عزیز، دوست، سیاسی رہبر، قومی رہنما، دینی بزرگ، مذہبی پیشوا، برگزیدہ ہستی، صاحب کمال شاعر، بلند پایہ ادیب اور عظیم شخصیت کی موت پر بین کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے اوصاف بیان کیے جائیں۔ اہل نقد ونظر نے مرثیہ کی تعریف اپنے اپنے انداز میں کی ہے۔ بقول حالؔی

> ''مردوں کی تعریف کو جس میں تاسف اور افسوس بھی شامل ہوتا ہے مرثیہ کہتے ہیں ـــــ یعنی میت کو یاد کرکے حزن وغم کا اظہار کرنا اور اپنے بیان سے دوسروں کو محزون ومغموم کرنا۔''
>
> (''مقدمہ شعروشاعری''، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۷ء، ص ۲۲۸۔۲۲۹)

شبلؔی نعمانی رقمطراز ہیں:

> ''عرب میں جو فارسی اور اردو شاعری کا سرچشمہ ہے شاعری کی ابتدا مرثیہ سے ہوئی اور یہی ہونا چاہئے تھا۔ عرب میں شاعری کی ابتدا بالکل فطرت کے اصول پر ہوئی تھی یعنی جو جذبات دلوں میں پیدا ہوتے تھے وہی اشعار میں ادا کردیئے جاتے تھے۔ جذبات میں درد وغم کا جذبہ اور جذبات سے قوی تر تھا اور جس جوش سے یہ ظاہر ہوتا تھا اور جذبات ظاہر نہیں ہوسکتے ـــــ مرثیے عین اس حالت میں کہے جاتے تھے جبکہ شاعر کا دل درد وغم سے لبریز ہوتا تھا۔''
>
> (''موازنہ انیسؔ ودبیرؔ''، ادارہ خضر راہ نئی دہلی، ۱۹۹۶ء ص ۲۳)

اظہرعلی فاروقی کے مطابق:

''مرثیہ ''رثا'' (رثٰی) سے مشتق ہے جس کے معنی مردے پر رونے کے ہیں۔ واقعہ کربلا سے بیشتر عرب میں مرثیہ لکھنے والے اپنے کسی عزیز یا برگزیدہ شخصیت کے مرنے پر جو اشعار کہتے تھے مرثیہ کہلاتے تھے۔''

(''اردو مرثیہ'' سلیمی برقی پریس الہ آباد، ۱۹۵۸ء، ص ۷)

پروفیسر شارب ردولوی اپنی کتاب ''مرثیہ اور مرثیہ نگار'' جو ۲۰۰۶ء میں یونیورسل آفسیٹ پریس نئی سے شائع ہوئی میں صفحہ نمبر ۱۳۴ پر لکھتے ہیں:

''شخصی مرثیہ کسی عہد کی اہم شخصیات، تاریخ ساز ہستیوں یا کسی عزیز کے انتقال پر لکھے گئے۔''

سید عاشور کاظمی ''اردو مرثیے کا سفر اور بیسویں صدی کے اردو مرثیہ نگار'' میں جو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے ۲۰۰۶ء میں منظر عام پر لائی صفحہ نمبر ۴۳ پر رقمطراز ہیں:

''مرثیہ کسی دوست، عزیز، قومی ہیرو، مذہبی رہنما کی موت پر غم واندوہ کے اظہار کی حزنیہ شاعری کا نام ہے۔ یہ رثائی شاعری مختلف (Forms) ہیئتوں میں مختلف ممالک اور زبانوں میں ہوتی رہی ہے۔''

مندرجہ بالا نظریات کی روشنی میں یہ کہنا بجا ہے کہ شخصی مرثیہ کسی شخصیت کا وہ تعزیتی خاکہ ہوتا ہے جس میں اس کی خوبیوں اور زندگی اہم واقعات کو اُجاگر کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ شخصی مرثیہ میں جس شخص کو موضوع بنایا جاتا ہے اس کی نفسیاتی کیفیتوں، ذہنی الجھنوں، خصائل، طرز عمل وغیرہ کا تذکرہ کرنے کے علاوہ اس کی موت پر اظہار غم کیا جاتا ہے۔ مرثیہ گو مرنے والے کی صفات عصری حالات کے عین مطابق اس فنکاری سے کرتا ہے کہ قاری وسامع کو اس شخص کی شخصیت کے تمام پہلوؤں سے شناسائی ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں شاعر اس فرد کی جدائی کا کرب بیان بھی کرتا ہے اور اس سے متعلق اپنے جذبات وتاثرات کا اظہار بھی کرتا ہے۔ محبت، انس، شجاعت، سخاوت، حسن سلوک، رحم وغیرہ انسانی فطرت کے وہ جذبات واوصاف ہیں جو شخصی مرثیہ کو مؤثر بنانے میں کارگر ثابت ہوتے ہیں۔ یہ محرکات قارئین وسامعین کے دلوں کو نہ صرف چھوتے ہیں بلکہ انہیں مرحوم کے ساتھ جذباتی طور پر جوڑتے بھی ہیں۔ دراصل دنیا کے ہر ادب وہر زبان اور ہر ملک وہر جگہ شخصی مرثیہ کا موضوع یکساں ہوتا ہے۔ اپنے ایجاز واختصار کی وجہ سے یہ اگرچہ نظم کی ہیئت میں لکھا جاتا ہے لیکن عام طور پر اس کے تدریجی ارتقا کے ساتھ ساتھ اس کی ہیئت بھی بدلتی رہتی ہے۔ اسی طرح اس کے اجزائے ترکیبی کے بارے میں بھی زیادہ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ شخصی مرثیہ کو کربلائی مرثیہ کا حصہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

بقول پروفیسر انیس اشفاق عابدی:

''یوں تو شخصی مرثیے بہت پہلے سے لکھے جا رہے ہیں لیکن ان میں اصل حزینہ آہنگ اس وقت پیدا ہوا جب کربلا سے متعلق رثائی شاعری کو عروج حاصل ہوا۔ شخصی مرثیوں میں یہ آہنگ کربلائی مرثیوں کے حزینہ لہجے نے پیدا کیا تھا۔ اسی حزینہ لہجے نے اس جذبے کی لو میں لپک پیدا کی جو اپنی مقرب و محبوب شخصیت پر کسی شاعر کے دل میں پیدا ہوتا ہے............ الگ الگ شاعروں نے الگ الگ ہیئتوں میں شخصی مرثیے کہے ہیں اور اپنے اپنے طور پر ان کے اجزاء کی ترکیب و ترتیب کا تعین کیا ہے لیکن المیاتی فضا کے اعتبار سے یہ کربلائی مرثیوں ہی کا ایک جز معلوم ہوتے ہیں۔''

(''حرفِ چند'' مشمولہ ''اردو میں شخصی مرثیے کی روایت'' از ڈاکٹر عابد حسین حیدری، اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۲۰۰۸ء، ص ۱۰، ۱۱)

شخصی مرثیہ کے اجزائے ترکیبی پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر عابد حسین حیدری اپنی کتاب ''اردو میں شخصی مرثیے کی روایت'' میں (ص ۳۳، ۳۴) یوں رقمطراز ہیں:

''بشیر النساء بیگم تبسم نے کربلائی مرثیے اور شخصی مرثیے کے بنیادی فرق کی وضاحت کرتے ہوئے اس کے اجزائے ترکیبی کا بھی تعین کچھ اس طرح کیا ہے:

☆ شخصی مرثیے میں چہرہ یا تمہید کا بیان کیا جانا چاہئے۔

☆ شخصی مرثیے میں متوفی کی سیرت و کردار کا بیان کیا جانا چاہئے۔

☆ کردار کے بیان میں متوفی کی عظمت کا بہ حیثیت انسان و بحیثیت فنکار ہونا چاہئے۔

☆ کردار ہی کے ضمن میں معاصرانہ تہذیب کا بیان کیا جانا چاہئے۔

☆ متوفی کی وفات کا بیان۔

☆ شاعر اپنی محرومیوں کا بیان کرتے ہوئے بین کا مضمون بیان کرتا ہے۔

☆ مرثیے کے آخر میں دعا کا مضمون بیان کیا جا سکتا ہے۔

مندرجہ بالا نتائج کو مختصراً اگر تحریر کریں تو شخصی مرثیے کے اجزائے ترکیبی کی ہیئت اس طرح بنے گی۔

(۱) چہرہ (۲) سیرت و کردار کا بیان (۳) وفات کا ذکر (۴) دعا''

شخصی مرثیہ کو تعزیتی نظم سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس میں چوں کہ مرحوم کے تئیں شاعر کی محبت و عقیدت کا براہ راست اظہار ہوتا ہے۔ اس لئے قاری و سامع کو پڑھتے و سنتے وقت قدم قدم پر ایک نئے پن کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ حقیقت میں دیکھا جائے تو صنف مرثیہ کی بنیاد ہی شخصی مرثیہ پر کھڑی ہے۔ شخصی مرثیہ میں کردار نگاری کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یہ انفرادی بھی ہوتا ہے اور اجتماعی بھی۔ انفرادی شخصی مرثیہ میں شاعر چوں کہ نجی طور پر مرحوم کی شخصیت سے وابستہ ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے دکھ و غم کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے برعکس اجتماعی شخصی مرثیہ کسی سیاسی رہبر، قومی رہنما، دینی بزرگ یا مذہبی پیشوا کی موت پر لکھا جاتا ہے۔ اس میں کسی خاندان، قوم، گروہ یا بڑے سانحہ میں متاثر ہونے والے افراد کے رنج و غم کو بیان کیا جاتا ہے۔

11.2.1 عربی اور فارسی میں شخصی مرثیہ

شخصی مرثیہ کی ابتدائی جھلک عربی ادب میں ملتی ہے۔ عرب شعرا اپنے قبیلوں کے سرداروں، بہادر جنگجوؤں اور معزز شخصیات کی وفات پر مراثی کہتے تھے۔ ان مراثی میں مرحوم کی شجاعت، سخاوت، کردار اور خدمات کا ذکر کیا جاتا تھا۔ عربی مرثیہ نگاری میں خنساء کا نام خصوصیت سے لیا جاتا ہے جنھوں نے اپنے بھائی صخر کی وفات پر مؤثر مراثی تخلیق کیے۔ فارسی ادب نے عربی روایت سے اثر قبول کیا اور اسے مزید وسعت دی۔ فارسی شعرا نے شخصی مرثیے میں جذباتی گہرائی، فکری پختگی اور فنی حسن پیدا کیا۔ فارسی ادب میں مختلف حکمرانوں، اہلِ علم اور ممتاز شخصیات پر مراثی لکھے گئے جنھوں نے بعد کی زبانوں کی مرثیہ نگاری پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ شخصی مرثیہ کا آغاز عرب کی سرزمین میں ہوا۔ ابتدائی دور میں عرب میں رثائی شاعری کو جو قسم رائج تھی اسے نوحہ کہا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں قدیم عربی تواریخی کتب میں ایک روایت درج ہے کہ ایک دفعہ حضرت آدم علیہ السلام گھر سے باہر کسی کام سے گئے ہوئے تھے۔ اسی دوران ان کے بڑے صاحب زادے قابیل نے اپنے چھوٹے ہابیل کو قتل کر کے دفنا دیا۔ واپس گھر لوٹنے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کو جب اس سانحہ کا علم ہوا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور شدت غم سے زبان مقدس سے جو کلام نکلا اسے نوحہ کا نام دیا گیا۔ اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام (اصلی نام یشکر) کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی قوم کے لئے آہ و زاری کرتے تھے۔ اسی رونے اور ماتم کی بنا پر ان کا نام نوح پڑ گیا۔ نوحہ کی روایت عرب سے جب ایران پہنچی تو سانحہ کربلا سے اسے

مرثیہ کا نام دیا گیا۔اس طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عابد حسین حیدری اپنی معروف کتاب ''رثائیات تجزیات شخصیات'' میں لکھتے ہیں:

''جتنی قدیم نسل انسانی کی تاریخ ہے اتنی ہی قدیم تاریخ مرثیہ بھی ہے اور یہ بات مسلم حیثیت رکھتی ہے کہ صنف مرثیہ کا آغاز ہی شخصی مرثیہ سے ہوا ہے۔اس لئے کہ حضرت آدمؑ نے اپنے عزیز فرزند جناب ہابیل کے فراق میں جو کلمات رنج وغم، اپنی زبان سے ادا کئے تھے اسے عربی زبان میں مرثیہ ہی تعبیر کرنا چاہئے۔حضرت آدم علیہ کے تاثرات ہوں یا حضرت طالوت کی وفات پر حضرت داؤد کا مرثیہ یا کرونچ پنک چھی (Øks {kia{kh) کے شکار ہونے پر بالمیکی کا اظہار رنج وغم، اپنی نوعیت و ماہیت کے اعتبار سے انہیں شخصی مرثیہ ہی کہا جا سکتا ہے۔شخصی مرثیہ کی قدامت کا ایک بہت بڑا ثبوت توریت میں مختلف انبیاء کے نوحوں کی موجودگی بھی ہے۔اس کے علاوہ ابن ہشام نے خاندان رسالت کی بعض شخصیات کے مرثیے نقل کیے ہیں۔بعد وفات رسولؐ خدا آپ کی پھوپھی حضرت صفیہ، حضرت ابوبکر، حضرت حسان بن ثابت اور امیر المؤمنین حضرت علیؑ کے مرثیے طبری میں موجود ہیں۔''

(ایم۔آر۔پبلی کیشنز نئی دہلی، ۲۰۱۱ء، ص ۳۱)

عربی تاریخی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اس بات کا بخوبی علم ہو جاتا ہے کہ ظہور اسلام سے قبل بھی عرب میں شخصی مرثیہ کی روایت موجود تھی۔اس دور کے اہم شخصی مرثیہ گو امرؤالقیس، عنترؔہ بن شداد، خنساؔء، لبیدؔ ابن ربیعہ وغیرہ تھے۔خنساؔء جو عرب کی ایک شہرت یافتہ خاتون شاعرہ تھی کے دو مرثیے: ایک جو انھوں نے اپنے بھائی کی وفات پر اور دوسرا حضرت عمر فاروقؔ کے بھائی کے انتقال پر لکھا بہت مشہور ہوئے۔اسی طرح متمم بن نویرہ کے مرثیے بھی اہمیت کے حامل ہیں۔اس کے بعد مختلف ادوار میں عرب میں جن شعرا نے شخصی مرثیہ کی روایت کو آگے بڑھایا ان میں دعبلؔ، فرزدقؔ، امام شافعیؔ، علیؔ ابن منصور بغدادی، متنبیؔ، ابوفراسؔ حمدانی، ابن رومیؔ، امام بوصیریؔ، رقاشیؔ وغیرہ کے نام خاص طور سے سرفہرست ہیں۔

شخصی مرثیہ کی روایت عربی سے جب فارسی میں داخل ہوئی تو مختلف ادوار میں جن شعرا نے رثائی شاعری کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ان میں سلمانؔ ساوجی، خواجہ حافظؔ شیرازی، رودکیؔ، فردوسیؔ، شیخ سعدیؔ، خاقانیؔ، نظامیؔ، فرخیؔ، حکیم سنائیؔ، ابن حسامؔ، خواجہ عطار نیشاپوری، حاجی محمد جان قدسیؔ، امیر خسروؔ، محتشمؔ کاشی، مقبلؔ وغیرہ کے نام لے جا سکتے ہیں۔سہراب کی ماں کی طرف سے لکھا گیا فردوسیؔ کا مرثیہ اور محمود غزنوی کی وفات پر فرخیؔ کا مرثیہ فارسی میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔غرض یہ کہ عربی اور فارسی میں شخصی مرثیہ کا سرمایہ اگرچہ زیادہ نہیں ہے لیکن

تاریخ کا حصہ ضرور ہے۔ بقول سید علی جواد زیدی:

''دنیا کے سبھی ملکوں اور سبھی زبانوں میں رثائی ادب کی روایت رہی ہے۔ اس کا بیشتر حصہ لوک ادب پر مشتمل تھا اور ضائع ہو گیا، پھر بھی جو کچھ بچ رہا ہے اس سے تاریخی تسلسل کا پتہ چلتا اور ارتقائی عوامل کا سراغ ملتا ہے۔''

(''دہلوی مرثیہ گو (جلد اول)''، سرفراز قومی پریس لکھنؤ، ۱۹۸۶ء، ص ۹)

11.2.2 اردو میں شخصی مرثیہ کی روایت

عربی اور فارسی ادب کی یہی روایت بعد میں اردو ادب میں منتقل ہوئی اور اردو شعرا نے اسے اپنے تہذیبی اور ادبی ماحول کے مطابق فروغ دیا۔ اردو ادب میں شخصی مرثیہ کی روایت ایک طویل اور قابلِ قدر ادبی روایت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگرچہ اردو مرثیہ نگاری کا سب سے نمایاں موضوع واقعۂ کربلا اور اس سے وابستہ شخصیات رہی ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اہلِ علم، شعرا، ادبا، قومی رہنماؤں اور دیگر ممتاز شخصیات کی وفات پر مراثی لکھنے کی روایت بھی پروان چڑھتی رہی ہے۔ یہی روایت آگے چل کر شخصی مرثیہ کی صورت میں نمایاں ہوئی۔ اردو شاعری کے ابتدائی دور میں شخصی مرثیے کی مثالیں نسبتاً کم ملتی ہیں۔ اس زمانے میں شعرا زیادہ تر مذہبی موضوعات اور درباری شاعری کی طرف متوجہ تھے۔ تاہم جیسے جیسے اردو ادب میں فکری وسعت پیدا ہوئی، شعرا نے اپنے اساتذہ، دوستوں، سرپرستوں اور علمی و ادبی شخصیات کی یاد میں مراثی کہنا شروع کیے۔ ان مراثی میں محض غم و اندوہ کا اظہار نہیں ہوتا تھا بلکہ مرحوم کی علمی خدمات، اخلاقی اوصاف اور معاشرتی کردار کا بھی ذکر کیا جاتا تھا۔

اردو میں شخصی مرثیہ جیسے حالؔی نے ایک الگ صنف سخن کی حیثیت عطا کی کا آغاز دکن کی سرزمین میں ہوا۔ ابتدا میں دکن میں جو تاریخ وفات پر قطعات لکھنے کی روایت موجود تھی دراصل وہی شخصی مرثیہ کے ابتدائی نقوش قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ برہان الدین جانمؔ دکن کا پہلا مرثیہ گو تھا جس نے اپنے والد میراں جی پر مرثیہ لکھا۔ یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا بھی لازمی ہے کہ عربی و فارسی شخصی مرثیہ اور اردو شخصی مرثیہ میں مشابہت بھی پائی جاتی ہے اور اختلاف بھی۔ علی جواد زیدی اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

''اردو مرثیہ نگاروں کی رسائی عام طور پر عربی اور فارسی اور بعض صورتوں میں ترکی مرثیوں تک تھی۔ ہندوستانی ادب میں مرثیے جیسی کوئی صنف نظر نہیں آتی لیکن بھرت کے زمانے سے کرونا (درد) رس کو ایک مستقل جذبے کے تحت تسلیم کیا گیا اور 'ولاپ' اور بین کی روایتیں عام طور سے ملتی اور رامائن تک موجود ہیں۔ ہندوستان میں لکھے جانے

والے مرثیوں میں بھی ان روایات کا شامل ہوجانا فطری تھا۔ غالباً یہی سبب ہے کہ اگرچہ اردو مرثیہ عربی فارسی اور کسی قدر رثر کی مراثی کی تاسی اور تتبع میں شروع ہوا لیکن اس صنف میں ہندوستانی شاعروں نے ایسی ایسی جدتیں کیں کہ یہ صنف عربی اور فارسی مرثیے سے ممتاز بلکہ کافی حد تک مختلف بھی ہوگئی۔''

(''دہلوی مرثیہ گو (جلد اول)'' سرفراز قومی پریس لکھنؤ، ۱۹۸۶ء، ص ۱۰)

شمالی ہند میں اگرچہ پہلے سے بھی تاریخ وصال پر قطعات کہے جاتے رہے لیکن جعفر زٹلی پہلے شاعر ہیں جنہوں نے ''مرثیہ اورنگ زیب عالمگیر'' لکھ کر شخصی مرثیہ کو ایک نیا رخ دیا۔ ولی دکنی کی آمد کے بعد شمالی ہند میں کربلائی مرثیہ کے ساتھ ساتھ کسی نہ کسی صورت میں شخصی مرثیہ کی روایت بھی آگے بڑھتی رہی۔ سوداؔ کے دور سے لے کر میر خلیقؔ، میر ضمیرؔ، دلگیرؔ اور فصیحؔ کے عہد تک شخصی مرثیہ کو تقویت ملتی رہی، اس دور کے بعد اردو مرثیہ کے آفتاب ماہتاب کہے جانے والے شعرا انیسؔ اور دبیرؔ نے کربلائی مرثیہ کے ساتھ ساتھ شخصی مرثیہ میں بھی اپنی انفرادیت کا ثبوت فراہم کیا۔ انیسؔ اور دبیرؔ کے بعد جن مرثیہ گو نے شخصی مرثیہ کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ان میں مرزا غالبؔ، حالیؔ، شبلیؔ، چکبستؔ، سرور جہاںؔ آبادی، تلوک چند محرومؔ، اقبالؔ، فیض احمد فیضؔ، جاں نثار اخترؔ، جگن ناتھ آزادؔ وغیرہ کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں:

غالبؔ نے ''مرثیہ عارف'' لکھ کر اردو شخصی مرثیہ کی ایک نئی داغ بیل ڈالی، انیسویں صدی میں اردو ادب میں اصلاحی اور فکری تحریکوں کے فروغ کے ساتھ شخصی مرثیہ نگاری کو نئی جہتیں حاصل ہوئیں۔ اس دور کے شعرا نے مرثیے کو صرف جذباتی اظہار تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے فکری اور تہذیبی شعور کا وسیلہ بھی بنایا۔ الطاف حسین حالی نے اپنے اساتذہ اور معاصرین کی وفات پر ایسے مراثی تحریر کیے جن میں عقیدت، خلوص اور حقیقت نگاری کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ مرزا غالب کے ہاں بھی اپنے عزیزوں اور احباب کی وفات پر گہرے رنج والم کے تاثرات ملتے ہیں جو شخصی مرثیے کی روایت کو تقویت دیتے ہیں۔

جدید اردو شاعری میں شخصی مرثیہ محض کسی فرد کی وفات پر اظہارِ افسوس کا ذریعہ نہیں رہا بلکہ اس کے ذریعے ایک شخصیت کے علمی، ادبی، قومی اور انسانی کارناموں کا جائزہ بھی پیش کیا جانے لگا۔ اس طرح شخصی مرثیہ تاریخ، سوانح اور ادب کے باہمی امتزاج کی ایک مؤثر صورت بن گیا۔ جدید دور کے مراثی میں جذبات کے ساتھ ساتھ تنقیدی شعور، تاریخی آگہی اور تہذیبی احساس بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ اردو میں شخصی مرثیہ کی روایت مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے ترقی کرتی رہی ہے۔ اس روایت کے فروغ میں متعدد شعرا نے حصہ لیا اور اپنے عہد کی ممتاز شخصیات کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ان مراثی میں محبت، عقیدت، غم، شخصیت نگاری اور تاریخی شعور کے عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔ اردو کے مختلف شعرا نے

شخصی مرثیہ کو اپنے اپنے انداز میں برتا اور اس روایت کو استحکام بخشا۔

اردو میں شخصی مرثیہ کی روایت آج بھی زندہ ہے۔ ہر دور کے شعرا اپنے عہد کی اہم شخصیات کو یاد کرتے ہوئے ایسے مراثی تخلیق کرتے ہیں جو نہ صرف مرحومین کے لیے خراجِ عقیدت ہوتے ہیں بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے ان کی خدمات اور کردار کو محفوظ رکھنے کا ذریعہ بھی بنتے ہیں۔ اسی وجہ سے شخصی مرثیہ اردو ادب کی ایک متحرک اور مسلسل ارتقا پذیر روایت کے طور پر اپنی اہمیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔

11.2.3 شخصی مرثیہ کی خصوصیات

شخصی مرثیہ اپنی موضوعاتی وسعت، جذباتی گہرائی اور شخصیت نگاری کی وجہ سے اردو ادب میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ اس میں شاعر کسی مرحوم شخصیت کی یاد میں اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کرتا ہے اور ساتھ ہی اس شخصیت کی زندگی، کردار اور خدمات کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ شخصی مرثیہ کی چند اہم خصوصیات درج ذیل ہیں:

غم و اندوہ کا اظہار: شخصی مرثیہ کی بنیادی خصوصیت غم اور رنج کا اظہار ہے۔ کسی محبوب، محترم یا عظیم شخصیت کی وفات شاعر کو متاثر کرتی ہے اور وہ اپنے جذبات کو شعری پیرائے میں پیش کرتا ہے۔ یہ غم محض ذاتی نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات اجتماعی نوعیت اختیار کر لیتا ہے۔

شخصیت نگاری: شخصی مرثیہ میں مرحوم شخصیت کے اوصاف، عادات، کردار اور خدمات کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ شاعر کوشش کرتا ہے کہ قاری کے سامنے مرحوم کی ایک مکمل تصویر پیش کی جائے تاکہ اس کی شخصیت کے مختلف پہلو واضح ہو سکیں۔

عقیدت اور خراجِ تحسین: شخصی مرثیہ میں مرحوم شخصیت کے لیے عقیدت، احترام اور محبت کے جذبات نمایاں ہوتے ہیں۔ شاعر اس کی خوبیوں اور کارناموں کو بیان کرتے ہوئے اسے خراجِ تحسین پیش کرتا ہے۔

سوانحی عناصر: شخصی مرثیے میں اکثر مرحوم شخصیت کی زندگی کے اہم واقعات، علمی و ادبی خدمات اور معاشرتی کردار کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔ اس طرح مرثیہ سوانحی معلومات کا ایک اہم ذریعہ بن جاتا ہے۔

جذبات اور حقیقت کا امتزاج: شخصی مرثیہ صرف جذباتی اظہار نہیں بلکہ اس میں حقیقت نگاری بھی پائی جاتی ہے۔ شاعر جذبات کے ساتھ ساتھ مرحوم شخصیت کے حقیقی اوصاف اور خدمات کو بھی بیان کرتا ہے۔

اخلاقی اور فکری پہلو: بہت سے شخصی مراثی میں مرحوم شخصیت کی زندگی سے حاصل ہونے والے اخلاقی اسباق اور فکری نکات بھی پیش

کیے جاتے ہیں۔اس طرح مرثیہ محض یادِ رفتگاں تک محدود نہیں رہتا بلکہ اصلاح و رہنمائی کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔

سادہ اور مؤثر زبان: شخصی مرثیے کی زبان عموماً سادہ، مؤثر اور پُر تاثیر ہوتی ہے۔شاعر ایسے الفاظ اور تراکیب استعمال کرتا ہے جو قاری کے دل پر براہِ راست اثر ڈال سکیں اور مرحوم کے ساتھ وابستہ جذبات کو نمایاں کر سکیں۔

تہذیبی اور سماجی شعور: شخصی مرثیہ اپنے عہد کے سماجی، تہذیبی اور فکری حالات کی بھی عکاسی کرتا ہے۔اس میں نہ صرف فرد بلکہ اس کے عہد اور ماحول کا عکس بھی دکھائی دیتا ہے۔ان خصوصیات کے باعث شخصی مرثیہ محض اظہارِ غم کا وسیلہ نہیں رہتا بلکہ ایک شخصیت، اس کے عہد اور اس کی خدمات کو محفوظ رکھنے کا مؤثر ذریعہ بن جاتا ہے۔

11.2.4 سرگرمی 1 آؤ اپنی معلومات جانچیں

خالی جگہیں پُر کیجیے

1۔ شخصی مرثیہ میں کسی شخصیت کی _____ پر اظہارِ غم کیا جاتا ہے۔

2۔ عربی ادب کی مشہور مرثیہ گو شاعرہ _____ تھیں۔

3۔ اردو شخصی مرثیہ کی روایت عربی اور _____ ادب سے متاثر ہے۔

4۔ شخصی مرثیہ میں مرحوم شخصیت کے اوصاف، خدمات اور _____ کو بیان کیا جاتا ہے۔

5۔ شخصی مرثیہ کی ایک اہم خصوصیت _____ نگاری ہے۔

6۔ شخصی مرثیہ میں محبت، عقیدت اور _____ کے جذبات پائے جاتے ہیں۔

7۔ فارسی ادب نے مرثیہ نگاری کو مزید _____ حسن عطا کیا۔

8۔ جدید دور میں شخصی مرثیہ مرحوم شخصیت کے _____ کا بھی جائزہ پیش کرتا ہے۔

11.3 غالب، حالی اور شخصی مرثیہ

الطاف حسین حالی اردو کے ان شعرا میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے شخصی مرثیہ نگاری کو ایک نئی سمت عطا کی۔حالی کے مراثی میں مبالغہ

آرائی کے بجائے حقیقت نگاری، خلوص اور جذبات کی صداقت ملتی ہے۔انہوں نے مختلف علمی اور ادبی شخصیات پر مراثی لکھے جن میں مرحومین کی خدمات اور کردار کو نمایاں کیا گیا ہے۔حالی کے نزدیک مرثیہ محض گریہ وزاری کا نام نہیں بلکہ مرحوم شخصیت کی زندگی اور کارناموں کا مؤثر تعارف بھی ہے۔اسی لیے ان کے مراثی میں شخصیت نگاری کا عنصر بہت مضبوط دکھائی دیتا ہے۔مرزا غالب کے ہاں بھی شخصی مرثیہ کے قابلِ ذکر نمونے ملتے ہیں۔غالب نے اپنے عزیزوں، دوستوں اور معاصرین کی وفات پر نہایت دردمندی کے ساتھ اظہارِ غم کیا ہے۔ان کے کلام میں انسانی دکھ، جدائی کا احساس اور زندگی کی ناپائیداری کے تصورات نمایاں ہیں۔غالب کے مراثی میں جذبات کی گہرائی اور فکری وسعت ایک ساتھ ملتی ہے۔ یہی خصوصیات انہیں اردو شخصی مرثیہ نگاری کی روایت میں ایک ممتاز مقام عطا کرتی ہیں۔

غالبؔ نے ''مرثیہ عارف'' لکھ کر اردو شخصی مرثیہ کی ایک نئی داغ بیل ڈالی، عارف جن کا پورا نام زین العابدین خان تھا مرزا کی بیوی کے بھانجے تھے۔غالبؔ کی چوں کہ کوئی اولاد زندہ نہیں رہی تھی اس لئے انہوں نے عارف کو گود لیا ہوا تھا، لیکن جوانی کے ایام میں ۱۸۵۳ء میں جب عارف کی موت ہوگئی تو غالبؔ کو کافی صدمہ پہنچا۔ چنانچہ انھوں نے ایک مرثیہ کہہ دیا۔بقول حالؔی:

> ''زین العابدین خان عارف سے مرزا کو غایت درجے کا تعلق تھا۔کچھ تو قرابت کے سبب اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ وہ نہایت خوش فکر اور معنی یاب طبیعت رکھتے تھے اور باوجود پرُ گوئی کے نہایت خوش گو تھے۔ان کو حد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔اسی لئے جب وہ جوان عمر میں فوت ہوگئے تو مرزا اور ان کی بی بی پر سخت حادثہ گزرا۔مرزا نے ان کے مرنے پر ایک غزل نما بطور نوحے کے لکھی ہے جو نہایت بلیغ اور دردناک ہے۔''
>
> (''یادگار غالبؔ''ادارہ بزم خضر راہ نئی دہلی، ۱۹۹۶ء،ص ۴۶)

حالؔی نے مرثیہ گوئی کا آغاز فارسی سے کیا۔فارسی میں سرسید کی موت پر جو مرثیہ انہوں نے لکھا شاہکار کی حیثیت رکھتا تھا۔انھوں نے اردو میں جو شخصی مرثیے لکھے ان میں ''مرثیہ غالبؔ'' ''مرثیہ حکیم محمود خان''اور''مرثیہ خواجہ امداد حسین'' خاص طور سے اہمیت کے حامل ہیں۔مثنوی کی بحر میں لکھے گئے ''مرثیہ غالب'' کے مطالعے سے اس بات کا بخوبی علم ہوجاتا ہے کہ حالؔی کو ان سے کتنی محبت وعقیدت تھی۔حکیم محمود خان کی وفات پر جو مرثیہ حالؔی نے لکھا ہے وہ مسدس کی شکل میں ہے۔بنیادی طور پر اگر دیکھا جائے تو یہ مرثیہ دلی کی عظمت اور علم وہنر کو اجاگر کرتا ہے۔ قطعہ کی ہیئت میں لکھا گیا حالؔی کا تیسرا شخصی مرثیہ خواجہ امداد حسین پر ہے۔خواجہ امداد حسین ان کے بڑے بھائی تھے۔حالؔی نے اس مرثیہ میں اپنے جگری درد کو بڑی سلاست سے بیان کیا ہے۔

شخصی مرثیہ کے ارتقا میں مولانا شبلی کا مرثیہ مولوی محمد اسحاق ایک اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مولوی محمد اسحاق ان کے بھائی تھے۔ ان کا شمار الٰہ آباد کے چوٹی کے وکلاء میں ہوتا تھا۔ ۱۹۱۴ء میں جب ان کی اچانک موت ہوگئی تو شبلی نے ایک مرثیہ کہہ ڈالا۔ یہ مرثیہ پورا غم میں ڈوبا ہوا ہے۔ بقول سید سلیمان ندوی:

> ''مولانا کے لئے یہ حادثہ بڑا روح فرسا ہوا۔ ان کے سکون واطمینان کی دنیا ہی الٹ گئی۔ اب ہر طرف سے منھ موڑ کرانھوں نے اس ویرانہ کو آباد کرنے کا عزم کیا جس کو عمر بھر آبادی کے قابل نہیں سمجھا، یعنی اعظم گڑھ کو مراجعت فرمائی اور شبلی منزل میں بیٹھ کر بقیہ عمر اپنے مرحوم بھائی کے ادھورے کاموں کی تکمیل میں صرف کرنے کا عزم کرلیا۔ یہیں بیٹھ کر ان کی وفات پر پھوٹ پھوٹ کر وہ روئے یعنی ایسا پر درد مرثیہ لکھا جس کا لفظ لفظ ان کے خون شدہ دل کی ایک ایک بوند ہے۔''
>
> (''حیات شبلی''، دارالمصنّفین اکیڈمی اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص ۶۱۹)

علاوہ ازیں چکبستؔ کا ''مرثیہ گوکھلے''، سرورؔ جہاں آبادی کا ''سوامی رام ناتھ تیرتھ''، تلوک چند محرومؔ کا ''اشک حسرت''، علامہ اقبالؔ کا ''والدہ مرحومہ کی یاد میں''، فیض احمد فیضؔ کا ''مرثیۂ اقبالؔ''، جاں نثار اخترؔ کا ''مرثیۂ صفیہ''، جگن ناتھ آزادؔ کا ''شکنتلا'' وغیرہ وہ شخصی مرثیے ہیں جو خاص طور سے اہمیت کے حامل ہیں۔ مذکورہ بالا شعرا کے علاوہ میر نفیسؔ، واجد علی شاہ اخترؔ، سید مجاور حسین تمناؔ، اکبرالٰہ آبادی، مخدوم محی الدین، مولانا صفی لکھنوی، جوشؔ ملیح آبادی، آنند نرائن ملاؔ، شمیم کرہانی، علی جواد زیدیؔ، رفعت سروشؔ وغیرہ نے بھی شخصی مرثیہ فروغ دینے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

11.3.1 سرگرمی 2

ذیل میں دیے گئے سوالات کے درست جواب کا انتخاب کیجیے۔

1۔ شخصی مرثیہ کس کی یاد میں لکھا جاتا ہے؟

الف۔ کسی تاریخی عمارت کی   ب۔ کسی شخصیت کے انتقال یا وفات پر

ج۔ کسی شہر کی تعریف میں   د۔ کسی تہوار کے موقع پر

2۔ حالی کے شخصی مرثیوں کی نمایاں خصوصیت کیا ہے؟

الف۔مبالغہ آرائی ب۔سادگی، حقیقت نگاری اور اصلاحی فکر

ج۔صرف طنز و مزاح د۔داستان گوئی

3۔ شخصی مرثیہ کا بنیادی مقصد کیا ہوتا ہے؟

الف۔تفریح فراہم کرنا ب۔مرحوم کی شخصیت، خدمات اور اوصاف کو خراجِ عقیدت پیش کرنا

ج۔سیاسی تبصرہ کرنا د۔اشتہاری مواد پیش کرنا

4۔ حالی اردو ادب میں کس حیثیت سے معروف ہیں؟

الف۔ناول نگار ب۔اصلاحی شاعر اور نقاد

ج۔ڈرامہ نگار د۔سفرنامہ نگار

5۔ شخصی مرثیہ میں زیادہ اہمیت کس چیز کو دی جاتی ہے؟

الف۔مرحوم کی زندگی، کردار اور خدمات کو ب۔فرضی واقعات کو

ج۔مزاحیہ انداز کو د۔کاروباری معاملات کو

11.4 عمومی جائزہ

شخصی مرثیہ اردو ادب کی ایک ایسی باوقار صنف ہے جس میں کسی عظیم شخصیت کی وفات پر اس کے اوصاف، کردار، خدمات اور انسانی عظمت کو نہایت مؤثر اور پُرخلوص انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔اس صنف کا مقصد صرف غم و اندوہ کا اظہار نہیں بلکہ مرحوم کی ایسی خصوصیات کو اجاگر کرنا بھی ہے جو معاشرے کے لیے مشعلِ راہ بن سکیں۔اسی لیے شخصی مرثیہ جذبات کے ساتھ ساتھ فکر، اخلاق اور اصلاح کا بھی بہترین ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔اس میں شاعر اپنے احساسات کو حقیقت، اعتدال اور فنی حسن کے ساتھ پیش کرتا ہے، جس سے مرثیہ محض ایک تعزیتی نظم نہیں رہتا بلکہ ایک ادبی اور سماجی دستاویز کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔اردو ادب میں شخصی مرثیہ نے وقت کے ساتھ مسلسل ترقی کی ہے۔ابتدا میں اس کا دائرہ محدود تھا، لیکن بعد میں اس میں نئے موضوعات، نئے اسالیب اور جدید فکری رجحانات شامل ہوتے گئے۔اس ارتقا کے نتیجے میں شخصی مرثیہ صرف

مذہبی یا روایتی شخصیات تک محدود نہ رہا بلکہ قومی رہنماؤں، ادیبوں، شاعروں، سماجی مصلحین، سائنس دانوں اور دیگر ممتاز شخصیات پر بھی لکھا جانے لگا۔ اس تبدیلی نے اس صنف کو مزید وسعت، تازگی اور معنویت عطا کی۔ الطاف حسین حالی نے شخصی مرثیے کو ایک نئی فکری اور ادبی سمت عطا کی۔ انہوں نے جذباتی مبالغے سے گریز کرتے ہوئے حقیقت نگاری، سادگی، خلوص اور اصلاحی فکر کو اہمیت دی۔ ان کے مرثیوں میں مرحوم کی شخصیت کے روشن پہلوؤں کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ قاری نہ صرف متاثر ہوتا ہے بلکہ اس کے کردار سے سبق بھی حاصل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حالی کے شخصی مرثیے اردو ادب میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں اور بعد کے شعرا کے لیے بھی نمونہ عمل ثابت ہوئے۔ آج کے دور میں بھی شخصی مرثیہ اپنی افادیت سے محروم نہیں ہوا۔ اگرچہ ادبی رجحانات میں تبدیلی آئی ہے، لیکن عظیم شخصیات کی یاد، ان کی خدمات کے اعتراف اور ان کے کردار کو نئی نسل تک منتقل کرنے میں اس صنف کی اہمیت برقرار ہے۔ شخصی مرثیہ ہمیں یہ احساس دلاتا ہے کہ انسان کا اصل سرمایہ اس کا کردار، اس کی خدمت اور اس کی اعلیٰ انسانی اقدار ہیں۔ یہی اقدار انسان کو وفات کے بعد بھی زندہ رکھتی ہیں اور ادب کے ذریعے آنے والی نسلوں تک منتقل ہوتی رہتی ہیں۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ شخصی مرثیہ اردو ادب کی ایک مؤثر، باوقار اور بامقصد صنف ہے جو انسانی جذبات، اخلاقی اقدار، ادبی حسن اور سماجی شعور کو یکجا کرتی ہے۔ یہ صنف نہ صرف عظیم شخصیات کو خراجِ عقیدت پیش کرتی ہے بلکہ معاشرے کو اعلیٰ کردار، خدمتِ خلق اور انسان دوستی کا پیغام بھی دیتی ہے۔ اسی وجہ سے شخصی مرثیہ ہر دور میں اپنی ادبی، فکری اور اخلاقی اہمیت برقرار رکھتا ہے اور اردو ادب کے اہم سرمایے میں شمار ہوتا ہے۔

11.5 فرہنگ

مرثیہ	:	کسی مرحوم کی وفات پر اس کی یاد، اوصاف اور خدمات کو منظوم انداز میں بیان کرنے والی صنفِ سخن۔
شخصی مرثیہ	:	کسی مخصوص شخصیت کی وفات پر لکھا جانے والا مرثیہ۔
ارتقا	:	وقت کے ساتھ تدریجی ترقی اور نشو و نما۔
اصلاحی فکر	:	معاشرے کی بہتری اور اخلاقی اصلاح پر مبنی سوچ۔
حقیقت نگاری	:	واقعات اور کرداروں کو حقیقت کے مطابق پیش کرنے کا انداز۔

خراجِ عقیدت	کسی شخصیت کی خدمات اور عظمت کا احترام کے ساتھ اعتراف کرنا۔
اوصاف	اچھی عادات، خوبیاں اور اعلیٰ خصوصیات۔
کردار	انسان کی اخلاقی، عملی اور سماجی شخصیت۔
رثائی ادب	غم، سوگ اور وفات سے متعلق ادبی تخلیقات۔
فنی حسن	ادب میں زبان، اسلوب اور اظہار کی خوب صورتی۔
سادہ اسلوب	آسان، واضح اور عام فہم طرزِ اظہار۔
ادبی صنف	ادب کی وہ مخصوص قسم جس کی اپنی ہیئت اور خصوصیات ہوں۔
مبالغہ	کسی بات کو حقیقت سے بڑھا کر بیان کرنا۔
تاثر	کسی تحریر یا شخصیت سے پیدا ہونے والا احساس۔
روایت	وہ ادبی یا سماجی طریقہ جو طویل عرصے سے رائج ہو۔

11.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1۔ شخصی مرثیہ کی تعریف کرتے ہوئے اس کے آغاز و ارتقا پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔

2۔ اردو ادب میں شخصی مرثیہ کی روایت اور اس کی ادبی اہمیت پر جامع مضمون لکھیے۔

3۔ الطاف حسین حالی کی شخصیت اور ان کے شخصی مرثیوں کی نمایاں خصوصیات بیان کیجیے۔

4۔ حالی کے شخصی مرثیوں میں اصلاحی فکر، حقیقت نگاری اور سادہ اسلوب کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔

5۔ مرزا غالب کی ادبی خدمات اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالیے۔

6۔ حالی اور غالب کے تعلقات کا جائزہ لیتے ہوئے اردو ادب پر ان کے اثرات بیان کیجیے۔

7۔ شخصی مرثیہ کی فنی اور فکری خصوصیات پر تفصیلی مضمون تحریر کیجیے۔

8۔ موجودہ دور میں شخصی مرثیہ کی اہمیت اور افادیت پر اظہارِ خیال کیجیے۔

11.7 مشقی سوالات

1۔ مرثیہ سے کیا مراد ہے؟

2۔ شخصی مرثیہ کی تعریف کیجیے۔

3۔ شخصی مرثیہ کی دو نمایاں خصوصیات لکھیے۔

4۔ شخصی مرثیہ کے آغاز کی بنیادی وجہ کیا تھی؟

5۔ شخصی مرثیہ اور روایتی مرثیہ میں ایک فرق بیان کیجیے۔

6۔ الطاف حسین حالی کا مکمل نام کیا تھا؟

7۔ حالی کا اردو ادب میں کیا مقام ہے؟

8۔ حالی نے شخصی مرثیے میں کون سی اصلاحات متعارف کرائیں؟

9۔ مرزا غالب کا پورا نام لکھیے۔

10۔ مرزا غالب اردو ادب میں کن حیثیتوں سے مشہور ہیں؟

11۔ حالی نے غالب کی شخصیت پر کون سی مشہور کتاب تصنیف کی؟

12۔ غالب کی شاعری کی دو نمایاں خصوصیات بیان کیجیے۔

13۔ حالی کے شخصی مرثیوں کی ایک نمایاں خصوصیت لکھیے۔

14۔ شخصی مرثیہ میں حقیقت نگاری سے کیا مراد ہے؟

15۔ شخصی مرثیہ میں کن اوصاف کو نمایاں کیا جاتا ہے؟

16۔ شخصی مرثیہ معاشرے میں کیا اہمیت رکھتا ہے؟

17۔ حالی اور غالب کے ادبی تعلقات پر مختصر نوٹ لکھیے۔

18۔ شخصی مرثیہ اردو ادب کی اہم صنف کیوں سمجھی جاتی ہے؟

19۔ شخصی مرثیہ میں مبالغہ آرائی کے بجائے کس انداز کو اہمیت دی جاتی ہے؟

20۔ شخصی مرثیہ کن اخلاقی اقدار کو فروغ دیتا ہے؟

11.8 مشقی سوالات کے جوابات/جوابات سرگرمی

جوابات سرگرمی ۱

وفات

خنساء

فارسی

کارناموں

کردار

احترام

فنی حسن

کارناموں

جوابات سرگرمی ۲

1۔ب

2۔ب

3۔ب

4۔ب

5۔الف

مشقی سوالات کے جوابات

1۔ مرثیہ ایسی نظم ہے جس میں کسی مرحوم کے اوصاف، خدمات اور وفات پر اظہارِ غم کیا جاتا ہے۔

2۔ شخصی مرثیہ وہ مرثیہ ہے جو کسی خاص شخصیت کی وفات پر اس کی خدمات اور کردار کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے لکھا جائے۔

3۔ اس کی نمایاں خصوصیات حقیقت نگاری، سادگی، خلوص اور اخلاقی اقدار کا بیان ہیں۔

4۔ عظیم شخصیات کی یاد کو محفوظ رکھنے اور ان کی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے شخصی مرثیہ وجود میں آیا۔

5۔ شخصی مرثیہ کسی مخصوص شخصیت پر جبکہ روایتی مرثیہ واقعہ کربلا اور اس کے کرداروں پر مبنی ہوتا ہے۔

6۔ الطاف حسین حالی۔

7۔ حالی اردو کے عظیم شاعر، نقاد، سوانح نگار اور مصلحِ ادب تھے۔

8۔ انہوں نے حقیقت نگاری، سادگی اور اصلاحی فکر کو فروغ دیا۔

9۔ مرزا اسداللہ خاں غالب۔

10۔ وہ اردو اور فارسی کے عظیم شاعر تھے۔

11۔ یادگارِ غالب۔

12۔ فکری گہرائی اور فلسفیانہ انداز۔

13۔ سادہ، مؤثر اور حقیقت پر مبنی اسلوب۔

14۔ واقعات اور شخصیت کو حقیقت کے مطابق بیان کرنا۔

15۔ مرحوم کی شخصیت، کردار، خدمات اور اعلیٰ اخلاق کو نمایاں کیا جاتا ہے۔

16۔ یہ عظیم شخصیات کی خدمات کو محفوظ رکھتا اور نئی نسل کو ان سے روشناس کراتا ہے۔

17۔ حالی غالب کے شاگرد، مداح اور ان کے حالات و خدمات کے اہم سوانح نگار تھے۔

18۔ کیونکہ یہ ادب، تاریخ، اخلاق اور انسانی اقدار کو یکجا کرتا ہے۔

19۔ حقیقت نگاری اور اعتدال کو۔

20۔ خدمتِ خلق، اخلاص، اعلیٰ کردار، انسان دوستی اور اخلاقی شعور کو فروغ دیتا ہے۔

11.9 امدادی کُتب

۱۔ انتخابِ مراثی) انیس ودبیر (۔مرتبہ رشید حسن خان۔ازمکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔دہلی

۲۔ انتخابِ قصائدِ اُردو۔ازڈاکٹر بومحمد سحر) مُرتّبہ

۳۔ انتخابِ قصائدومراثی۔سودا،ذوق،انیس اور دبیر۔ڈاکٹر چمن لعل بھگت۔قاسمی کتب خانہ جموں

۴۔ اُردو میں قصیدہ نگاری۔ازابومحمد سحر

۵۔ اُردو میں قصیدہ نگاری کی روایت۔ازمحمود الٰہی

۶۔ موازانہ انیس و بیراز شبلی نعمانی

۷۔ اردو مرثیہ کا ارتقا۔ازڈاکٹر مسیح الزمان۔

۸۔ اُردوقصیدہ نگاری۔اُم ہانی اشرف

۹۔ اُردومرثیہ نگاری۔اُم ہانی اشرف

۱۰۔ انتخاب قصائدومراثی مع فرہنگ) سودا،ذوق،انیس،دبیر (۔ڈاکٹر چمن لال

سبق نمبر12: مرثیہ کے زوال کے اسباب

ساخت

12.0 اغراض ومقاصد

12.1 تعارف

12,2 مرثیہ کے زوال کا تاریخی وادبی پس منظر

12.2.1 سرکاری سرپرستی کا خاتمہ (اودھ کی حکومت کا خاتم)

12.2.2 زوال سے قبل مرثیہ کی ادبی حیثیت

12.2.3 سرگرمی 1 آؤ اپنی معلومات جانچیں

12.4 عمومی جائزہ

12.5 فرہنگ

12.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

12.7 مشقی سوالات

12.8 مشقی سوالات کے جوابات/جواباتِ سرگرمی

12.9 امدادی کتب

12.0 اغراض ومقاصد

اس سبق کے مطالعے کے بعد طلبہ اس قابل ہو جائیں گے کہ وہ اردو ادب میں مرثیہ کی صنفی اہمیت، اس کے تاریخی پس منظر اور ادبی ارتقا کو بہتر انداز میں سمجھ سکیں، مرثیہ کے عروج اور زوال کے مختلف ادوار کا تجزیہ کر سکیں، ان سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ادبی عوامل کی نشاندہی کر سکیں جنہوں نے مرثیہ نگاری کی روایت کو متاثر کیا، اودھ کی ریاست کے خاتمے اور شاہی سرپرستی کے فقدان کے نتیجے میں مرثیہ پر مرتب ہونے والے اثرات کو واضح کر سکیں، بدلتے ہوئے ادبی رجحانات اور نئی اصنافِ ادب کے فروغ کے باعث مرثیہ کی مقبولیت میں آنے والی کمی کا تنقیدی مطالعہ کر سکیں، مرثیہ نگاری کے نمایاں شعرا کی خدمات کو زوال کے تاریخی پس منظر سے جوڑ کر سمجھ سکیں، مرثیہ کی فنی اور فکری خصوصیات کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے زوال کی حقیقی وجوہات تک رسائی حاصل کر سکیں، مختلف ناقدین کی آرا کی روشنی میں اس صنف کی ادبی حیثیت کا تجزیہ کر سکیں اور اس موضوع سے متعلق تحقیقی و تنقیدی مباحث میں مدلل انداز سے اظہارِ خیال کرنے کی صلاحیت پیدا کر سکیں۔ اس سبق کا مقصد صرف مرثیہ کے زوال کے اسباب بیان کرنا نہیں بلکہ طلبہ میں یہ شعور پیدا کرنا بھی ہے کہ ادب اپنے عہد کے سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی حالات سے گہرا تعلق رکھتا ہے، اور جب یہ حالات تبدیل ہوتے ہیں تو ادبی اصناف بھی ان تبدیلیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتیں۔

12.1 تعارف

مرثیہ اردو شاعری کی ان ممتاز اصناف میں شمار ہوتا ہے جنہوں نے صدیوں تک برصغیر کی تہذیبی، مذہبی اور ادبی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اگرچہ اس صنف کی بنیاد واقعہ کربلا اور حضرت امام حسینؓ اور ان کے جانثار رفقا کی عظیم قربانیوں کے بیان پر قائم ہے، تاہم مرثیہ صرف غم واندوہ کا اظہار نہیں بلکہ انسانی کردار، اخلاقی عظمت، حق وصداقت، ایثار، صبر، شجاعت اور ظلم کے خلاف مزاحمت کا ایسا جامع ادبی سرمایہ ہے جس نے اردو شاعری کو فکری بلندی اور فنی وقار عطا کیا۔ مرثیہ نگاروں نے کربلا کے تاریخی واقعے کو اس انداز سے پیش کیا کہ وہ ہر دور کے انسان کے لیے حق اور انصاف کی جدوجہد کی علامت بن گیا۔ اردو مرثیہ نے اپنی ترقی کے مختلف مراحل طے کیے، مگر اس کا سنہرا دور اودھ، بالخصوص لکھنؤ میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ نوابینِ اودھ نے علم وادب کی سرپرستی کو اپنی ریاستی پالیسی کا اہم حصہ بنایا۔ اس سرپرستی کے نتیجے میں نہ صرف شاعری کی مختلف اصناف کو فروغ ملا بلکہ مرثیہ نگاری کو بھی غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس ماحول میں میر ببر علی انیس اور مرزا سلامت علی دبیر جیسے عظیم شعرا نے مرثیہ کو ایسی فنی اور فکری بلندی عطا کی کہ وہ اردو ادب کی نمائندہ صنف بن گیا۔ ان شعرا کے مراثی آج بھی زبان، بیان، کردار نگاری، منظر نگاری،

جذبات نگاری اور فنی حسن کے اعلیٰ نمونے سمجھے جاتے ہیں۔

ادب کی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ کوئی بھی ادبی صنف ہمیشہ یکساں مقبول نہیں رہتی۔ وقت کے ساتھ معاشرتی، سیاسی، تہذیبی اور فکری حالات میں رونما ہونے والی تبدیلیاں ادبی رجحانات کو بھی متاثر کرتی ہیں۔ یہی صورتِ حال مرثیہ کے ساتھ بھی پیش آئی۔ انیس و دبیر کے بعد اگرچہ مرثیہ لکھا جاتا رہا، لیکن وہ مقبولیت، وسعت اور فنی عظمت برقرار نہ رہ سکی جو ان کے دور کا نمایاں وصف تھی۔ اس تبدیلی کے پسِ پشت کئی ایسے عوامل کارفرما تھے جنہوں نے مرثیہ کی ترقی کی رفتار کو سست کر دیا۔ مرثیہ کے زوال کو محض کسی ایک سبب سے وابستہ کرنا درست نہیں ہوگا۔ اس کے پیچھے متعدد تاریخی، سیاسی، سماجی، معاشی اور ادبی عوامل موجود تھے۔ اودھ کی حکومت کا خاتمہ، شاہی سرپرستی کا فقدان، سماجی ڈھانچے میں تبدیلی، جدید تعلیم کا فروغ، نئی ادبی اصناف کی مقبولیت، بدلتے ہوئے ادبی ذوق اور قارئین کی ترجیحات میں تبدیلی جیسے عوامل نے مجموعی طور پر مرثیہ نگاری کو متاثر کیا۔ ان عوامل نے نہ صرف مرثیہ کی تخلیق کے ماحول کو تبدیل کیا بلکہ اس کے قارئین اور سامعین کی تعداد پر بھی اثر ڈالا۔

اس سبق میں ان تمام اسباب کا مرحلہ وار اور تنقیدی مطالعہ پیش کیا جائے گا تاکہ طلبہ یہ سمجھ سکیں کہ کسی ادبی صنف کی ترقی اور زوال صرف ادبی صلاحیتوں پر منحصر نہیں ہوتا بلکہ اس کے پیچھے ایک پورا تاریخی، تہذیبی اور سماجی پس منظر موجود ہوتا ہے۔ اسی تناظر میں مرثیہ کے زوال کے مختلف اسباب کا تجزیہ کیا جائے گا اور ان کے ادبی اثرات کو واضح کیا جائے گا۔

12.2 مرثیہ کے زوال کا تاریخی و ادبی پس منظر

اردو ادب کی تاریخ میں مرثیہ ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس نے اپنے فکری، ادبی اور تہذیبی امتیازات کے باعث منفرد مقام حاصل کیا۔ اس صنف کی بنیاد واقعہ کربلا کے المناک سانحے اور حضرت امام حسینؑ، اہلِ بیتؑ اور ان کے جاں نثار ساتھیوں کی عظیم قربانیوں کے بیان پر قائم ہے، لیکن اس کی وسعت صرف اسی واقعے تک محدود نہیں۔ مرثیہ نے انسانی کردار کی بلندی، حق و انصاف کی سربلندی، ظلم کے خلاف استقامت، صبر، وفاداری، ایثار، اخلاص اور اخلاقی اقدار جیسے آفاقی موضوعات کو بھی نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ مرثیہ اردو شاعری کی ان اصناف میں شمار ہوتا ہے جنہوں نے صرف ادبی حسن ہی نہیں بلکہ فکری تربیت اور تہذیبی شعور کی تشکیل میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ اردو ادب کی کوئی بھی سنجیدہ تاریخ مرثیہ کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جاتی۔

مرثیہ کی ابتدائی روایت اگرچہ دکن اور شمالی ہند کے مختلف علاقوں میں موجود تھی، لیکن اسے حقیقی عروج ریاستِ اودھ، خصوصاً لکھنؤ میں

حاصل ہوا۔اٹھارویں اور انیسویں صدی کے دوران لکھنؤ نہ صرف سیاسی اور معاشی اعتبار سے ایک مضبوط مرکز تھا بلکہ علم، ادب، تہذیب، موسیقی، مصوری اور دیگر فنون کا بھی اہم گہوارہ بن چکا تھا۔نوابینِ اودھ نے اہلِ علم و ادب کی ہمیشہ سرپرستی کی، جس کے نتیجے میں اردو زبان اور اس کی مختلف اصناف نے غیر معمولی ترقی کی۔مرثیہ بھی انہی اصناف میں شامل تھا جسے اس دور میں بے مثال مقبولیت حاصل ہوئی۔محرم کی مجالس، مذہبی اجتماعات اور ادبی محفلیں مرثیہ نگاری کے فروغ کا مؤثر ذریعہ بنیں اور اس صنف نے عوامی اور ادبی دونوں سطحوں پر اپنی مضبوط شناخت قائم کی۔

اس دور میں مرثیہ صرف مذہبی عقیدت کا اظہار نہیں رہا بلکہ ایک مکمل ادبی فن کی صورت اختیار کر گیا۔مرثیہ نگاروں نے زبان کی لطافت، بیان کی شگفتگی، منظر نگاری، کردار نگاری، جذبات نگاری، مکالمہ نگاری اور شعری صناعی کے ذریعے اس صنف کو فنی اعتبار سے انتہائی بلند مقام تک پہنچایا۔میر ببر علی انیس اور مرزا سلامت علی دبیر نے اپنی غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں سے مرثیہ نگاری کو ایسا عروج بخشا کہ ان کے بعد بھی اردو ادب میں ان کا مقام ناقابلِ فراموش رہا۔انیس کے مراثی میں کرداروں کی نفسیاتی گہرائی، زبان کی سادگی اور جذبات کی صداقت نمایاں ہے، جبکہ دبیر نے اپنے منفرد اسلوب، الفاظ کی شان و شوکت اور منظر نگاری کے ذریعے مرثیہ کو نئی جہتیں عطا کیں۔ان دونوں شعرا کی ادبی رقابت نے بھی اس صنف کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔مرثیہ کی اس غیر معمولی ترقی کے پیچھے صرف شعرا کی انفرادی صلاحیتیں ہی کارفرما نہیں تھیں بلکہ اس عہد کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات بھی اس کے لیے نہایت سازگار تھے۔ریاستی سرپرستی، اہلِ ذوق کی موجودگی، ادبی محفلوں کا انعقاد، مذہبی روایت کا استحکام اور معاشرے میں مرثیہ کی سماجی قبولیت نے اس صنف کو ترقی کی ایسی بنیادیں فراہم کیں جن پر اس کی عظمت قائم ہوئی۔اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ادب کی ترقی کے لیے صرف تخلیقی صلاحیت کافی نہیں ہوتی بلکہ ایسا ماحول بھی ضروری ہوتا ہے جو اس تخلیقی عمل کی حوصلہ افزائی کرے۔مرثیہ کو یہی ماحول ریاستِ اودھ میں میسر آیا۔

تاہم تاریخ کا اصول یہ ہے کہ معاشرے ہمیشہ ایک ہی حالت پر قائم نہیں رہتے۔سیاسی اقتدار، سماجی ڈھانچے، معاشی حالات، تعلیمی نظام اور عوامی رجحانات میں وقت کے ساتھ تبدیلیاں آتی رہتی ہیں اور یہی تبدیلیاں ادب پر بھی گہرے اثرات مرتب کرتی ہیں۔انیسویں صدی کے وسط میں برصغیر کے سیاسی حالات نے اچانک ایک نیا رخ اختیار کیا۔ریاستِ اودھ کا خاتمہ، 1857ء کی جنگِ آزادی، انگریز حکومت کا استحکام، جدید تعلیم کا فروغ، مغربی افکار کا نفوذ اور نئے معاشرتی تصورات نے ادبی دنیا کو بھی متاثر کیا۔ان تبدیلیوں نے مرثیہ کی اس فضا کو بدل دیا جس میں یہ صنف اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ پروان چڑھی تھی۔ادبی رجحانات میں بھی نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔اب ادب سے یہ توقع کی جانے لگی کہ وہ قومی بیداری، سماجی اصلاح، جدید تعلیم، سائنسی شعور، آزادی اور انسانی زندگی کے نئے مسائل کو اپنا موضوع بنائے۔نتیجتاً نظم،

ناول، افسانہ، ڈراما، مضمون اور تنقید جیسی اصناف تیزی سے مقبول ہوئیں۔ ان اصناف نے ادب کو نئے موضوعات، نئے اسالیب اور نئے فکری زاویے فراہم کیے۔ اس کے برعکس مرثیہ اپنی روایت، ہیئت اور مخصوص موضوعاتی دائرے کے باعث پہلے جیسی وسعت کے ساتھ نئے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ ہو سکا۔ اگرچہ اس کی ادبی عظمت برقرار رہی، لیکن اس کی مقبولیت اور اثر پذیری میں بتدریج کمی آتی گئی۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مرثیہ کے زوال سے مراد اس صنف کا خاتمہ نہیں ہے۔ آج بھی مرثیہ اردو ادب کی ایک معتبر اور زندہ صنف ہے۔ محرم کی مجالس، مذہبی اجتماعات، جامعات اور تحقیقی اداروں میں اس پر مسلسل کام ہو رہا ہے، مگر اس کی وہ مرکزی حیثیت باقی نہیں رہی جو انیس اور دبیر کے عہد میں تھی۔ ادبی دنیا میں اس کی جگہ نسبتاً محدود ہو گئی ہے، جبکہ دوسری اصناف نے زیادہ وسعت اختیار کر لی ہے۔ اسی تبدیلی کو ادبی اصطلاح میں مرثیہ کے زوال سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مرثیہ کے زوال کے تاریخی و ادبی پس منظر کا مطالعہ اس لیے بھی اہم ہے کہ اس سے طلبہ اس حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں کہ ادب کسی خلا میں تخلیق نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور فکری حالات سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ جب یہ حالات بدلتے ہیں تو ادبی اصناف بھی ان سے متاثر ہوتی ہیں۔ چنانچہ مرثیہ کے زوال کو سمجھنے کے لیے ان تمام تاریخی اور ادبی عوامل کا مطالعہ ناگزیر ہے جنہوں نے اس صنف کے عروج، ارتقا اور بعد ازاں اس کی مقبولیت میں آنے والی تبدیلیوں کو جنم دیا۔ یہی پس منظر آگے بیان کیے جانے والے اسباب کو سمجھنے کی مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے۔

12.2.1 سرکاری سرپرستی کا خاتمہ (اودھ کی حکومت کا خاتمہ)

مرثیہ کے زوال کے اسباب میں سب سے بنیادی اور مؤثر سبب ریاستِ اودھ کا خاتمہ اور اس کے نتیجے میں سرکاری سرپرستی کا ختم ہو جانا تھا۔ ادبی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ جب بھی کسی معاشرے میں اہلِ علم، ادیبوں اور شاعروں کو حکمرانوں کی سرپرستی حاصل ہوتی ہے تو ادب کو ترقی کے وسیع مواقع میسر آتے ہیں۔ یہی صورتِ حال مرثیہ کے ساتھ بھی پیش آئی۔ ریاستِ اودھ کے نواب نہ صرف ادب دوست تھے بلکہ وہ شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کی عزت افزائی اور مالی معاونت بھی کرتے تھے۔ اس سرپرستی کی بدولت لکھنؤ اردو زبان و ادب کا ایک عظیم مرکز بن گیا، جہاں مرثیہ نگاری کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ لکھنؤ کی تہذیب میں مذہبی روایات کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ محرم کے ایام میں بڑے پیمانے پر مجالسِ عزا منعقد ہوتی تھیں، جن میں مرثیہ خوانی ایک اہم جزو سمجھی جاتی تھی۔ ان مجالس میں نامور مرثیہ نگار اپنی تخلیقات پیش کرتے اور

اہلِ ذوق ان کے کلام کو نہایت انہاک سے سنتے تھے۔ یہ محفلیں صرف مذہبی عقیدت کا اظہار نہیں تھیں بلکہ علمی اور ادبی ذوق کی آبیاری کا بھی مؤثر ذریعہ تھیں۔ مرثیہ نگاروں کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے بہترین ماحول میسر تھا، جس کے نتیجے میں اس صنف نے فنی اعتبار سے غیر معمولی ترقی کی۔

نوابینِ اودھ کی سرپرستی نے مرثیہ نگاروں کو معاشی استحکام بھی فراہم کیا۔ انہیں وظائف، انعامات، جاگیریں اور دیگر سہولیات دی جاتی تھیں، جس کی وجہ سے وہ معاشی پریشانیوں سے آزاد ہو کر پوری توجہ کے ساتھ تخلیقی کام انجام دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں مرثیہ نگاری محض مشغلہ نہیں بلکہ ایک باقاعدہ ادبی روایت بن گئی تھی۔ میر ببر علی انیس، مرزا سلامت علی دبیر، میر ضمیر، دلگیر اور دیگر شعرا نے اسی سازگار ماحول میں ایسے شاہکار تخلیق کیے جو آج بھی اردو ادب کے بہترین سرمائے میں شمار ہوتے ہیں۔ سن 1856ء میں انگریز حکومت نے ریاستِ اودھ کو اپنے قبضے میں لے لیا اور نواب واجد علی شاہ کو معزول کر کے کلکتہ بھیج دیا۔ اس واقعے نے صرف سیاسی نظام ہی کو متاثر نہیں کیا بلکہ پورے معاشرتی اور تہذیبی ڈھانچے کو بھی بدل کر رکھ دیا۔ شاہی دربار ختم ہو گیا، ادبی محفلیں کم ہو گئیں اور اہلِ علم و ادب کی سرپرستی کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ جن شعرا کو دربار سے معاشی اور سماجی تحفظ حاصل تھا، وہ یکایک اس سہولت سے محروم ہو گئے۔ اس تبدیلی نے مرثیہ نگاری کے فروغ کو براہِ راست متاثر کیا۔ اس کے فوراً بعد 1857ء کی جنگِ آزادی نے حالات کو مزید سنگین بنا دیا۔ برصغیر کا سیاسی نقشہ بدل گیا اور انگریز حکومت نے اپنی انتظامی ترجیحات کے مطابق ایک نیا نظام قائم کیا۔ اس نظام میں روایتی درباری ادب کی سرپرستی کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔ نئی حکومت کی توجہ انتظامی استحکام، تعلیم اور نوآبادیاتی نظام کے فروغ پر مرکوز تھی، جبکہ شاعری اور کلاسیکی اصناف کی سرپرستی پہلے جیسی نہ رہی۔ اس تبدیلی نے مرثیہ نگاری کی ترقی کی رفتار کو نمایاں طور پر سست کر دیا۔

سرکاری سرپرستی کے خاتمے کا ایک اور اہم اثر یہ ہوا کہ مرثیہ نگاروں کی نئی نسل کو وہ علمی و ادبی ماحول میسر نہ آ سکا جو پہلے موجود تھا۔ پہلے ممتاز و معروف شعرا کی اصلاحی نشستیں، درباری مشاعرے اور مذہبی مجالس نوجوان شعرا کی تربیت کا ذریعہ بنتی تھیں، مگر وقت گزرنے کے ساتھ یہ روایت کمزور پڑ گئی۔ اس کے نتیجے میں ایسے مرثیہ نگار کم پیدا ہوئے جو انیس اور دبیر کی فنی روایت کو اسی شان سے آگے بڑھا سکتے۔ معاشی مشکلات نے بھی اس صورتِ حال کو مزید پیچیدہ بنا دیا۔ بہت سے اہلِ قلم کو روزگار کے لیے دوسرے شعبوں کا انتخاب کرنا پڑا۔ کچھ شاعروں نے غزل، نظم یا نثر کی طرف توجہ دی کیونکہ ان اصناف کے لیے اخبارات، رسائل اور جدید اشاعتی اداروں میں نسبتاً زیادہ مواقع موجود تھے۔ اس طرح مرثیہ نگاری کی طرف رجحان بتدریج کم ہوتا گیا۔

اگر چہ سرکاری سر پرستی ختم ہونے کے باوجود مرثیہ کی روایت مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی۔ مذہبی وابستگی اور مجالسِ عزا کی وجہ سے مرثیہ آج بھی زندہ ہے، لیکن اس کی وہ ادبی وسعت، سماجی اہمیت اور فنی مرکزیت باقی نہیں رہی جو ریاستِ اودھ کے دور میں موجود تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی مورخین ریاستِ اودھ کے خاتمے اور سرکاری سر پرستی کے فقدان کو مرثیہ کے زوال کا بنیادی اور فیصلہ کن سبب قرار دیتے ہیں۔ اس واقعے نے نہ صرف مرثیہ کی ترقی کے لیے سازگار ماحول کو ختم کیا بلکہ اس صنف کی آئندہ نسلوں کی تخلیقی روایت پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے

12.2.2 زوال سے قبل مرثیہ کی ادبی حیثیت

صنف مرثیہ دراصل اودھ کی سرزمین میں خلیق وضمیر اور انیسؔ و دبیرؔ کے ہاتھوں اپنی معراج کمال کو پہنچی۔ ان با کمالوں کے بعد کوئی فن کی ان بلندیوں تک نہ پہنچ سکا۔ انیسؔ و دبیرؔ چونکہ مرثیہ نگار کے ساتھ ساتھ مرثیہ خواں بھی تھے چنانچہ انہوں نے سامعین کی ترجیحات کو سامنے رکھا اور بہت سے ایسے اجزا مرثیے میں شامل کئے جو صنف مرثیہ کے تقدس واحترام کے عین مطابق نہیں تھا۔ مثلاً بہاریہ مضامین، گھوڑے اور تلوار کی تعریف میں متغزلانہ انداز بیان، منظر نگاری پر خصوصی زور اور اس ضمن میں جو مناظر دکھائے گئے وہ کربلا کے میدان سے حقیقی صورت حال سے دور تھے۔ یہی کیفیت سیرت نگاری کی بھی ہوئی۔ ان مرثیوں میں شہدائے کربلا عرب کے ہیرو کے بجائے اودھ کے ہیروز یادہ نظر آتے ہیں اور بعض مقامات پر خواتین کو بلا کی جو تصویریں پیش کی گئیں وہ بھی ان کے مرتبے کے لحاظ سے موافقت نہیں رکھتے۔ باوجود اس کے انیسؔ و دبیرؔ کے فن نے ان خامیوں کو چھپا دیا مگر بعد کے مرثیہ نگار اس کی پیروی نہ کر سکے اور مرثیے میں جو لطف واثر تھا وہ بتدریج زائل ہوتا گیا۔ انیسؔ و دبیرؔ کے سامعین میں امرا و نوابین بھی ہوا کرتے تھے اور وہ انہیں انعام واکرام سے بھی نوزتے تھے تا کہ وہ فکر معاش سے بالاتر ہو کر مرثیہ کے فن کو جلا بخشتے رہیں۔ مگر ان کے بعد اب سامعین میں نہ تو وہ امرا تھے جو انعام واکرام دے سکتے تھے اور نہ انیسؔ و دبیرؔ جیسا فن تھا جن کا جادو سر چڑھ کر بولتا۔ انیسؔ و دبیرؔ کے بعد لکھنؤ کی شان وشوکت روبہ زوال ہوئی اور سلطنت اودھ غیر ملکی تسلط کے زیر سایہ آ گیا۔ اس لئے لوگوں کے دلوں میں سپاہیانہ جذبات زندہ نہ رہے اور رزمیہ نگ شاعری سے دلچسپی رفتہ رفتہ ختم ہوتی گئی۔

جدید دور کے مرثیہ نگاروں نے مرثیے کی صنف میں موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے نئے تجربے کئے جو قبول عام نہ ہو سکے۔ مثلاً شادؔ عظیم آبادی نے مرثیے سے وہ اجزا حذف کئے جو اصلیت سے دور نظر آتے تھے۔ گریہ بکا کی جگہ فلسفہ وتصوف کے مضامین داخل کئے اور واقعات کربلا سے اعلیٰ اخلاقی نتائج کے استنباط کا رجحان پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن چونکہ مرثیہ کا فن اس لئے عروج حاصل کر سکا کہ آہ بکا پر رکھی گئی

اور مذہبی جذبے کے تحت یادِ حسینؑ میں رونے رلانے کو کارِ ثواب سمجھا گیا لہٰذا مرثیے میں دیگر اخلاقی مضامین ذہن و فکر کو متاثر تو کر سکتے تھے مگر جذبات پر نہیں لہٰذا اصل مقصد فوت ہونے لگا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ مروجہ ہیئت میں تبدیلی کے سبب رزمیہ عناصر غائب ہونے لگے لیکن جہاں تم رزمیہ عناصر کا تعلق ہے ان میں کمی آجانے سے مرثیے کے فن کو نقصان پہنچا۔ اسی طرح محاکات کی جو فضا اور جذبات نگاری کا جو انداز قدیم مرثیہ گویوں کے ہاں ملتا ہے، جدید رنگ کے مرثیہ نگار کامیاب نمونے پیش نہیں کر سکے اور وہ پیش رو مرثیہ نگاروں سے بہت پیچھے رہ گئے۔ لہٰذا مرثیہ کے قدیم رنگ ہی مقبول عام رہے۔

اس اعتبار سے یہ کہنا کسی طرح س غلط نہیں ہوگا کہ انیسؔ و دبیرؔ کے عہد میں مرثیہ جس مقام پر پہنچ چکا تھا وہ مقام اور مرتبہ بعد کے مرثیہ نگار حاصل نہ کر سکے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ انیسؔ و دبیرؔ کے عہد کے جو حالات تھے وہ بعد میں نہیں رہے۔ زمانہ نئے تقاضوں اور مطالبوں کے ساتھ انقلاب انگیز تبدیلیوں کے ساتھ آیا جس کا اثر مرثیہ پر بھی خاطر خواہ پڑا ہے۔ مرثیہ چونکہ مذہب سے جڑا رہا اور عقیدت سے مرثیہ کی مجلسیں منعقد ہوتی رہیں اور آج بھی یہ سلسلہ قائم ہے۔ اگر صنف مرثیہ کا یہ تعلق نہ ہوتا تو شاید یہ بھی قصیدے کی طرح روایت بن کر رہ جاتی مگر عقیدت کی بنا پر مرثیہ کی صنف موجود ضرور ہے مگر آج بھی قدیم مرثیے ہی زیادہ مقبول عام رہا۔

12.2.3 سرگرمی آؤ اپ]نی معلومات جانچیں

صحیح یا غلط لکھیے۔

الف۔ مرثیہ کا تعلق واقعہ کربلا سے ہے۔____

ب۔ ریاستِ اودھ نے مرثیہ نگاری کی سرپرستی کی۔____

ج۔ میر انیس اردو کے عظیم مرثیہ نگار تھے۔____

د۔ مرثیہ کے زوال میں شعری ذوق کی تبدیلی کا کوئی کردار نہیں تھا۔____

ہ۔ مرزا دبیر اردو مرثیہ کے ممتاز شاعر تھے۔____

و۔ مرثیہ آج بھی اردو ادب کی ایک اہم صنف ہے۔____

12.4 عمومی جائزہ

مرثیہ اردو ادب کی ان ممتاز اور باوقار اصنافِ سخن میں شمار ہوتا ہے جنھوں نے نہ صرف اردو شاعری کو وسعت، تنوع اور فکری گہرائی عطا کی بلکہ ہندوستان کی تہذیبی، اخلاقی اور معاشرتی زندگی کی ایک بھرپور تصویر بھی محفوظ کی۔ اگرچہ مرثیہ کا بنیادی موضوع واقع؟ کربلا اور حضرت امام حسینؓ اور ان کے جاں نثار رفقا کی عظیم قربانی ہے، لیکن اس کی معنویت صرف ایک تاریخی واقعے تک محدود نہیں۔ مرثیہ میں انسانی عظمت، حق و صداقت، ایثار، وفاداری، صبر، شجاعت، عدل اور اخلاق جیسے آفاقی اقدار کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ یہ ہر دور کے انسان کے لیے یکساں اہمیت رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے مرثیہ محض مذہبی شاعری نہیں بلکہ ایک مکمل ادبی، تہذیبی اور فکری سرمایہ تصور کیا جاتا ہے۔ اردو زبان کے ابتدائی دور ہی سے مرثیہ کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا۔ ابتدا میں نوحے، سلام اور سوگ کے اشعار زبانی روایت کا حصہ تھے، بعد میں انہیں تحریری صورت ملی۔ دکن میں اس صنف کو ابتدائی فروغ حاصل ہوا اور محمد قلی قطب شاہ نے اسے باقاعدہ ادبی بنیادیں فراہم کیں۔ انہوں نے اپنے مراثی میں سادگی، خلوص، سوز و گداز اور فطری جذبات کو اس انداز سے پیش کیا کہ مرثیہ دکنی ادب کی ایک نمایاں صنف بن گیا۔ ان کے مراثی میں مقامی تہذیب، دکن کی ثقافت، زبان کی شیرینی اور واقع؟ کربلا سے قلبی وابستگی نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے۔ اسی لیے انہیں اردو مرثیہ نگاری کے اولین معماروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

بعد کے دور میں مرزا محمد رفیع سودا نے مرثیہ کی ہیئت اور اسلوب میں اہم تبدیلیاں پیدا کیں۔ ان سے پہلے مرثیہ نسبتاً سادہ اور محدود انداز میں کہا جاتا تھا، لیکن سودا نے اس میں تمہید، تشبیب، منظر نگاری اور بیانیہ حسن پیدا کیا۔ انہوں نے مختلف شعری ہیئتوں میں مرثیے کہے اور اس صنف کو صرف گریہ وزاری تک محدود رکھنے کے بجائے ایک باقاعدہ ادبی صنف کی حیثیت عطا کی۔ ناقدین کے مطابق اردو مرثیہ نگاری کے ارتقا میں سودا کی حیثیت ایک ایسے سنگِ میل کی ہے جس نے بعد کے مرثیہ نگاروں کے لیے نئی راہیں متعین کیں۔ مرثیہ کی باقاعدہ فنی تشکیل میں میر ضمیر اور میر خلیق کا کردار بھی نہایت اہم ہے۔ ان دونوں شاعروں نے مرثیہ کے لیے مسدس کی ہیئت کو اختیار کیا اور اس میں چہرہ، سراپا، آمد، رخصت، رزم، شہادت اور بین جیسے اجزا شامل کر کے اسے ایک مکمل بیانیہ صنف کی صورت دی۔ ان کی کوششوں سے مرثیہ کا دائرہ اظہار وسیع ہوا اور اس کے فنی اصول زیادہ منظم شکل میں سامنے آئے۔ یہی وہ بنیاد تھی جس پر بعد میں مرثیہ اپنے عروج تک پہنچا۔ مرثیہ کی حقیقی معراج میر ببر علی انیس اور مرزا سلامت علی دبیر کے عہد میں حاصل ہوئی۔ انیس نے اپنے مراثی میں زبان و بیان، منظر نگاری، کردار نگاری، جذبات نگاری، مکالمہ نگاری اور

نفسیاتی تجزیے کو اس درجہ کمال تک پہنچایا کہ ان کے مراثی اردو ادب کا لازوال سرمایہ بن گئے۔ دوسری طرف دبیر نے اپنے منفرد اسلوب، بلند آہنگ زبان، الفاظ کی شان و شوکت اور فکری وسعت کے ذریعے مرثیہ کو نئی رفعت عطا کی۔ ان دونوں عظیم شاعروں نے نہ صرف واقعہ کربلا کو زندہ کیا بلکہ انسانی کردار، اخلاق اور تہذیب کی ایسی تصویریں پیش کیں جو ہمیشہ کے لیے اردو ادب کا حصہ بن گئیں۔ اسی لیے انہیں اردو مرثیہ نگاری کے دو عظیم ستون کہا جاتا ہے۔

انیس اور دبیر کے بعد بھی مرثیہ نگاری کا سلسلہ جاری رہا۔ شاد عظیم آبادی نے مرثیہ میں فلسفیانہ فکر، اخلاقی اقدار اور علمی انداز کو فروغ دیا۔ انہوں نے تاریخی روایات کی صحت پر زور دیتے ہوئے مرثیہ کو محض جذباتی اظہار کے بجائے فکری اور اخلاقی جہت عطا کی۔ اسی طرح جوش ملیح آبادی نے بیسویں صدی میں مرثیہ کو قومی شعور، آزادی، ظلم کے خلاف مزاحمت اور انقلابی فکر سے ہم آہنگ کیا۔ انہوں نے واقعہ کربلا کو ہر دور کے ظلم و جبر کے خلاف علامت کے طور پر پیش کیا، جس سے مرثیہ کی معنوی وسعت میں اضافہ ہوا۔ جدید دور میں جمیل مظہری نے بھی مرثیہ نگاری میں نمایاں خدمات انجام دیں اور فلسفیانہ و فکری انداز کے ذریعے اس صنف کو نئی جہت عطا کی۔ مرثیہ کی ادبی عظمت کا ایک اہم پہلو اس کی تہذیبی اور لسانی اہمیت بھی ہے۔ مراثی میں ہندوستانی معاشرت، تہذیب، رسم و رواج، لباس، شادی بیاہ، جنگی ساز و سامان، محاورات، روزمرہ، تشبیہات اور استعارات کا ایسا وسیع ذخیرہ محفوظ ہے جو اردو زبان کی تاریخ میں منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ مرثیہ نے اردو زبان کو اظہار کی نئی قوت عطا کی اور اس کے ذخیر ? الفاظ میں بے شمار اضافے کیے۔ یہی وجہ ہے کہ ناقدین مرثیہ کو اردو زبان و ادب کا ایک عظیم تہذیبی اور لسانی سرمایہ قرار دیتے ہیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ سیاسی، سماجی اور ادبی حالات میں بڑی تبدیلیاں آئیں۔ ریاستِ اودھ کا خاتمہ، درباری سرپرستی کا ختم ہونا، جدید تعلیم، مغربی افکار، نئی ادبی تحریکوں اور نظم، افسانہ، ناول اور ڈرامے جیسی اصناف کے فروغ نے مرثیہ کی مقبولیت کو متاثر کیا۔ اس کے باوجود مرثیہ کی ادبی عظمت، فنی وقعت اور تہذیبی اہمیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ آج بھی مرثیہ اردو ادب کی کلاسیکی روایت کا ایک اہم حصہ ہے اور اس کے ذریعے واقعہ کربلا کا آفاقی پیغام، انسانی آزادی، عدل، ایثار، وفاداری اور حق پرستی کی اقدار پوری قوت کے ساتھ زندہ ہیں۔ یہی خصوصیات مرثیہ کو ہر دور میں زندہ، مؤثر اور بامعنی بناتی ہیں۔

12.5 فرہنگ

مرثیہ : شہدائے کربلا یا کسی مرحوم کے غم میں کہی جانے والی نظم

رثا	غم واندوہ کا اظہار، سوگ
نوحہ	غم اور ماتم پر مبنی کلام
مسدس	چھ مصرعوں پر مشتمل شعری ہیئت
شہادت	حق کی خاطر جان قربان کرنا
کربلا	عراق کا وہ تاریخی مقام جہاں حضرت امام حسینؓ نے شہادت پائی
عزاداری	شہدائے کربلا کے غم کا اظہار
رزم	جنگ کا منظر یا میدانِ جنگ
بزم	محفل یا مجلس
سراپا نگاری	کسی شخصیت کے جسمانی حسن و حلیے کا تفصیلی بیان
منظر نگاری	کسی منظر یا ماحول کی تصویری انداز میں عکاسی
کردار نگاری	کرداروں کی صفات اور شخصیت کی مؤثر پیش کش
جذبات نگاری	احساسات اور کیفیات کا مؤثر اظہار
تمہید	کسی موضوع کے آغاز میں پیش کیا جانے والا ابتدائی حصہ
فصاحت	زبان کی سادگی، صفائی اور روانی
بلاغت	مؤثر اور بامقصد اندازِ بیان
استعارہ	ایک چیز کو دوسری چیز کے معنی میں استعمال کرنا
تشبیہ	دو چیزوں کے درمیان مشابہت بیان کرنا
مبالغہ	کسی بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا
واقعہ نگاری	کسی تاریخی یا حقیقی واقعے کی ترتیب وار پیش کش
تہذیب	معاشرتی آداب و اقدار

ثقافت	:	کسی قوم کی روایات، رسم و رواج اور طرزِ زندگی
لسانیات	:	زبان کے علمی مطالعے کا علم
روایت	:	نسل در نسل منتقل ہونے والا طریقہ یا عقیدہ
معراج	:	عروج، بلند ترین مقام
زوال	:	تنزل، گراوٹ یا عروج کا خاتمہ
ایثار	:	دوسروں کے لیے اپنی خواہش قربان کرنا
وفاداری	:	اخلاص اور ثابت قدمی
استقامت	:	مشکلات میں ثابت قدم رہنا
فنی محاسن	:	فن کی خوبیاں اور خصوصیات

12.8 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1۔ مرثیہ کی ابتدا، ارتقا، عروج اور زوال پر تفصیلی مضمون تحریر کیجیے۔

2۔ اردو مرثیہ کی ترقی میں محمد قلی قطب شاہ، مرزا محمد رفیع سودا، میر ضمیر، میر خلیق، میر انیس اور مرزا دبیر کی خدمات کا تنقیدی جائزہ پیش کیجیے۔

3۔ مرثیہ کی ادبی، تہذیبی، لسانی اور فنی اہمیت پر جامع مضمون لکھیے۔

4۔ مرثیہ کے زوال کے اسباب پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے موجودہ دور میں اس کی اہمیت بیان کیجیے۔

5۔ شاد عظیم آبادی، جوش ملیح آبادی اور جمیل مظہری کی مرثیہ نگاری کا تنقیدی جائزہ پیش کیجیے۔

6۔ مرثیہ کو اردو ادب کی ایک جامع اور منفرد صنفِ سخن ثابت کرتے ہوئے اس کے نمایاں اوصاف بیان کیجیے۔

7۔ واقعہ کربلا نے اردو مرثیہ نگاری کے موضوع، اسلوب اور فنی ارتقا کو کس طرح متاثر کیا؟ مثالوں کے ساتھ وضاحت کیجیے۔

8۔ مرثیہ میں انسانی اقدار، اخلاقی تعلیمات، کردار نگاری اور تہذیبی عناصر کی عکاسی پر مفصل مضمون تحریر کیجیے۔

12.7 مشقی سوالات

1۔ مرثیہ کے زوال کا تاریخی پس منظر بیان کیجیے۔

2۔ مرثیہ کے زوال کے اہم اسباب تحریر کیجیے۔

3۔ ریاستِ اودھ کے خاتمے نے مرثیہ نگاری پر کیا اثر ڈالا؟

4۔ جدید ادبی اصناف کے فروغ نے مرثیہ کو کس طرح متاثر کیا؟

5۔ مرثیہ کے زوال میں بدلتے ہوئے سماجی حالات کا کیا کردار تھا؟

6۔ مرثیہ کے ارتقا میں میر انیس اور مرزا دبیر کی خدمات بیان کیجیے۔

7۔ محمد قلی قطب شاہ اور مرزا محمد رفیع سودا کی مرثیہ نگاری کا مختصر جائزہ پیش کیجیے۔

8۔ شاد عظیم آبادی اور جوش ملیح آبادی نے مرثیہ نگاری میں کیا خدمات انجام دیں؟

9۔ موجودہ دور میں مرثیہ کی ادبی اہمیت پر مختصر نوٹ لکھیے۔

10۔ مرثیہ کے زوال کے باوجود اس کی ادبی اہمیت کیوں برقرار ہے؟

12.8 مشقی سوالات کے جوابات/جواباتِ سرگرمی

جواباتِ سرگرمی

1۔ درباری سرپرستی کا خاتمہ

2۔ جدید ادبی اصناف کا فروغ

3۔ ریاستِ اودھ کا زوال

4۔ سماجی اور تہذیبی تبدیلیاں

5۔ عوامی ذوق میں تبدیلی

مشقی سوالات کے جوابات

1۔ مرثیہ کے زوال کا تاریخی پس منظر بیان کیجیے۔

مرثیہ کا زوال انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں سیاسی، سماجی اور ادبی تبدیلیوں کے باعث شروع ہوا، خصوصاً ریاستِ اودھ کے خاتمے کے بعد۔

2۔ مرثیہ کے زوال کے اہم اسباب تحریر کیجیے۔

درباری سرپرستی کا خاتمہ، جدید ادبی اصناف کا فروغ، سماجی تبدیلیاں، عوامی ذوق میں تبدیلی اور جدید تعلیم کا اثر۔

3۔ ریاستِ اودھ کے خاتمے نے مرثیہ نگاری پر کیا اثر ڈالا؟

ریاستِ اودھ کے خاتمے سے مرثیہ نگاروں کی سرپرستی ختم ہوگئی، جس سے اس صنف کی ترقی متاثر ہوئی۔

4۔ جدید ادبی اصناف کے فروغ نے مرثیہ کو کس طرح متاثر کیا؟

ناول، افسانہ، ڈراما اور جدید نظم کی مقبولیت کے باعث مرثیہ کی مقبولیت نسبتاً کم ہوگئی۔

5۔ مرثیہ کے زوال میں بدلتے ہوئے سماجی حالات کا کیا کردار تھا؟

معاشرتی تبدیلیوں اور نئے فکری رجحانات نے لوگوں کی ادبی دلچسپیوں کو بدل دیا، جس سے مرثیہ کا دائرہ اثر محدود ہوا۔

6۔ مرثیہ کے ارتقا میں میر انیس اور مرزا دبیر کی خدمات بیان کیجیے۔

میر انیس اور مرزا دبیر نے مرثیہ کو فنی کمال، ادبی عظمت اور زبان و بیان کی بلندی عطا کی۔

7۔ محمد قلی قطب شاہ اور مرزا محمد رفیع سودا کی مرثیہ نگاری کا مختصر جائزہ پیش کیجیے۔

محمد قلی قطب شاہ نے مرثیہ کی ابتدائی بنیادیں مضبوط کیں، جبکہ سودا نے اس کی ہیئت اور فنی معیار کو ترقی دی۔

8۔ شاد عظیم آبادی اور جوش ملیح آبادی نے مرثیہ نگاری میں کیا خدمات انجام دیں؟

شاد عظیم آبادی نے مرثیہ میں فلسفیانہ اور اخلاقی فکر کو فروغ دیا، جبکہ جوش ملیح آبادی نے اسے انقلابی اور قومی شعور سے ہم آہنگ کیا۔

9۔ موجودہ دور میں مرثیہ کی ادبی اہمیت پر مختصر نوٹ لکھیے۔

مرثیہ آج بھی اردو ادب کی ایک اہم کلاسیکی صنف ہے جو اخلاقی اقدار، قربانی اور حق پسندی کا پیغام دیتی ہے۔

10۔ مرثیہ کے زوال کے باوجود اس کی ادبی اہمیت کیوں برقرار ہے؟

کیونکہ مرثیہ انسانی اقدار، حق و صداقت، ایثار اور اعلیٰ اخلاقی تعلیمات کا نمائندہ ہے، اس لیے اس کی ادبی اہمیت ہمیشہ برقرار رہے گی۔

12.9 امدادی کُتب

۱۔ انتخابِ مراثی) انیس و دبیر (۔مرتبہ رشید حسن خان۔از مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔دہلی

۲۔ انتخابِ قصائدِ اُردو۔از ڈاکٹر بو محمد سحر)مُرتّبہ

۳۔ انتخابِ قصائد و مراثی۔سودا، ذوق، انیس اور دبیر۔ڈاکٹر چمن لعل بھگت۔قاسمی کتب خانہ جموں

۴۔ اُردو میں قصیدہ نگاری۔از ابو محمد سحر

۵۔ اُردو میں قصیدہ نگاری کی روایت۔از محمود الٰہی

۶۔ موازانہ انیس و بیر از شبلی نعمانی

۷۔ اردو مرثیہ کا ارتقا۔از ڈاکٹر مسیح الزمان۔

۸۔ اُردو قصیدہ نگاری۔اُم ہانی اشرف

۹۔ اُردو مرثیہ نگاری۔اُم ہانی اشرف

۱۰۔ انتخاب قصائد و مراثی مع فرہنگ) سودا، ذوق، انیس، دبیر (۔ڈاکٹر چمن لال

سبق نمبر 13 (بہ خدا فارس میدان تہور تھا حرؑ) انیسؔ

ساخت

13.0 اغراض ومقاصد

13.1 تعارف

13.2 متن (بہ خدا فارس میدان تہور تھا حرؑ)

13.2.1: متن کی تدریس

13.2.2 سرگرمی آؤ اپنی معلومات کو جانچیں

13.4 عمومی جائزہ

13.5 فرہنگ

13.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

13.7 مشقی سوالات

13.8 مشقی سوالات کے جوابات / جوابات سرگرمی

13.9 امدادی کتب

13.0 اغراض ومقاصد

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ میر ببر علی انیسؔ کے مشہور مرثیہ "بہ خدا فارسِ میدانِ تہور تھا حرُ" کے متن کو

بہتر انداز میں پڑھ، سمجھ اوراس کی تشریح کرسکیں۔آپ مرثیے کے مختلف بندوں کے مفہوم، ان کے باہمی ربط اوران میں پوشیدہ خیالات ومعانی سے واقف ہوسکیں گے۔

اس سبق کے ذریعے آپ حضرت حُرؒ کے کردار، ان کی شجاعت، حق شناسی، ندامت اور واقعہ کربلا میں ان کے عظیم مقام کو سمجھ سکیں گے۔ آپ یہ جان سکیں گے کہ کس طرح حضرت حُرؒ نے باطل کا ساتھ چھوڑ کر حق کو قبول کیا اور حضرت امام حسینؑ کی رفاقت اختیار کر کے قربانی اور وفاداری کی ایک عظیم مثال قائم کی۔اس سبق کے مطالعے سے حضرت حُرؒ کی شخصیت کے وہ روشن پہلو بھی سامنے آئیں گے جو انسان کو حق، صداقت اور راہِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔اس سبق کے مطالعے سے آپ مرثیے کے متن میں بیان کردہ واقعات، مکالمات، مناظر اور کرداروں کی تشریح کرنے کے قابل ہوجائیں گے۔آپ یہ سمجھ سکیں گے کہ شاعر نے کس طرح الفاظ کے مؤثر اور بلیغ استعمال کے ذریعے واقعہ کربلا کے درد، عظمت، شجاعت اور قربانی کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ آپ مرثیے کے مختلف بندوں میں بیان کردہ جذباتی کیفیتوں اور فکری نکات کا بھی جائزہ لے سکیں گے۔ یہ سبق آپ کو میر انیسؔ کے اسلوبِ بیان، زبان و بیان کی خوبیوں، جذبات نگاری، منظر نگاری، مکالمہ نگاری اور کردار نگاری جیسے فنی محاسن سے روشناس کرائے گا۔آپ یہ بھی سمجھ سکیں گے کہ میر انیسؔ نے اپنے زورِ بیان اور بلند تخیل کے ذریعے واقع؟ کربلا کے مناظر کو کس طرح زندہ اور مؤثر بنا دیا ہے۔مزید یہ کہ اس سبق کے مطالعے سے آپ مرثیے کے مرکزی خیال، اس کے اخلاقی، فکری اور روحانی پیغام کو بہتر انداز میں سمجھ سکیں گے۔ یہ سبق آپ کے اندر ادب کے مطالعے کا ذوق پیدا کرے گا اور آپ کو اس قابل بنائے گا کہ آپ مرثیے کے متن اوراس کی تشریح کا تنقیدی وفکری جائزہ لے سکیں۔

13.1 تعارف

"بہ خدا فارسِ میدانِ تہور تھا حُر "اردو کے عظیم مرثیہ نگار میر ببر علی انیسؔ کا ایک شاہکار مرثیہ ہے۔ یہ مرثیہ واقعہ کربلا کے ایک نہایت اہم اور عظیم کردار حضرت حُر بن یزید ریاحیؒ کی شخصیت، ان کی باطنی کشمکش، حق شناسی، توبہ، شجاعت اور قربانی کو نہایت مؤثر اور جذباتی انداز میں پیش کرتا ہے۔میر انیسؔ نے اس مرثیے میں حضرت حُرؒ کی زندگی کے اس اہم موڑ کو موضوع بنایا ہے جب انہوں نے باطل کا ساتھ چھوڑ کر حق کو اختیار کیا اور حضرت امام حسینؑ کے قدموں میں حاضر ہوکر اپنی وفاداری اور جاں نثاری کا ثبوت دیا۔

اس مرثیے کا بنیادی موضوع حق و باطل کی کشمکش، انسانی ضمیر کی بیداری اور قربانی کے جذبے پر مبنی ہے۔حضرت حُرؒ ابتدا میں یزیدی لشکر

کے ایک اہم سپہ سالار کی حیثیت سے میدان میں موجود تھے اور انہیں حضرت امام حسینؑ کے قافلے کا راستہ روکنے کا حکم دیا گیا تھا۔لیکن جب انہوں نے حالات کا گہرا مشاہدہ کیا، امام حسینؑ کے اعلیٰ اخلاق، صبر واستقامت اور حق پرستی کو دیکھا تو ان کے دل میں ایک شدید داخلی کشمکش پیدا ہوئی۔ یہی کشمکش رفتہ رفتہ حق کی پہچان میں تبدیل ہوئی اور آخر کار حضرت حُرؒ نے باطل کا راستہ چھوڑ کر امام حسینؑ کے ساتھ شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔یہی لمحہ اس مرثیے کا سب سے اہم اور مؤثر پہلو ہے۔میر انیسؔ نے اس مرثیے میں حضرت حُرؒ کی شخصیت کو ایک عظیم ہیرو کے طور پر پیش کیا ہے۔شاعر نے ان کی شجاعت، جنگی مہارت اور بہادری کو بڑے زوردار انداز میں بیان کیا ہے۔مرثیے کے ابتدائی اشعار ہی حضرت حُرؒ کی غیر معمولی بہادری اور عظمت کو نمایاں کرتے ہیں:

بہ خدا فارسِ میدانِ تہور تھا حُر

ایک دو، لاکھ سواروں میں بہادر تھا حُر

ان اشعار میں شاعر حضرت حُرؒ کو ایک بے مثال شہسوار اور عظیم جنگجو کے طور پر پیش کرتا ہے۔ساتھ ہی یہ بھی واضح کرتا ہے کہ حقیقی عظمت صرف جسمانی قوت یا جنگی مہارت میں نہیں بلکہ حق کی پہچان اور اس کے لیے قربانی دینے میں ہے۔یہی وجہ ہے کہ حضرت حُرؒ کی شخصیت اس مرثیے میں شجاعت اور روحانی عظمت دونوں کا حسین امتزاج بن کر سامنے آتی ہے۔

یہ مرثیہ صرف حضرت حُرؒ کی داستان نہیں بلکہ واقعہ کربلا کے عظیم انسانی، اخلاقی اور روحانی پیغام کا بھی ترجمان ہے۔اس میں حضرت امام حسینؑ کے کردار کی عظمت، ان کی رحم دلی، بردباری، اخلاقی بلندی اور حق پر استقامت کو بھی نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔امام حسینؑ کے خطابات، مکالمات اور ان کے بلند کردار کے ذریعے میر انیسؔ نے حق وصداقت کی ایک ایسی تصویر پیش کی ہے جو قاری کے دل ودماغ پر گہرا اثر چھوڑتی ہے۔ادبی اعتبار سے بھی یہ مرثیہ بے حد اہم ہے۔میر انیسؔ کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی زبان کی سلاست، بیان کی روانی، جذبات نگاری، منظر نگاری، مکالمہ نگاری اور کردار نگاری ہے۔اس مرثیے میں بھی ان تمام خصوصیات کا حسین امتزاج ملتا ہے۔میدانِ جنگ کے مناظر، لشکروں کی صف بندی، گھوڑوں کی حرکت، تلواروں کی چمک، نیزوں کی جھنکار اور جنگی فضا کو شاعر نے اس مہارت سے بیان کیا ہے کہ قاری خود کو میدانِ کربلا کے مناظر میں موجود محسوس کرتا ہے۔میر انیسؔ کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے کرداروں کے داخلی جذبات اور نفسیاتی کیفیتوں کو نہایت گہرائی سے بیان کرتے ہیں۔حضرت حُرؒ کی ندامت، ان کا اضطراب، ان کی معافی کی طلب اور امام حسینؑ کی بارگاہ میں حاضری کے مناظر اس مرثیے کے نہایت مؤثر اور جذباتی حصے ہیں۔ان مناظر میں شاعر کی جذبات نگاری اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔

زیرِ نظر سبق میں اس مرثیے کے منتخب بندوں کی تدریس اور تشریح پیش کی جائے گی۔ اس کے ذریعے طلبہ مرثیے کے متن، اس کے مرکزی خیال، اہم واقعات، کرداروں اور ادبی محاسن کو بہتر انداز میں سمجھ سکیں گے۔ یہ سبق نہ صرف ایک ادبی متن کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ اپنے اندر اعلیٰ انسانی اقدار، اخلاقی تعلیمات اور روحانی پیغام بھی سموئے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "بہ خدا فارسِ میدانِ تہور تھا حُر" اردو مرثیہ نگاری میں ایک منفرد اور بلند مقام رکھتا ہے۔

13.2 متن۔ بہ خدا فارسِ میدانِ تہور تھا حُر

بہ خدا فارس میدان تہور تھا حُر — ایک دو، لاکھ سواروں میں بہادر تھا حُر
نار دوزخ سے، ابوذر کی طرح حرُ تھا حُر — گوہر تاج سر عرش ہو، وہ دُر تھا حُر
ڈھونڈھ لی راہِ خدا، کام بھی کیا نیک ہوا
پاک طینت تھی، تو انجام بھی کیا نیک ہوا

واہ رے طالع بیدار ، زہے عزّت وجاہ — حُر پہ کیا فضل خدا ہوگیا، اللہ اللہ !
پیشوائی کو گئے آپ شہ عرش پناہ — خضر قسمت نے بتا دی اُسے فردوس کی راہ
مُدّتوں دور رہے جو ، وہ قریب ایسا ہو
بخت ایسے ہوں ، اگر ہوتو نصیب ایسا ہو

آیا کس شان سے کعبے کی طرف چھوڑ کے دیر — کوئی حضرت کا یگانہ بھی نہ سمجھا اسے غیر
حق نے لکھ دی تھی جو تقدیر میں فردوس کی سیر — فتنہ وشر سے بچا، ہوگیا انجام بہ خیر
ذکر خیر اس کے موئے پر بھی ہوئے جاتے ہیں
عمل نیک ہر اک وقت میں کام آتے ہیں

حُر کہاں اور کہاں احمد مرسل کا خلف — بخت نے دیر سے پہنچا دیا کعبے کی طرف
دل صفا ہوگیا سینے میں توپائے یہ شرف — جب کہ آنکھیں ہوئیں حق بیں، تو ملا درنجف

نیک جو امر ہیں، دل پروہی ٹھن جاتے ہیں
جب خدا چاہے ، تو بگڑے ہوئے بن جاتے ہیں

وصف حُر میں ہے زباں معترف عجز وقصور　　آمد آمد کی بہادر کا سنو اب مذکور
جب ہوئی مستعد جنگ سپاہ مقہور　　مہر افلاک امامت نے کیا رن میں ظہور
غل ہوا، جنگ کو اللہ کے پیارے نکلے
اے فلک دیکھ! زمیں پر بھی ستارے نکلے

کیا کہوں شان جوانان جنودِ اللہ　　کوئی ہم طلعت خورشید ، کوئی غیرت ماہ
باندھی شیروں نے صف جنگ میان جنگاہ　　چمن خلد سے کرنے لگیں حوریں بھی نگاہ
واں لعینوں نے در ظلم وستم کھول دیا
بڑھ کے عبّاس نے یاں سبز علم کھول دیا

ہوگئے سرخ شجاعت سے رُخ آل نبی　　آئی ٹھنڈی جو ہوا ، بھول گئے تشنہ لبی
رَن میں کڑکا ہوا، بجنے لگے باجے عربی　　یکہ تازوں نے کیا شور مبارز طلبی
اِک گھٹا چھا گئی ڈھالوں سے سیہ کاروں کی
برق ہرصف میں چمکنے لگی تلواروں کی

برچھیاں تول کے ہرغول سے خوں خوار بڑھے　　نیزے ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے اسوار بڑھے
تیر جوڑے ہوئے چلوں میں کماں دار بڑھے　　بولے شہ، یاں سے ابھی کوئی نہ زنہار بڑھے
اسد حق کے گھرانے کا یہ دستور نہیں
میں نبی زادہ ہوں، سبقت مجھے منظور نہیں

یہ سخن کہہ کے، مخاطب ہوئے اعدا سے امام　　اے سپاہ عرب وروم ورے وکوفہ وشام
تم پہ کرتا ہے حسین آخری حجت کو تمام　　پسر مصحف ناطق ہوں، سنو میرا کلام

سخن حق کی طرف کانوں کو مصروف کرو
شور باجوں کا مناسب ہوتو موقوف کرو

یہ صدا سنتے ہی، خود رُک گیا قرنا کا خروش تھم گیا طبل و غا کی بھی وہ آواز کا جوش
ہوگیا جوڑ کے ہاتھوں کو جلاجل خاموش کیا بجاتے کہ بجا تھے نہ کسی شخص کے ہوش
چھیڑنا ان کو سرودوں کا بھی ناساز ہوا
رُعب فرزندِ علی، سرمۂ آواز ہوا

کم ہوا غلغلۂ فوج ستم جب اِک بار یوں گہر بار ہوے شہ کے لب گوہر بار
صف کشی کس پہ ہے یہ اے سپہ نانہجار! قتل سادات کی لشکر میں یہ کیسی ہے پکار!
وطن آواروں پہ یہ قرق ہے کیوں پانی کا؟
کیا زمانے میں یہی طور ہے مہمانی کا!

مجھ کو لڑنا نہیں منظور، یہ کیا کرتے ہو تیر جوڑے ہیں جوتم نے، تو خطا کرتے ہو
کیوں نبی زادے پہ غربت میں جفا کرتے ہو؟ دیکھو، اچھا نہیں یہ ظلم ، برا کرتے ہو
شمع ایماں ہوں، اگر سرمرا کٹ جائے گا
یہ مرقع ابھی اک دم میں الٹ جائے گا

میں ہوں سردارِ شباب چمن خلد بریں میں ہوں خالق کی قسم، دوش محمدؐ کا مکیں
میں ہوں انگشتر پیغمبر خاتم کا نگیں مجھ سے روشن ہے فلک، مجھ سے منوّر ہے زمیں
ابھی نظروں سے نہاں نور جو میرا ہوجائے
محفل عالم امکاں میں اندھیرا ہوجائے

قلزم عزّ وشرف کا دُرِ شہوار ہوں میں سب جہاں زیر نگیں ہے، وہ جہاں دار ہوں میں
آج گو مصلحتاً بے کس وناچار ہوں میں ورثہ احمد مختار کا، مختار ہوں میں

بہ خدا دولت ایماں اسی دربار میں ہے
سب بزرگوں کا تبرّک مری سرکار میں ہے

یہ قبا کس کی ہے، بتلاؤ، یہ کس کی دستار — یہ زرہ کس کی ہے، پہنے ہوں جو میں سینہ فگار؟
بر میں کس کا ہے یہ چار آئینۂ جوہر دار — کس کا رہوار ہے یہ، آج میں جس پر ہوں سوار؟
کس کا یہ خود ہے، یہ تیغ دوسرکس کی ہے
کس جری کی یہ کماں ہے ، یہ سپر کس کی ہے؟

تنگ آئے گا تو رُکنے کا نہیں پھر شبیر — ایک حملے میں فنا ہوں گے یہ دو لاکھ شریر
چل سکیں گے نہ تبر مجھ پہ، نہ تلوار، نہ تیر — کاٹ جائے گی گلے سب کے یہ برّاں شمشیر
شیر ہوں، لخت دل غالب ہر غالب ہوں
میں جگر بند علی ابن ابی طالب ہوں

مجھ کو ہوتا نہ اگر بخشش امت کا خیال — روک لیتا مجھے رستے میں ، یہ تھی حُر کی مجال!
تھام سکتا تھا لجام فرس برق مثال! — پوچھ لو، دیکھا ہے اس نے مرے شیروں کا جلال
گفتگو میں سپر اس کی جو نہ ہم ہوجاتے
ہاتھ اک وار میں پہنچوں سے قلم ہوجاتے

غیظ سے ہونٹ چباتے تھے علی کے دل دار — نیمچے تولتے تھے عون و محمد ہر بار
اگلی پڑتی تھی جگر بند حسن کی تلوار — میں نے جب سر کی قسم دی تو رُکے وہ جرار
چلتی تلوار، تو جنگل تہ وبالا ہوتا
پھر نہ حُر خلق میں ہوتا، نہ رسالا ہوتا

تھا یہ بپھرا ہوا عباس ، مرا شیر جواں — سینۂ حُر پہ رکھے دیتا تھا نیزے کی سِناں
میں یہ کرتا تھا اشارہ کہ نہ اے بھائی جاں — رحم لازم ہے ہمیں، ہم ہیں امامِ دوجہاں

کچھ تردّد نہیں، سرتن سے اتارا جائے
کوئی بندہ نہ مرے ہاتھ سے مارا جائے

گرچہ یہ امر نہیں اہل سخا کے شایاں   کہ کسی شخص کو کچھ دے کے، کرے سب پہ عیاں
پوچھ لو، حُر تو ہے موجود، عیاں راچہ بیاں   اسی جنگل میں مع فوج تھا یہ تشنہ دہاں
شور تھا، آج چلیں جسم سے جانیں سب کی
منھ کے باہر نکل آئی تھیں زبانیں سب کی

زیست ہر شے کی ہے پانی سے، شجر ہو کہ بشر   مجھ سے دیکھا نہ گیا میں تو سخی کا ہوں پسر
میں نے عباس دلاور سے کہا گھبرا کر   مشکوں والے ہیں کہاں، اونٹ ہیں پانی کے کدھر؟
کرم ساقی کوثر کو دکھا دو بھائی!
جتنا پانی ہے وہ پیاسوں کو پلا دو بھائی!

رہ نہ جائے کوئی گھوڑا، کوئی ناقہ بے آب   چھاگلیں جلد منگاؤ، مرا دل ہے بے تاب
سقّے، مشکیزوں کے منھ کھول کے آپہنچے شتاب   متوّجہ ہوا میں خود کہ وہ تھا کارِ ثواب
چین آیا نہ مجھے، بے انہیں آرام دیئے
تھا جو اک جام کا پیا سا، اُسے دو جام دیئے

تھی یہی فصل، یہی دھوپ، یہی گرم ہوا   ٹھنڈے پانی پہ گرے پڑتے تھے حر کے رفقا
تشنہ کاموں کا یہ مجمع تھا کہ ملتی نہ تھی جا   سقّے بھر بھر کے کٹوروں کو، یہ دیتے تھے صدا
بھائیو! آؤ، جو پانی کی طلب گاری ہے
چشمۂ فیض حسین ابن علی جاری ہے

آبِ شیریں کا جو دریا ہوا جنگل میں رواں   فرس و اشتر و قاطر نہ رہے تشنہ دہاں
شکر کرنے لگی تر ہو کے، ہر اک خشک زباں   پانی پی پی کے دعائیں مجھے دیتے تھے جواں

شورتھا، ابن یدُاللہ نے جاں بخشی کی
دین ودُنیا کے شہنشاہ نے جاں بخشی کی

ایک دن وہ تھا ،اور اک دن یہ ہے اللہ اللہ   کہ اُسی طرح ہمیں پیاس میں پانی کی ہے چاہ
چشمِ امید ہوکیا ، سب نے پھرائی ہے نگاہ   کوئی اک جام بھی بھر کر ہمیں دیتا نہیں آہ!

ہر مسلماں پہ نبی زادے کاحق ہوتا ہے
بچے روتے ہیں تو سینہ مرا شق ہوتا ہے

کئی طفل اِن میں ہیں کم سن کہ موئے جاتے ہیں   دَم اُکھڑتا ہے مرا، جب انہیں غش آتے ہیں
پانی پانی جو وہ کہتے ہیں، تو شرماتے ہیں   پاس دریا ہے ، پہ اک بوند نہیں پاتے ہیں

سچ ہے، غربت کی عجیب شام وسحر ہوتی ہے
تیسرا دن ہے کہ فاقوں میں بسر ہوتی ہے

شہ کی مظلومی پہ گریاں ہوئی ظالم کی سپاہ   عمر سعد نے کی مڑ کے رُخ حرُ پہ نگاہ
بولا وہ اشہدباللہ بجا کہتے ہیں شاہ   محسن ومنعم وآقا ہے مرا ،یہ ذی جاہ

ان کے احسان کا کیوں کر کوئی منکر ہوجائے
سخن حق میں جو شک لائے، وہ کافر ہوجائے

ایک میں کیا ہوں زمانے پہ ہے احساں ان کا   ابر رحمت ہیں ، خطا پوش ہے داماں ان کا
خشک وترپر ہے کرم خلق میں یکساں ان کا   اے خوشا حال ، جو غربت میں ہومہماں ان کا

جنتّی ہے ، جسے حاصل یہ شرف ہوئے گا
جو ادھر ہوگا ، خدا اس کی طرف ہوئے گا

ان سے قطرہ کوئی مانگے ، توگہردیتے ہیں   ہیں سخی ابن سخی، بات پہ سردیتے ہیں
پیٹ سائل کا ، یہ فاقوں میں بھی بھر دیتے ہیں   یاں توزردیتے ہیں ،فردوس میں گھر دیتے ہیں

آس مجرم کی ، گنہ گار کی اُمید ہیں یہ
ذرّہ پرور جنھیں کہتے ہیں، وہ خورشید ہیں یہ

حرُ سے گھبرا کہ یہ بولا عمرسعد شریر   یہ تو ہے صاف طرف داری شہ کی تقریر
اپنے حاکم کا نہ کچھ ذکر ، نہ تعریف امیر   اللہ اللہ ، یہ اوصاف ، یہ مدح شبیر!
سن چکا ہوں میں کہ مضطر ہے کئی راتوں سے
الفت شاہ ٹپکتی ہے تری باتوں سے

نہ وہ آنکھیں، نہ وہ چتون، نہ وہ تیور، نہ مزاج   سیدھی باتوں میں بگڑنا، یہ نیا طور ہے آج
تخت بخشا ہے محمدؐ کے نواسے نے کہ تاج؟   جن کو سمجھا ہے غنی دل میں وہ خود ہیں محتاج
کون سا باغ تجھے شاہ نے دکھلایا ہے
کہیں کوثر کے تو چھینٹوں میں نہیں آیا ہے

میں جہاں دیدہ ہوں، سب مجھ کو خبر ہے تیری   قرۃ العین محمدؐ پہ نظر ہے تیری
ہونٹھ بھی خشک ہیں، اور چشم بھی تر ہے تیری   جسم خالی ہے ادھر ، جان اُدھر ہے تیری
راہ میں کچھ جوسلوک اور نوازش کی ہے
تونے فرزندیۂ اللہ سے سازش کی ہے

خیر، مخفی نہ رہے گا یہ قصور اور فتور   لکھیں گے، عہدۂ اخبار پہ جو ہیں مامور
حاکم شام ہے جابر، وہ سزا دے گا ضرور   گر تجھے دار پہ کھینچے،تو کچھ اس سے نہیں دور
سب تری قوم کے سرتن سے جدا ہوئیں گے
زن وفرزند گرفتار بلا ہوئیں گے

حُر پکارا کہ زباں بند کر، اونا ہموار!   قابل لعن ہے تو، اور وہ تیرا سردار
ابن زُہرا، ہے جگر بند رسول مختار   میرا کیا منھ، جوکروں مدح امام ابرار

اک زمانہ صفت آل عبا کرتا ہے
آپ قرآں میں خدا ان کی ثنا کرتا ہے

وصف ایسوں کا زباں پر کوئی کیوں کر لائے | تین سو آیے ہوں تعریف میں جن کی آئے
کسی انساں نے یہ دنیا میں ہیں رُتبے پائے | اپنا محبوب و ولی جس کو خدا فرمائے

اُلفت آلِ میں مریے ، تو خوش اقبالی ہے
سنگ ہے، ان کی محبت سے جو دل خالی ہے

دولت حاکم دوں پر ہے ترا دارومدار | دارِ دُنیا سے تعلق نہیں رکھتے دیں دار
کیا مجھے دار پہ کھینچے گا وہ ظالم غدار | خواب غفلت ہے اُسے اور مرے طالع بیدار

کسی سردار نے یہ اوج نہ پایا ہوگا
دارِ طوبیٰ کا مرے فرق پہ سایا ہوگا

عمل نیک سے بہکانہ مجھے او ابلیس! | یہی کونین کا مالک ہے، یہی راس و رئیس
کیا مجھے دے گا ترا حاکم ملعون و خسیس | کچھ تردّد نہیں، کہہ دے کہ لکھیں پرچہ نویس

ہاں، سوے ابن شہنشاہ عرب جاتا ہوں
لے ستم گر، جو نہ جاتا تھا، تو اب جاتا ہوں

کہہ کے یہ، ڈاب سے غازی نے نکالی تلوار | سرُخ آنکھیں ہوئیں، آبرو پہ بل آئے اِک بار
تن کے دیکھا طرف فوج امام ابرار | پانو رکھنے لگا بن بن کے زمیں پہ رہ وار

غُل ہوا، سید والا کا ولی جاتا ہے
لو! طرف دار حسین ابن علی جاتا ہے

حُر نے نعرہ کیا ، یا حیدرصفدر، مددے! | وقت امداد ہے، یا فاتح خیبر، مددے!
زوج زہرا مددے ، نفس پیمبر مددے! | بندۂ آل ہوں، یا خواجۂ قنبر مددے!

تن تنہا ہے غلام، اوربہت اظلم ہیں
آئی آواز کہ اے حُر! ترے حامی ہم ہیں

مل گئی راہ خدا، واہ رہے ، اقبال ترا　　پاک عصیاں سے ہوا نامۂ اعمال ترا
جرم ماضی ہوئے سب عفو، خوشا، حال ترا　　جلد جا جلد، کہ شائق ہے مرا لال ترا
مرد ہے، جس کی یہ ہمت، یہ ارادہ ہوئے
ہاں بہادر، تیری توفیق زیادہ ہوئے!

منتظر ہیں ترے سب فوج حسینی کے جواں　　در فردوس پہ، مشتاق کھڑا ہے رضواں
راہ تکتی ہیں تری ، دیر سے حوران جناں　　شورکوثر پہ ہے ، شبیر کا مہماں ہے کہاں؟
فوج قدسی تری ہمت کی ثنا کرتی ہے
فاطمہ، آج ترے حق میں دُعا کرتی ہے

اور بالیدہ ہوا، سن کے یہ مژدہ وہ ہژبر　　دل بے تاب پکارا کہ نہیں طاقت صبر
اب تواس فوج میں اک دم کی بھی تعویق ہے جبر　　قعر دوزخ ہے مسلماں کے لئے صحبت گبر
ہاں اٹھاباگ جو شیدائے شہ عالی ہے
فوج اللہ ونبی میں تری جا خالی ہے

سن کے یہ، باگ جولی ، اسپ سبک تاز اڑا　　ڈر سے رنگِ عمر شعبدہ پرواز اڑا
کیا اڑا رخش کہ طاؤس بہ صد ناز اڑا　　دی پرندوں نے یہ آواز کہ شہباز اڑا
باغ زہرا میں نسیم سحری جاتی ہے
غل تھا، دربار سلیماں میں پری جاتی ہے

کیا دوتین رسالوں نے تعاقب ہر چند　　حُر کاہاتھ آنا تو کیسا، نہ ملی گرد سمند
کہتے تھے شرم سے وہ، لے کے جودوڑے تھے کمند　　یہ چھلاوا تھا ، کہ آندھی، یہ فرس تھا کہ پرند

کیا سبک سوے چمن بادِبہاری پہنچی
ہم یہیں رہ گئے، واں حُر کی سواری پہنچی

ہنس کے عباس سے فرمایا کہ اے غیرت ماہ! یاں ہوئے علم امامت سے شہ دیں آگاہ
میرے لشکر کی طرف ہے رُخ حر ذی جاہ سب سے کہہ دو کہ نہ روکے کوئی اس شخص کی راہ
جاؤ لینے کو ، عجب رُتبہ شناس آتا ہے
میرا مہماں، میرا عاشق، میرے پاس آتا ہے

ذکر یہ تھا کہ صدا دور سے آئی اک بار الغیاث، اے جگروجان رسولِ مختار!
مجرم ایسا ہوں کہ عصیاں کا نہیں جس کے شمار عفو کر عفو کر، اے چشمۂ فیضِ غفار
پار دریاے خطا سے مری کشتی ہوجائے
دوزخی بھی ترے صدقے میں بہشتی ہوجائے

کئی روزوں سے تلاطم میں ہوں اے شاہنشاہ مددائے نوح غریباں، مرا بیڑا ہے تباہ
دست وپا گم ہیں کچھ ایسے کہ نہیں سوجھتی راہ شور کرتا ہوں کہ بتلائے کوئی جائے پناہ
ابر رحمت کی طرف جا، یہ صدادیتے ہیں
سب ترے دامن دولت کا پتا دیتے ہیں

اے مددگار و معین الضُّعفا! اَدرِکنی، اے خبر گیر گروہ غربا، ادرکنی!
پانو لغزش میں ہیں اے دست خدا! ادرکنی ہاتھ باندھے ہوں میں، اے عقدہ کشا ادرکنی
دیجئے حُر کو سند، نار سے آزادی کی
آیئے، جلد خبر لیجئے فریادی کی

استغاثہ یہ کیا حُرنے جو بادیدۂ نم آگیا جوش میں اللہ کا دریاے کرم
خود بڑھے ہاتھوں کو پھیلائے شہنشاہ اُمم حُر کو یہ ہاتف غیبی نے صدا دی اُس دَم

شکر کر، سبط رسول الثقلین آتے ہیں
لے بہادر! ترے لینے کو حُسین آتے ہیں

حُر نے دیکھا کہ چلے آتے ہیں پیدل شبیر ‌ ‌ ‌ ‌ دوڑ کر چوم لیے پائے شہ عرش سریر
شہ نے چھاتی سے لگا کر کہا، اے باتوقیر! ‌ ‌ ‌ ‌ میں نے بخشی، مرے اللہ نے بخشی تقصیر

میں رضامند ہوں، کس واسطے مضطر ہے تو
مُجھ کو عباس دلاور کے برابر ہے تو

حر پکارا، بِاَبِی اَنتَ وَ اُمّیِ یا شاہ! ‌ ‌ ‌ ‌ قابل عفو نہ تھے بندۂ آثم کے گناہ
مجھ سے گم راہ کو اک آن میں مل جائے یہ راہ! ‌ ‌ ‌ ‌ سب ہے صدقہ انہی قدموں کا خدا ہے آگاہ

مہر ذرّے پہ جو ہو ، نیرّ تاباں ہوجائے
آپ جس مور کو چاہیں وہ سلیماں ہوجائے

شہ نے فرمایا کہ خالق کی عنایت ہے یہ سب ‌ ‌ ‌ ‌ دے کسی شخص کو، بندے میں یہ مقدور ہے کب
اس مُسبّب کی عنایت کے یہ سارے ہیں سبب ‌ ‌ ‌ ‌ وہی منعم ، وہی محسن، وہی رازق، وہی رب

اپنے کیسے سے نہ دام اور درم دیتے ہیں
جب وہ خالق ہمیں دیتاہے تو ہم دیتے ہیں

کہہ کے یہ، ساتھ لیے حرکو چلے شاہ اُمم ‌ ‌ ‌ ‌ ہاتھ میں ہاتھ تھا مہمان کا، اللہ رے کرم!
راس وچپ قاسم واکبر تھے، زہے شان وحشم ‌ ‌ ‌ ‌ سر پہ کھولے ہوئے تھے حضرت عباس علَم

دور سے اہل خطا تیر جو برساتے تھے
رُفقا، سایے میں ڈھالوں کے لئے آتے تھے

لائے اس عزت وحرمت سے جومہماں کوامام ‌ ‌ ‌ ‌ بولے عباس ، کمر کھول اب اے نیک انجام
شہ نے فرمایا ، مناسب ہے کوئی دم آرام ‌ ‌ ‌ ‌ عرض کی حرنے ، کمر خلد میں کھولے گا غلام

فاتحہ پڑھ کے ، یہ شمشیر وسپر باندھی ہے
آج اس عزم پہ خادم نے کمر باندھی ہے

ہے بہت شمر وعمر سے مجھے لڑنے کی اُمنگ ایک ہی وار میں دونوں کو کروں گا چورنگ
لشکر شام سے پیہم چلے آتے ہیں خدنگ شاہ زادوں کی سپر ہوں کہ عبادت ہے یہ جنگ
کہیں ایسا نہ ہو، بچہ کوئی بے جاں ہوجائے
پہلے یہ تازہ غلام آپ پہ قربان ہوجائے

شہ نے فرمایا کہ دُشوار ہے فرقت تیری مجھ کو مرکر بھی نہ بھولے گی، محبت تیری
وادریغا، ہوئی کچھ ہم سے نہ خدمت تیری خیر، فردوس میں ہوجائے گی دعوت تیری
آج رُتبہ ترا خیل شہدا میں ہوگا
شب کو تو صحبت محبوب خدا میں ہوگا

تجھ سے مخفی نہیں، ہفتم سے جو کچھ ہے مرا حال راہیں ہر سمت کی روکے ہوئے ہیں اہل ضلال
قحط پانی کا ہے اس دشت میں، گندم کا ہے کال نان جو کا بھی ہے ملنا کسی قریے میں محال
سب کو ایذا ، عوض آب وغذا ملتی ہے
دودھ اصغر کو، نہ عابد کو دوا ملتی ہے

حرنے روکر سر تسلیم جھکایا بہ ادب شہ نے رومال رکھا آنکھوں پہ، رونے لگے سب
جب چڑھا گھوڑے پہ وہ عاشق سلطان عرب شاہ بولے کہ عجب دوست چھٹا ہائے غضب
دم بہ دم یاں سے جو آواز بکا جاتی تھی
گریۂ آل محمدؐ کی صدا آتی تھی

حرؒ چلا فوج مخالف پہ اڑا کر توسن چوکڑی بھول گئے جس کی تگاپو سے ہرن
وہ جلال اور وہ شوکت، وہ غضب کی چتون ہاتھ میں تیغ، کماں دوش پہ، برمیں جوشن

دو۲ سِرے دوش پہ شملے کے جو بل کھاتے تھے
کاکل حور کے سب پیچ کھلے جاتے تھے

زور بازو کا نمایاں تھا، بھرے شانوں سے — دست فولاد دبا جاتا تھا ، دستانوں سے
برچھیوں اُڑتا تھا، دب دب کے فرس رانوں سے — آنکھ لڑ جاتی تھی ، دریا کے نگہبانوں سے
خود رومی کی جو ضوتابہ فلک جاتی تھی
چشم خورشید میں بجلی سی چمک جاتی تھی

نیزۂ حر کی سناں پر ، نہ ٹھہرتی تھی نگاہ — تھا یہ ظاہر کہ نکالے ہے زباں مارسیاہ
قبضۂ تیغ پہ رکھے تھے، سرعجز پناہ — آفتابی وہ سپر، جس سے خجل گروۂ ماہ
قدر اندازوں کو جانوں کے ادھر لالے تھے
تیر ترکش میں نہ تھے ،آگ کے پرکالے تھے

13.2.1:متن کی تدریس

تمہید:۔میر ببرعلی انیسؔ جو۱۸۰۲ء میں فیض آباد(اتر پردیش) میں پیدا ہوئے اور۱۸۷۴ء حیدرآباد (لکھنؤ) میں انتقال کر گئے مشہور مرثیہ گو میر خلیقؔ کے جزادے تھے۔انیسؔ نے اردو مرثیہ گوئی کو بام عزوج تک پہنچایا۔منظرنگاری، واقعہ نگاری، جذبات نگاری،کردارنگاری، تخئیل کی بلندی، آفاقی واخلاقی اقداراورنفسیاتی عناصران کے مرثیوں کی اہم خصوصیات ہیں۔''یہ خدا، فارس میدان تہور تھا حر'' میرانیسؔ کا وہ شہرت یافتہ مرثیہ ہے جس کے مطالعہ سے ان کی شاعرانہ خصوصیات کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔میرانیسؔ نے یہ مرثیہ حضرت حرجن کا شمار کوفے کے رؤسا میں ہوتا تھا کی تعریف میں لکھا ہے کہ کس طرح حضرت حرنے ابن زیاد کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے حضرت امام حسینؑ مع قافلے کو کربلا کے صحرا میں پانی سے دور ٹھہرایا اور بالآخر حسینیؑ قافلے سے جاملنے کے بعد امام حسینؑ سے اجازت لے کر میدان جنگ میں نہایت بے جگری سے دشمنوں سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

طوالت سے بچتے ہوئے اس مرثیے کے کچھ بندوں کی تشریح کی جارہی ہے اور ہر بند کا پہلا مصرعہ اشارے کے طور پر دیا جارہا ہے تاکہ اس بند کو اسی مصرعے سے سمجھا جائے۔

بندنمبر۱:۔ بہ خدا فارس میدان تہور تھا حُر

خدا کی قسم فارس کے میدان میں حُر ایک دو نہیں بلکہ لاکھ شہ سواروں میں ایک انتہائی بہادر تھا یعنی وہ بے نظیر بہادر تھا۔اس کی طبیعت پاکیزہ تھی اور وہ نیک اعمال کا مالک تھا۔حر میں بھی وہی اوصاف تھے جو حضرابوذرؓ میں تھے، گویا وہ بھی حضرابوذرؓ کی طرح آتش جہنم (نار سعیر) سے آزاد تھا۔حر آسمان کے سر کے تاج کے موتی کی مانند تھا اسے تب کامیابی نصیب ہوئی جب اس نے حق کا راستہ اختیار کیا۔

بندنمبر۲:۔ واہ رے طالع بیدار، زہے عزّت وجاہ

مرحبا اللہ رے حر کی یہ خوش نصیبی اور یہ عزت ومرتبہ۔آفرین! خدا نے یہ کرم کیا کہ حُر کے استقبال کے لئے عرش کو پناہ دینے والے بادشاہ (حضرت امام حسینؑ) خود گئے گوا تقدیر کے رہنما (قسمت لکھنے والے) نے اسے جنت کا راستہ بتادیا۔اگر حُر کی طرح تقدیر وقسمت ہوں تو عرصہ سے جدار ہنا والا بھی پاس ہوجاتا ہے۔یعنی ہر کوئی اپنے مقصد میں کامیاب ہوسکتا ہے۔

بندنمبر۳:۔ آیا کس شان سے کعبے کی طرف چھوڑ کے دیر

حُر اس عظمت سے بت خانہ کو چھوڑ کر خدا کے گھر کی طرف آیا گویا کہ حضرت امام حسینؑ کے کسی بھی عزیز نے اسے دشمن تصور نہیں کیا۔انصاف نے چونکہ حر کی قسمت میں جنت کی چہل قدمی (تفریح) لکھ دی تھی جس کی وجہ سے وہ (حُر) فساد و برائی سے بچ گیا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔اچھے کام ہر دور میں کارآمد ثابت ہوتے ہیں اور عابد کی نیکیوں کا ذکر اس کے مرنے کے بعد بھی کیا جاتا ہے۔

بندنمبر۴:۔ حُر کہاں اور کہاں احمد مرسل کا خلف

حالانکہ حر اور حضرت محمدؐ کے جانشین (امام حسینؑ) میں فرق عظیم تھا لیکن حر کی تقدیر نے اسے مدت سے اصلی مقصد کی طرف راغب کردیا۔حر کا دل جب سینے میں پاک ہوا تب جاکر اسے یہ مرتبہ نصیب ہوا یعنی جس وقت اس نے نظروں سے سچائی کو پہچانا تو اس وقت اصلی نسل سیدّ (امام حسینؑ) سے ملاپ ہوا۔دراصل اچھائی کے جو کام ہیں وہی ارادے پر قائم رہتے ہیں اور خدا کی مرضی سے ہی بگڑے ہوئے کام بھی بنتے ہیں یعنی اس کی مرضی کے بغیر پتا بھی نہیں ہل سکتا۔

بندنمبر۵:۔ وصف حُر میں ہے زباں معترف عجز وقصور

شاعر فرماتے ہیں کہ میں اعتراف کرتا ہوں کہ حر کی صفت (پاکیزگی) بیان کرنے میں میری زبان کمزور ہے اور چوک سکتی ہے یعنی میری

زبان میں وہ دم نہیں کہ حُر کی صفت بیان کرسکے لیکن اس کے باوجود اس مرحلے پر بہادر (حُر) کے آنے کا چرچہ سنو۔ جس فوج پر خدا کا قہر تھا (ظالم یزید کی فوج) جس وقت وہ لڑائی کے لئے ہوشیار ہوئی تو حضرت امام حسینؑ (آسمانوں کی رہنمائی کرنے والا سورج) نے بھی میدان جنگ میں تشریف لائی۔ ستارے کی مانند حضرت اما حسینؑ کے روشن چہرے کو دیکھ کر آواز بلند ہوئی کہ آسمان دیکھ لے زمین پر بھی ستارے جلوہ افروز ہیں یعنی خدا کے لاڈلے لڑائی کے لئے سامنے آئے ہیں۔

بندنمبر۶:۔ کیا کہوں شان جوانان جنودِ اللہ

شاعر فرماتے ہیں کہ خدا کے لشکر کے جوانوں (امام حسینؑ اور ان کے ساتھ) کی کیا شان وشوکت بیان کروں۔ ان میں کوئی سورج کا م شکل تھا اور کوئی خوبصورتی میں چاند کو بھی سرمندہ کررہا تھا گویا خوبصورتی میں وہ بے نظیر تھے۔ میدان جنگ کے بیچ میں جس وقت ان بہادروں نے قطار باندھی تو اس وقت جنت کے باغ کی حوریں (جنت کی خوبصورت عورتیں) بھی نظارہ کرنے لگیں۔ دوسری اور جب کم بختوں (یزید کے سپاہی) نے ظلم وستم ڈھانے شروع کئے تو اس طرف حضرت عباسؑ نے آگے نکل کر ہرا جھنڈا لہرایا یعنی جھنڈا بلند کیا۔

بندنمبر۷:۔ ہوگئے سرخ شجاعت سے رُخ آل نبی

قوم سادات (امام حسینؑ اور ان کے عزیزوں) کے چہرے بہادری سے سرخ ہو گئے تھے اور ٹھنڈی ہوا کا ایک ایسا جھونکا آیا کہ وہ پیاس بھی بھول گئے۔ میدان جنگ میں جب رجز ہوا تو ٹھہرے (رک) ہوئے ڈھول بھی بجنے لگے اور بہادروں نے جنگ کے لئے اپنے مقابل حریف کو طلب کرنے کی آواز بھی بلند کی۔ تلوار کا وار روکنے والے ہتھیاروں (ڈھالوں) اور ہر قطار میں آسمانی بجلی کی طرح چمکنے والی تلواروں سے بدبختوں (یزید کی ظالم فوج) راس قدر طاری ہوئی گویا جیسے انہیں بادلوں نے گھیر لیا۔

بندنمبر۸:۔ برچھیاں تول کے ہرغول سے خوں خوار بڑھے

خنجر ہاتھوں میں لئے ہوئے جب ہر گروہ سے ستم گر نمودار ہوئے تو گھوڑ سوار بھی برچھیا ہاتھوں میں لے کر سامنے آئے۔ کمان برداروں (تیز انداز سپاہی) کو چلوں پر تیر جوڑے دیکھ کر بادشاہ (امام حسینؑ) کہنے لگے کہ ہماری اور سے ہرگز کوئی پہل قدمی نہ کرے کیونکہ میں نبیؐ کے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں اس لئے برتری مجھے پسند نہیں اور ویسے بھی میدان جنگ میں پہل قدمی کرنا خدا کے شیر (حضرت علیؑ) کے خاندان کی شان کے خلاف ہے۔

بند نمبر ۹:۔ یہ سخن کہہ کے، مخاطب ہوئے اعدا سے امام

اپنی سپاہ سے یہ کلام کہہ کہ امام حسینؑ دشمنوں سے متوجہ ہوئے کہ اے عرب، روم، رے، کوفہ اور شام کی فوج، حسینؑ کا تم پر یہ آخری تکرار ہے۔ چونکہ میں حضرت علیؑ (بولتا ہوا قرآن) کا فرزند ہوں لہٰذا میری بات سنو۔ سچائی کی بات سننے کے لئے اپنے کانوں کو مشغول کرو اور بہتر یہی ہے کہ باجوں کے شور کو ذرا روک دو یعنی باجوں کی آواز کو ذرا دھیما کر دو۔

بند نمبر ۱۰:۔ یہ صدا سنتے ہی، خود رُک گیا قرنا کا خروش

حضرت امام حسینؑ کی یہ آواز سنتے ہی خود بخود ترسنگے کی آواز بھی ٹھہر گئی اور جنگی ڈھول کی وہ جوشیلی صدا بھی رک گئی۔ جھانجھیں بجانے والا بھی اپنے ہاتھوں کو جوڑ کر چپ ہو گیا۔ گویا سب کے ہوش وحواس اڑ گئے تھے اس لئے وہ بجانے کے قابل نہیں تھے اور نغمے (گیت) انہیں اس لئے بھی ناموافق ہوئے کیونکہ حضرت علیؑ کے فرزند (امام حسینؑ) کی دہشت نے ان کی آواز پر سرمے کا کام کیا یعنی جس سرمہ کھانے سے گلا بیٹھ جاتا ہے ٹھیک اسی طرح امام حسینؑ کے خوف سے ان کی آوازیں بھی رک گئیں۔

بند نمبر ۱۱:۔ کم ہوا غلغلۂ فوجِ ستم جب اِک بار

جب اچانک ظالم فوج کا شور کم ہوا تو اس طرح باشاہ (امام حسینؑ) مخاطب ہوئے کہ گویا جیسے ان کے ہونٹوں سے موتی برس رہے تھے۔ کہنے لگے کہ اے بدکردار فوج یہ قطار کس کے لئے باندھی ہے یعنی کس کے ساتھ لڑنے کے لئے تیار ہوئے ہو۔ رسولؐ کی اولاد کو قتل کرنے کا فوج میں کیسا شور ہے؟ مسافروں (حسینؑ لشکر) پر پانی یہ بندش کیوں ہے؟ کیا اس دور میں مہمان نوازی کا یہی دستور ہے؟

بند نمبر ۱۲:۔ مجھ کو لڑنا نہیں منظور، یہ کیا کرتے ہو

حضر امام حسینؑ نے کہ کہ جنگ کرنی مجھے قبول نہیں تم یہ کیا کر رہے ہو۔ تم نے جو تیر کمان میں ملائے ہیں غلط کر رہے ہو۔ مسافری میں حضرت محمدؐ کے جانشین (وراث) پر تم ظلم وزیادتی کر رہے ہو، دیکھ لینا، اس کے نتائج برے نکلے گے۔ چونکہ میں مدینہ کا چراغ ہوں لہٰذا اگر میرا قتل ہو گیا تو فقیروں کی گدڑی فوراً پلٹ جائے گی۔ شاعر نے یہاں دشمنوں کے سپاہیوں کو فقیروں کی گدڑی سے تعبیر کیا ہے۔

بند نمبر ۱۳:۔ میں ہوں سردارِ شباب چمن خلد بریں

حضرت امام حسینؑ کہنے لگے کہ میں (امام حسینؑ) فردوس اعلیٰ کے باغ کے جوانان کا حاکم ہوں (میر انیسؒ کا یہا اشارہ رسولؐ کے اس قول کی طرف ہے یعنی حضرت امام حسنؑ وحسینؑ جو حدیث شریف کے مطابق جوانان اہل جنت کے سردار ہوں گے) خدا کی قسم! میں حضرت محمدؐ

کے کندھے پر رہنے والا اوران کی انگلی کی انگوٹھی کا نگینہ ہوں، آسمان اورزمین کی تابانی میری وجہ سے ہے۔اگر میری روشنی نظروں سے اجھل ہوجائے گی تو دنیا کی مجلس میں تاریکی چھاجائے گی یعنی زمین وآسمان میں اندھیرا چھاجائے گا۔

بندنمبر۱۴:۔ قلزم عزّ وشرف کا دُرِشہوار ہوں میں

میں (امام حسینؑ) اتھاہ سمندر کے اس اعلیٰ موتی کی مانند ہوں جس کی وجہ سے سمندر کی شان وشکوہ ہے۔میں وہ حاکم وقت ہوں جس کے ماتحت ساری دنیا ہے۔آج اگر چہ بھلائی کی بنیاد پر مجبور ہوں۔حضرت محمدؐ کے نمائندے (حضرت علیؑ) کا وارث ہونے کے ناطے میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ ایمان کی نعمت بھی میری اسی انصاف گاہ میں ہے اوراعلیٰ بزرگوں کا تحفہ بھی میری بارگاہ میں ہے۔

بندنمبر۱۵:۔ یہ قبا کس کی ہے، بتلاؤ، یہ کس کی دستار

حضرت امام حسینؑ بدبختوں سے مخاطب ہوکر کہنے لگے کہ بتاؤ، یہ لباس اورعمامہ کس کا ہے؟میں نے اپنے زخمی سینے پر جوفولاد کا جالی دار کرتا پہنا ہوا ہے یہ کس کا ہے؟ چھاتی میں پہنا ہوا یہ خوبی والا زرّہ بکتر کس کا ہے؟ آج میں جس گھوڑے سوار ہوں یہ کس کا ہے؟ میرے سر پر یہ لوہے کی ٹوپی اور ہاتھ میں دوشاخہ تلوار کس کی ہے؟ کس سورما کی یہ دھنش اورڈھال ہے؟

بندنمبر۱۶:۔ تنگ آئے گا تو رُکنے کا نہیں پھر شبیر

اگرشبیر (امام حسینؑ) مجبور ہوجائے گا تو باز نہیں آئے گا اور میرے ایک ہی وار میں یہ دولاکھ مغرور نست ونابود ہوجائیں گے یعنی حضرت امام حسینؑ دشمنوں سے کہنے لگے کہ تم مجھے مجبور مت کرو اوراگر میں تنگ آ گیا تو مجھے کوئی نہیں روک پائے گا، تم تباہ وبرباد ہوجاوگے۔تمہاری کلہاڑی تلوار اور تیر مجھے کوئی زد نہیں پہنچا سکتے۔میری یہ کاٹ کرنے والی تلوار (براں شمشیر) تم سب سرکشوں کے سرقلم کردے گی۔چونکہ میں بہادر ہوں اورابی طالبؑ کا نورنظر ودل کا ٹکڑا ہوں، اس لئے ہر حال میں جیت میری ہی ہوگی۔

بندنمبر۱۷:۔ مجھ کو ہوتا نہ اگر بخشش امت کا خیال

اگر مجھے قوم کو معاف کرنے کا خیال نہ ہوتا تو حُر کی کیا بساط تھی کہ وہ مجھے راستے میں ٹھہراتا اورآسمانی بجلی کی طرح تیز رفتار میرے گھوڑے کی لگام کوروک سکتا۔حُر سے دریافت کرلو خوداس نے میرے بہادروں کا دبدبہ دیکھا ہے۔بات چیت میں اگر ہم بیچ نہ آتے تو میرے سپاہیوں کے ایک ہی حملے سے ان (حُر اوراس کا لشکر) کے ہاتھ جڑ سے کٹ جاتے۔

بندنمبر۱۸:۔ غیظ سے ہونٹ چباتے تھے علی کے دل دار

حضرت علیؑ کے معشوق (امام حسینؑ کا لشکر) سخت غصے سے ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹ رہے تھے اور گھڑی گھڑی حضرت زینبؑ کے بیٹے (عونؑ اور محمدؑ) تلواریں ہاتھ میں اٹھاتے تھے۔حضرت حسینؑ کے فرزند یعنی حضرت قاسمؑ کی تلوار خود بخود بے میان ہورہی تھی۔جب میں نے انہیں آقا کا حلف دیا تو وہ بہادر پیچھے ہٹ گئے۔اگر تلوار رواں ہوتی یعنی اگر ان کی تلوار کا وار ہوجاتا تو نہ صرف صحرا الٹ پلٹ ہوتا بلکہ پھر نہ تو حُر دنیا میں ہوتا اور نہ ہی اس کی گھوڑسوار فوج کا دستہ، گویا مع فوج کا دنیا سے نام ونشان مٹ جاتا۔

بندنمبر۱۹:۔ تھا یہ بپھرا ہوا عباس، مرا شیر جواں

میرا بہادر جوان عباس غصے میں بھرا ہوا تھا۔وہ حُر کی چھاتی پر خنجر کی نوک رکھ دیتا تھا اور میں اسے اشارے سے منع کرتا تھا کہ اے پیارے بھائی ہمارے لئے انصاف کرنا اس لئے لازم ہے چونکہ ہم دونوں جہاں کے پیشوا (ہادی) ہیں۔کوئی اندیشہ نہیں اگرچہ ہمارا سر دھڑ سے الگ کیوں نہ ہوجائے لیکن ہمارے ہاتھ سے کوئی شخص نہیں مرنا چاہئے۔

بندنمبر۲۰:۔ گرچہ یہ امر نہیں اہل سخا کے شایاں

اگرچہ یہ فعل فیاضی کو زیبا نہیں دیتا کہ کسی آدمی کو کچھ دینے کے بعد سب پر ظاہر کرے۔حُر چونکہ سامنے ہے اس لئے ظاہرہ اور اعلانیہ چیز کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔اس سے دریافت کرلو کہ اسی صحرا میں وہ فوج کے سمیت پیاسا تھا۔پیاس کی شدت سے سب کی زبانیں باہر نکل گئی تھیں اور یہی چرچا تھا کہ سب کا دم نکل جائے گا۔

بندنمبر۲۱:۔ زیست ہر شے کی ہے پانی سے، شجر ہو کہ بشر

درخت ہو یا پھر انسان غرض ہر چیز کی زندگی پانی سے ہے۔چونکہ میں (حضرت امام حسینؑ) فیاضی کا فرزند ہوں لہٰذا مجھ سے رہا نہ گیا۔میں نے مایوس ہوکر بہادر عباسؑ سے دریافت کیا کہ پانی کے تھیلے والے کس جگہ ہیں اور پانی لانے والا اونٹ کس طرف ہیں۔اے بھائی، حضرت علیؑ کے احسان کو پیش کرو یعنی ان کی نصیحت پر عمل کرو اور جتنا بھی پانی ہے وہ سارا پیاسوں کو پلا دو۔

بندنمبر۲۲:۔ رہ نہ جائے کوئی گھوڑا، کوئی ناقہ بے آب

میرا دل بے چین ہے کہ کوئی گھوڑا یا کوئی سانڈنی پانی کے بغیر نہ رہ جائے۔لہٰذا فوراً چھوٹی مشکیں طلب کرو۔میرے حکم کی تعمیل کرتے

ہوئے بہشتی پانی کے کھالوں کے دہانے کھول کر جلد تشریف لائے۔ وہ نیکی کا کام تھا اس لئے میں خود مخاطب ہوا۔ ان کو آرام دئے بغیر مجھے سکون نہ آیا گویا جس کو ایک گلاس پانی کی پیاس تھی اسے دو گلاس دئے۔

بند نمبر ۲۳:۔ تھی یہی فصل، یہی دھوپ، یہی گرم ہوا

ایسا ہی سماں تھا، ایسی ہی دھوپ اور گرم ہوا تھی۔ حُر کے ساتھی ٹھنڈے پانی کے لئے تڑپتے تھے۔ پیاسوں کی اس قدر بھیڑ تھی کہ گویا کہیں جگہ نہیں ملتی تھی۔ بہشتی پانی کے کٹورے بھر بھر کر یہ آواز دیتے تھے کہ حضرت علیؑ کے فرزند کا فیض کا چشمہ بہہ رہا ہے، دوستوں آؤ جسے پانی کی خواہش ہے پوری کرو۔

بند نمبر ۲۴:۔ آبِ شیریں کا جو دریا ہوا جنگل میں رواں

جب میٹھے پانی کا دریا صحرا میں جاری ہوا تو گھوڑا، اونٹ اور خچر غرض کوئی بھی جانور پیاسہ نہ رہا۔ ہر ایک تشنہ زبان پیاس بجھانے کے بعد احسان مند ہوئی۔ سپاہی (حُر کا لشکر) پانی پی پی کر مجھے دعائیں دے رہے تھے اور چرچا تھا کہ حضرت علیؑ کے فرزند اور شاہ دو عالم نے معافی کی ہے۔

بند نمبر ۲۵:۔ ایک دن وہ تھا، اور اک دن یہ ہے اللہ اللہ

ہائے ہائے! ایک دن وہ تھا اور ایک آج کا دن ہے یعنی جس طرح اس دن حُر اور اس کے لشکر کو پانی کی چاہت تھی ٹھیک اسی طرح ہمیں بھی آج پانی کی خواہش ہے۔ آج ہم امید کس پر کریں چونکہ سب نے نظریں ہٹا دی ہیں یعنی سب نظریں چرا رہے ہیں۔ حالانکہ خدا کے نائب کا وارث ہونے کے ناطے قوم کے ہر فرد پر میرا اختیار ہے لیکن ہائے افسوس کوئی بھی شخص ہمیں ایک گلاس بھی پانی نہیں دے رہا ہے۔ مجھے اس وقت سخت صدمہ پہنچتا ہے جب معصوم روتے ہیں۔

بند نمبر ۲۶:۔ کئی طفل اِن میں ہیں کم سن کہ موئے جاتے ہیں

ان میں کچھ بچے چھوٹے چھوٹے ہیں جو پیاس سے تڑپ رہے ہیں اور پیاس کی شدت سے جب ان پر بے ہوشی طاری ہوتی ہے تو میرا سانس چڑھ جاتا ہے۔ پانی پانی کرتے وہ اس لئے شرما جاتے ہیں چونکہ دریا نزدیک ہونے کے باوجود انہیں ایک قطرہ بھی پانی کا میسر نہیں ہوتا۔ بھوکے پیاسے ہمارا تیسرا دن گذر رہا ہے اور یہ سچائی ہے کہ مسافرت کا ہر وقت پریشان کن ہوتا ہے۔

بند نمبر ۲۷:۔ شہ کی مظلومی پہ گریاں ہوئی ظالم کی سپاہ

بادشاہ کی مظلومیت دیکھ کر شریر کی فوج نالاں ہوئی۔عمر بن سعد نے مڑ کر جب حُر کے چہرے پر نظر ڈالی تو حُر مخاطب ہوا کہ خدا کو حاضر ناظر رکھ کر میں گواہی دیتا ہوں کہ بادشاہ (حضرت امام حسینؑ) کا مرمان درست ہے۔ یہ عزت و مرتبے والا میرا مالک ہے یعنی مجھ کو نعمت دینے والا آقا ہے۔ان کے کرم کا کس طرح کوئی انکار کرے چونکہ یہ حقیقت ہے اور سچائی کے قول میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔صرف سچائی کے قول میں وہی شخص شبہ کرتا ہے جو بے دین ہوتا ہے۔

بند نمبر ۲۸:۔ ایک میں کیا ہوں زمانے پہ ہے احساں ان کا

صرف مجھ پر ہی نہیں بلکہ پوری دنیا پر ان کا کرم ہے۔ یہ رحمت کا بادل ہیں اور ان کا دامن دوسروں کی غلطیو کو چھپانے والا ہے۔دنیا کی تمام خلقت پر ان کا ایک جیسا احسان ہے۔وہ شخص بڑا خوش قسمت ہے جسے مسافرت میں ان (امام حسینؑ) کی میز بانی نصیب ہو اور چونکہ حضرت امام حسینؑ سچائی کا مجسمہ ہیں لہٰذا جو ان کی طرف ہوگا خدا بھی اسی کا ساتھ دے گا۔

بند نمبر ۲۹:۔ ان سے قطرہ کوئی مانگے ،تو گہر دیتے ہیں

ان (امام حسینؑ) سے اگر کوئی ایک بوند پانی کی خواہش کرے تو وہ موتی نچھاور کر دیتے ہیں کیونکہ قول نبھانے والے ہیں ،فیاضی کے فرزند ہیں اور دیالو ہیں۔خود بھوکے رہنے کے باوجود چاہنے والے کو مالا مال کر دیتے ہیں۔حضرت امام حسینؑ عالم دو جہاں ہیں لہٰذا ان کی نصیحت پر عمل کرنے والا اس دنیا میں بھی کامیاب ہوتا ہے اور جنت میں بھی اسے رہنے کے لئے پناہ ملتی ہے۔ یہ خطا کار و گنہگار کی امید ہیں اور سورج کی مانند ہیں جو ہر چیز کو روشن کرتا ہے یعنی ناچیز کی بھی قدر کرنے والا ہے۔

بند نمبر ۳۰:۔ حُر پکارا کہ زباں بند کر،او ناہموار!

عمر بن سعد بد بخت بے قرار ہو کر حُر سے کہنے لگا یہ تو اعلانیہ بادشاہ (امام حسینؑ) کی حمایت کر رہا ہے۔اپنے حاکم و مالک کا تو نے نام تک نہ لیا۔واہ وا! امام حسینؑ کی نیکیوں کی اس قدر تعریف۔میں نے جان لیا ہے کہ چند راتوں سے تجھے پریشانی لاحق ہے جس کی وجہ سے تیری باتوں سے بھی بادشاہ کے واسطے محبت ظاہر ہو رہی ہے۔

بند نمبر ۳۱:۔ نہ وہ آنکھیں، نہ وہ چتون، نہ وہ تیور، نہ مزاج

نہ وہ نظریں اور نہ وہ تیوری ،نہ وہ چہرے کا طور اور نہ طبیعت ،معمولی باتوں پر بغاوت کرنا،ہم نے تیرا آج نیا طریقہ دیکھا۔کہیں

ایسا تو نہیں ہے کہ حضرت محمدؐ کے نواسے نے تجھے بادشاہت عطا کی ہے؟ امام حسینؑ نے تجھے کون سے گلزار کی لالچ دی ہے؟ کہیں تو جنت کی نہر کے دھوکے میں تو نہیں آیا ہے۔حُر یہ تیری بھول ہے جن کو دل سے تو مالدار سمجھ رہا ہے وہ تو خود خواہش مند ہے۔

بند نمبر ۳۲:۔ میں جہاں دیدہ ہوں، سب مجھ کو خبر ہے تیری

عمر بن سعد حُر سے کہنے لگے کہ میں تجربہ کار ہوں، مجھے تیرا سارا علم ہے۔ تجھے محمدؐ کی اولاد پر بھروسہ ہے اسی لئے تیرا منہ سوکھ رہا ہے اور تیری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے ہیں۔تو صرف جسمانی طور پر یہاں ہے، تیرا دل اس طرف ہے میں نے بھانپ لیا کہ راستے میں جو تیری مہمان نوازی ہوئی ہے اس کے عوض تو نے حضرت علیؑ کے فرزند سے خلاف قانون تال میل کیا ہے۔

بند نمبر ۳۳:۔ خیر مخفی نہ رہے گا یہ قصور اور فتور

بجا ہے کہ یہ خطا وخرابی پوشیدہ نہیں رہے گی۔اخبار کے منصب پر جن کی ذمہ داری ہے وہ ضرور تحریر کریں گے۔شام کے جابر بادشاہ (یزید) جب تیرے بارے میں پتہ چلے گا تو وہ یقیناً تجھے سزا دے گا۔ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ وہ تجھے سولی پر لٹکا دے گا نیز تیری نسل کا جو کوئی بھی ہوگا اسے قتل کیا جائے گا گویا تیرا اہل وعیال مصیبت میں مبتلا ہو جائے گا۔

بند نمبر ۳۴:۔ حُر پکارا کہ زباں بند کر، او ناہموار!

عمر بن سعد کے یہ کڑوے الفاظ سن کر حُر چلایا! چپ کر او نالایق۔تجھ پر اور تیرے حاکم پر دھکار ہے۔زہرؑا کا فرزاد (امام حسینؑ) حضرت محمدؐ کے سربراہ کار کا نور نظر ہے۔میری زبان میں وہ طاقت نہیں کہ جس سے اس ولی اللہ کے امام کی تعریف کرسکوں۔پوری دنیا کیا بلکہ خدا خود بھی قرآن پاک میں آل عبا (حضرت علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ) کی تعریف کرتا ہے۔

بند نمبر ۳۵:۔ وصف ایسوں کا زباں پر کوئی کیوں کر لائے

ایسے لوگوں کی خوبی کوئی منہ سے کیسے بیان کرسکتا ہے جن کی ثنا میں قرآن پاک میں تین سو آیتیں ہوں۔کیا دنیا میں کوئی ایسا آدمی ہے، جس کو اس قدر شہرت ملی ہو اور جس کو خدا نے اپنا دوست قرار دیا ہو آل رسولؐ کی محبت میں جو کوئی قربانی دے تو وہ بڑا خوش نصیب ہوگا یعنی اس شخص کی صحبت کرو جس کے اعمال نیک ہوں۔اور بدکار کی صحبت کرنا باعث شرم ہے۔

بند نمبر ۳۶:۔ دولت حاکم دوں پر ہے ترا دارو مدار

حُر عمر بن سعید سے کہنے لگا کہ حکمران حقیر کی دولت پر تیرا بھروسہ ہے۔ جو مذہب کا پابند ہوتا ہے وہ تو دنیا سے بالکل بے پرواہ

ہوتا ہے۔ وہ ظالم بے وفا مجھے کیا پانسی دے گا۔ وہ تو خود غفلت کی نیند میں سویا ہوا ہے یعنی اس کی یہ کم بختی ہے اور میری یہ خوش نصیبی ہے کہ میری قسمت بیدار ہے۔ میرے سر پر تو طوبیٰ کی صلیب کا سایہ ہوگا گویا جو شہرت مجھے نصیب ہوگی وہ کسی حاکم کے بھی حصے میں نہ آئی ہوگی۔

بند نمبر ۳۷:۔ عمل نیک سے بہکا نہ مجھے او ابلیس!

او شیطان! مجھے بھلائی کے راستے سے گمراہ مت کر۔ حضرت امام حسینؑ ہی دو جہاں کے مالک و سردار ہیں۔ تیرا کمینہ و مردود حکمران مجھے کیا دے گا۔ خبر نویس کو کہہ دینا کہ جو کچھ بھی میرے خلاف لکھنا ہے لکھ دیں اس کا مجھے کوئی اندیشہ نہیں۔ دیکھ ظالم! جو نہ کرنا تھا وہ میں کرنے جا رہا ہوں اور بے شک عرب کے بادشاہ کے فرزند (امام حسینؑ) کی طرف میرا رخ ہے یعنی میں اس کی طرف داری کرنے جا رہا ہوں۔

بند نمبر ۳۸:۔ کہہ کے یہ، ڈاب سے غازی نے نکالی تلوار

یہ بتا کہ بہادر (حُر) نے پیٹی سے تلوار نکالی۔ اچانک خفا ہوا اور غصے سے آنکھیں لال ہوگئیں۔ گھوڑے پر چڑھ کر جب اس نے اکڑ کر فرض شناس امام کی فوج کی طرف نظر ڈالی اور گھوڑا ابھی زمین پر درست قدم رکھنے لگا تو چرچا ہوا کہ متوجہ ہو! حضرت علیؑ کے فرزند کا حمایتی اور بلند عالی امام کا دوست رخصت ہو رہا ہے۔

بند نمبر ۳۹:۔ حُر نے نعرہ کیا، یا حیدر صفدر، مدد ے

حُر نے للکارا! اے فن جنگ کے ماہر (حضرت علیؑ) سہارا دے۔ اے خیبر کو فتح کرنے والے (حضرت علیؑ) سہارا دے کیونکہ یہ حمایت کا وقت ہے۔ حضرت زہرؑا کے شوہر (حضرت علیؑ) اور پیغمبر کی جان و روح (حضرت علیؑ) سہارا دے میں تیری اولاد کا غلام ہوں۔ اے حضرت علیؑ کی غلامی اختیار کرنے والے مجھے سہارا دے۔ کیونکہ خادم (حُر) اکیلا ہے اور ستم گر زیادہ ہیں۔ حُر کی پکار سن کر ایک آواز آئی کہ اے حُر تیرے مددگار ہم ہیں۔

بند نمبر ۴۰:۔ مل گئی راہ خدا، واہ رے، اقبال ترا

اس آواز میں حر کو یہ سنائی دیا کہ آفرین! یہ تیری خوش قسمتی خدا کے لئے راستہ مل گیا اور تیرا اعمال نامہ گناہوں سے پاک ہوگیا۔ گویا گزرے زمانے کی تمام غلطیاں معاف ہوگئیں اب تو خوشحال ہوا، فوراً جا میرا فرزند (امام حسینؑ) تیرا مشتاق ہے۔ جس شخص میں ایسی دلیری اور خواہش ہوتی ہے وہ بہادر ہوتا ہے اور بہادر کی رہنمائی بھی زیادہ ہوتی ہے لہٰذا تو بھی بہادر ہے اس لئے تیری قدر زیادہ ہوگی۔

بند نمبر ۴۱:۔ منتظر ہیں ترے سب فوج حسینی کے جواں

نہ صرف تمام ہاشمیؑ جوان تیرے انتظار میں ہیں بلکہ جنت کے دروازے پر کھڑا فرشتہ بھی تیرا آرزو مند ہے۔ مدت سے جنت کی

خوبصورت عورتیں تیرا راستہ دیکھ رہی ہیں اور جنت کی تہر پر تیرا یہ چرچا ہے کہ امام حسینؑ کا مہمان کدھر ہے۔فرشتوں کا لشکر تیری بہادری کی داد دیتا ہے اور حضرت فاطمہؑ تیرے لئے مناجات کر رہی ہے۔

بند نمبر ۴۲:۔ اور بالیدہ ہوا، سن کے یہ مژدہ وہ ہزبر۔

اور شیر ببر (حُر) یہ خوشخبری سن کر جوش سے پُر ہوا یعنی خوشی سے پھول گیا۔بے چین دل نے اسے للکارا کہ اب برداشت کا مادہ نہیں رہا، لہٰذا اس لشکر (یزید کی فوج) میں ذرا سی دیر کرنا اپنے آپ پر اس طرح ستم ہے جس طرح مسلم یقین والے کے لئے مغرور کا ساتھ دینا جہنم کی کھائی کے برابر ہے۔اگر تو بلند بادشاہ (امام حسینؑ) پر فریفتہ ہے تو فوراً گھوڑا دوڑا۔کیونکہ خدا! اور رسولؐ پاک کے لشکر میں تیرے لئے جگہ خالی ہے۔

بند نمبر ۴۳:۔ سن کے یہ، باگ جو لی، اسپ سبک تاز اڑا

یہ سن کر حُر نے جونہی باگ ہاتھ میں لی تو گھوڑا اس قدر تیز بھاگا کہ جس کے خوف سے عمر (سرکش) کے چہرے کا رنگ نظر بندی (جادو سے متعلق ہنر یا کھیل) کی طرح پرواز کر گیا۔مور کے انوکھے انداز کی طرح گھوڑا اڑ دوڑا تو پرندوں نے یہ چرچا کیا شکاری باز (بڑا باز) کی طرح تیز ہے حُر جب صبح کی تازہ اور ٹھنڈی ہوا کی طرح زہراؑ کے گلشن (حسینی قافلہ) میں جا پہنچا تو یہ چرچا ہوا گویا حضرت سلیمان کے دربار میں خوبصورت عورت تشریف لائی ہے۔

بند نمبر ۴۴:۔ کیا دو تین رسالوں نے تعاقب ہر چند

اگر چہ دو تین ہزار سپاہیوں (یزید کا لشکر) نے اس کا پیچھا کیا لیکن حُر کا ان کے ہاتھ آنا کیا بلکہ اس کے گھوڑے کے دوڑنے سے جو مٹی اڑی وہ بھی انہیں نصیب نہ ہوئی۔حُر کو پکڑنے کے لئے رسی لے کر دوڑے تھے وہ شرم سے یہ کہہ رہے تھے کہ یہ طلسم دکھانے والا کوئی مداری تھا یا پھر تیز ہوا۔وہ (حُر) گھوڑے پر سوار ہو کر اس طرح ہاشمی جوانوں میں جا ملا کہ جس طرح موسم بہار کی تازہ اور تیز ہوا باغ میں پہنچتی ہے۔

بند نمبر ۴۵:۔ یاں ہوئے علم امامت سے شہ دیں آگاہ

اس طرف جب دین کے بادشاہ یعنی امام حسینؑ رہنمائی کی دانش سے واقف ہوئے تو مسکرا کر حضرت عباسؑ سے کہنے لگے کہ اے چاند کو شرمندہ کرنے والے، میری فوج کی طرف عظمت والا حُر تشریف لا رہا ہے لہٰذا سبھوں کو آگاہ کر دو کہ اس کا راستہ نہ روکے۔حُر حریت کن مرتبے کو پہچاننے والا اور میرا چاہنے والا ہے، وہ میرا مہمان اور میری اور تشریف لا رہا ہے لہٰذا اس کے استقبال کے لئے جاؤ۔

بندنمبر ۴۶:۔ ذکر یہ تھا کہ صدا دور سے آئی اک با

چرچا یہ ہو رہا تھا کہ دور سے ایک دفعہ آواز آئی کہ اے حضرت محمدؐ کے وکیل کی روح وکلیجہ دہائی ہے کہ میں بے شمار گناہوں کا مالک ہوں۔اے فیض کے چشمے اورغلطیوں کو چھپانے والے معاف کر،معاف کر۔میرا بیڑا گناہوں کے دریا کے بھنور میں پھنسا ہے کیونکہ تیری خیرات سے جہنم والا بھی جنت رسید ہوتا ہے لہٰذا میری کشتی کو گناہوں کے دریا سے پار کرنے والا بھی تو ہی ہے۔

بندنمبر ۴۷:۔ کئی روزوں سے تلاطم میں ہوں اے شاہنشا

اے بادشاہوں کے بادشاہ! میں چندنوں سے پریشانی میں مبتلا ہوں اور میری کشتی برباہوچکی ہے یعنی تباہ ہوگیا ہوں لہٰذا اے غریبوں کے مسیحا(غریبوں کوتسکین دینے والے) مجھے سہارا دے۔میں اپنے ہوش وحواش کھوچکا ہوں اس لئے مجھے راستہ دکھائی نہیں دیتا۔میں پکار رہا ہوں کہ کوئی مجھے پناہ کے لئے جگہ کا پتہ دے اور مجھے یہ آواز دی جارہی ہے کہ کرم کے بادل کی طرف جاؤ، گویا تمام تیری (امام حسینؑ) سلطنت میں قیام کے لئے مشورہ دے رہے ہیں۔

بندنمبر ۴۸:۔ اے مددگار و معین الضُّعفا! اَدرِکنی،

حُر لگا تار یہ پکارتھی اے ضعیفوں کے مددگار اوراعانت کرنے والو! میری خبر لیجئے۔اے غریبوں کی جماعت کی خبر لینے والو! میری خبر لیجئے ۔میرے پاؤں لزرہے ہیں۔اے خدا کے ہاتھ! میری خبر لیجئے۔میں منت سماجت کرتا ہوں اے معما کو حل کرنے والے میری خبر لیجئے۔آگ سے چھٹکارا پانے (مصیبت سے نجات دلانے) کی حُر کو تصدیق نامہ دیجئے۔لہٰذا فریاد کرنے والے کی خبر گیری آخر فوراً لیجئے۔

بندنمبر ۴۹:۔ استغاثہ یہ کیا حُر نے جو بادیدۂ نم

حُر نے روتے ہوئے جب مدد کو پکارا تو خدا کی مہربانی کا دریا ٹھاٹھیں مارنے لگا اور قوم کے بادشاہوں کے بادشاہ خود ہاتھوں کو کھولے ہوئے سامنے آئے۔حُر کو اس وقت جبرائیل علیہ السلام (غیب کی آواز دینے والا فرشتہ) نے آواز دی کہ احسان مند ہو جن وانس کے رسولؐ کے نواسے تشریف لائے رہے ہیں یعنی اے بہادر تیرے استقبال کے واسطے خود امام حسینؑ آئے ہیں۔

بندنمبر ۵۰:۔ حُر نے دیکھا کہ چلے آتے ہیں پیدل شبیر

حُر نے جب حضرت امام حسینؑ کو پیدل آتے ہوئے دیکھا تو اس نے دوڑ کر آسمان کے تخت شاہی بادشاہ کے قدم چومے۔بادشاہ نے حُر کو گلے لگا کر کہا کہ اے عزت والے میں نے اور میرے خدا نے تیری غلطی معاف کردی۔تو کس لئے پریشان ہے،تو میرے لئے بہادر عباس

کے ہم رتبہ ہے۔لہٰذا میں تجھ پر خوش ہوں اس لئے تجھے مایوس نہیں ہو چاہئے۔

13.2.2 سرگرمی

درست جواب منتخب کریں:

میر انیسؔ اردو کے کس صنف کے مشہور شاعر ہیں؟

الف۔غزل　　ب۔مرثیہ　　ج۔رباعی

''بخدا فارسِ میدانِ تہور تھا حُرؔ '' کس صنف سے تعلق رکھتا ہے؟

الف۔نظم　　ب۔قصیدہ　　ج۔مرثیہ

حضرت حُرؓ ابتدا میں کس لشکر میں شامل تھے؟

الف۔حسینی لشکر　　ب۔یزیدی لشکر　　ج۔رومی لشکر

حضرت حُرؓ نے بعد میں کس کا ساتھ اختیار کیا؟

الف۔عمر سعد　　ب۔یزید　　ج۔امام حسینؑ

اس مرثیے کا بنیادی موضوع کیا ہے؟

الف۔جنگ　　ب۔حق و باطل کی کشمکش　　ج۔سفر

لفظ فردوس کے معنی کیا ہیں؟

الف۔باغ　　ب۔جنت　　ج۔میدان

میر انیسؔ کی شاعری کی نمایاں خصوصیت کیا ہے؟

الف۔مزاح　　ب۔منظر نگاری　　ج۔طنز

حضرت حُرؓ کے کردار کی سب سے بڑی خوبی کیا تھی؟

الف۔دولت　　ب۔شجاعت اور حق شناسی　　ج۔شہرت

13.4 عمومی جائزہ

زیرِ نظر سبق میں اردو کے عظیم مرثیہ نگار میر ببر علی انیسؔ کے مشہور مرثیے ''بخدا فارسِ میدانِ تہور تھا حُر'' کا تفصیلی مطالعہ کیا گیا۔ یہ مرثیہ اردو مرثیہ نگاری کا ایک اہم شاہکار ہے جس میں واقعہ کربلا کے عظیم کردار حضرت حُرؓ کی شخصیت، ان کے باطن کی تبدیلی، حق شناسی، توبہ اور قربانی کے جذبے کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ میر انیسؔ نے اپنے منفرد اسلوب کے ذریعے حضرت حُرؓ کی زندگی کے اس اہم موڑ کو زندہ اور متحرک بنا دیا ہے۔ اس سبق میں واضح ہوتا ہے کہ حضرت حُرؓ ابتدا میں یزیدی لشکر کے ایک اہم سپہ سالار تھے، مگر ان کے اندر نیکی، شرافت اور حق پسندی کے عناصر موجود تھے۔ جب انہیں حق اور باطل میں فرق واضح ہوا تو انہوں نے دنیاوی مفادات، منصب اور خوف کو چھوڑ کر حق کا ساتھ اختیار کیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب ان کی زندگی نے ایک عظیم رخ اختیار کیا۔ ان کی توبہ صرف زبانی نہ تھی بلکہ عملی تھی، جس کا ثبوت میدانِ کربلا میں ان کی بے مثال قربانی سے ملتا ہے۔

میر انیسؔ نے اس مرثیے میں حضرت حُرؓ کے کردار کو نہایت بلند مقام عطا کیا ہے۔ شاعر نے ان کی شجاعت، بہادری اور وفاداری کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ قاری ان کے کردار سے گہرے طور پر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ ایک طرف حُرؓ کی جنگی مہارت، دلیری اور قوتِ عمل ہے اور دوسری طرف ان کی عاجزی، ندامت اور امام حسینؑ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہے۔ یہی امتزاج ان کے کردار کو مزید عظیم بناتا ہے۔ اس سبق کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں حق و باطل کی کشمکش کو انتہائی مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ امام حسینؑ حق، عدل، صداقت اور دین کی نمائندگی کرتے ہیں، جبکہ یزیدی لشکر ظلم، جبر اور باطل کی علامت ہے۔ حضرت حُرؓ کا باطل سے نکل کر حق کی طرف آنا دراصل انسان کی داخلی بیداری اور روحانی کامیابی کی علامت ہے۔

فنی اعتبار سے بھی یہ مرثیہ بے حد اہم ہے۔ میر انیسؔ نے منظر نگاری، کردار نگاری، مکالمہ نگاری اور جذبات نگاری میں غیر معمولی مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔ جنگ کے مناظر، لشکروں کی صف بندی، گھوڑوں کی رفتار، تلواروں کی چمک اور میدانِ کربلا کی فضا کو شاعر نے اس مہارت سے بیان کیا ہے کہ قاری خود کو گویا اسی منظر کا حصہ محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح حضرت حُرؓ اور امام حسینؑ کے درمیان مکالمات نہایت اثر انگیز اور دل نشین ہیں۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی یہ مرثیہ نہایت بلند مقام رکھتا ہے۔ میر انیسؔ کی زبان شستہ، بلیغ اور پراثر ہے۔ عربی اور فارسی الفاظ کا خوبصورت استعمال، تشبیہات، استعارات اور محاورات مرثیے کے حسن کو دوبالا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مرثیہ نہ صرف ادبی اعتبار سے اہم ہے بلکہ جذباتی اور فکری سطح پر بھی قاری پر گہرا اثر چھوڑتا ہے۔

مجموعی طور پر یہ سبق ہمیں یہ پیغام دیتا ہے کہ سچی نیت، اخلاص، حق شناسی اور توبہ انسان کو عظمت کے اعلیٰ مقام تک پہنچا سکتے ہیں۔ حضرت حُرؓ کی زندگی اس بات کی روشن مثال ہے کہ اگر انسان صدقِ دل سے حق کو قبول کرے تو اس کے لیے کامیابی اور نجات کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ یہی اس سبق کا مرکزی پیغام اور اصل روح ہے۔

13.5 فرہنگ

فارس	:	گھوڑ سوار، بہادر
تہور	:	شجاعت، دلیری
طینت	:	فطرت، مزاج
فردوس	:	جنت
مخور	:	مغلوب، شکست خوردہ
رن	:	میدان جنگ
جنود	:	لشکر
لعین	:	بد بخت
تشنہ لبی	:	پیاس
اعدا	:	دشمن
مصحف	:	قرآن
غلغلہ	:	شور
ناہنجار	:	بدکردار
مرقع	:	نقشہ، صورت
قلزم	:	سمندر

تبرک	:	مقدس نشانی
شریر	:	بدکار، بُرا، بدذات
سخی	:	فیاض، دریادل، فراخ حوصلہ
رفقا	:	ساتھی
فاقہ	:	بھوک
منعم	:	احسان کرنے والا
تقریر	:	بیان
قصور	:	خطا
استغاثہ	:	فریاد
تقصیر	:	کوتاہی
نعش	:	جنازہ، انسان کا مردہ جسم، ارتھی، لاش، میّت
ریاضت	:	عبادت، محنت

13.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

مرثیہ ''بخدا فارسِ میدانِ تہور تھا حُرؒ '' کے مرکزی موضوع پر روشنی ڈالیں۔

حضرت حُرؒ کے کردار کو میر انیسؔ نے کس انداز میں پیش کیا ہے؟

میر انیسؔ کی مرثیہ نگاری کی خصوصیات بیان کریں۔

واقعہ کربلا میں حضرت حُرؒ کی اہمیت پر تفصیلی نوٹ لکھیں۔

مرثیے میں منظر نگاری اور جذبات نگاری کا جائزہ لیں۔

13.7 مشقی سوالات

1 میر انیسؔ کون تھے؟

2 زیرنظر مرثیہ کس کے بارے میں ہے؟

3 حضرت حُرؓ ابتدا میں کس لشکر میں تھے؟

4 حضرت حُرؓ نے بعد میں کس کا ساتھ اختیار کیا؟

5 مرثیے کا مرکزی موضوع کیا ہے؟

6 مرثیے میں کس واقعے کی عکاسی کی گئی ہے؟

7 میر انیسؔ کی شاعری کی دو خصوصیات لکھیں۔

8 تشنہ لبی کے معنی کیا ہیں؟

9 فردوس کے معنی کیا ہیں؟

10 استغاثہ کے معنی کیا ہیں؟

13.8 مشقی سوالات کے جوابات/جوابات سرگرمی

1۔ب

2۔ج

3۔ب

4۔ج

5۔ب

6۔ب

7۔ب

8-ب

مشقی سوالات کے جواب

1 میر انیسؔ اردو کے عظیم مرثیہ نگار تھے۔

2 یہ مرثیہ حضرت حُرؓ کے بارے میں ہے۔

3 یزیدی لشکر میں۔

4 حضرت امام حسینؑ کا ساتھ اختیار کیا۔

5 حق و باطل کی کشمکش۔

6 واقعہ کربلا۔

7 منظر نگاری، جذبات نگاری۔

8 پیاس۔

9 جنت۔

10 فریاد۔

13.9 امدادی کُتب

۱۔ انتخابِ مراثی) انیس و دبیر (۔مرتبہ رشید حسن خان۔از مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔دہلی

۲۔ انتخابِ قصائدِ اُردو۔از ڈاکٹر بو محمد سحر)مُرتّبہ

۳۔ انتخابِ قصائد و مراثی۔سودا، ذوق، انیس اور دبیر۔ڈاکٹر چمن لعل بھگت۔قاسمی کتب خانہ جموں

۴۔ اُردو میں قصیدہ نگاری۔از ابو محمد سحر

۵۔ اُردو میں قصیدہ نگاری کی روایت۔از محمود الٰہی

۶۔ موازانہ انیس و دبیر از شبلی نعمانی

۷۔ اردو مرثیہ کا ارتقا۔از ڈاکٹر مسیح الزمان۔

۸۔ اُردو قصیدہ نگاری۔اُم ہانی اشرف

۹۔ اُردو مرثیہ نگاری۔اُم ہانی اشرف

۱۰۔ انتخاب قصائد و مراثی مع فرہنگ) سودا،ذوق،انیس،دبیر (۔ڈاکٹر چمن لال

14.2 کس شیر کی آمد ہے کہ رَن کانپ رہا ہے

ساخت

14.0: اغراض ومقاصد

14.1: تعارف

14.2: متن (کس شیر کی آمد ہے کہ رَن کانپ رہا ہے)

14.2.1: متن کی تدریس

14.2.1 : سرگرمی (آو! اپنی معلومات کو جانچیں)

14.3 عمومی جائزہ

14.5 فرہنگ

14.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

14.7 مشقی سوالات

14.8 مشقی سوالات کے جوابات/جواباتِ سرگرمی

14.9 امدادی کتب

14.0: اغراض ومقاصد

کس شیر کی آمد ہے کہ رَن کانپ رہا ہے   رستم کا جگر زیر کفن کانپ رہا ہے
ہر قصر سلاطین زمن کانپ رہا ہے   سب ایک طرف، چرخ کہن کانپ رہا ہے

شمشیر بکف دیکھ کے حیدر کے پسر کو
جبریل لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو

ہیبت سے ہیں نہ قلعۂ افلاک کے دربند
جلاد فلک بھی نظر آتا ہے نظر بند
واہے کمر چرخ سے جوزا کا کمربند
سیارے ہیں غلطاں صف طائر پر بند
انگشت عطارد سے قلم چھوٹ پڑا ہے
خورشید کے پنجے سے علم چھوٹ پڑا ہے

خود فتنۂ وشر پڑھ رہے ہیں فاتحۂ خیر
کہتے ہیں اناالعبد لرز کر صنم و دیر
جاں غیر ہے، تن غیر، مکیں غیر، مکاں غیر
نے چرخ کا ہے دور، نہ سیاروں کی ہے سیر
سکتے میں فلک خوف سے مانند زمیں ہے
جز بخت یزید، اَب کوئی گردش میں نہیں ہے

بے ہوش ہے بجلی، پہ سمند ان کا ہے ہشیار
خوابیدہ ہیں سب، طالع عباس ہے بیدار
پوشیدہ ہے خورشید، علم ان کا نمودار
بے نور ہے منھ چاند کا، رُخ ان کا ضیابار
سب جزو ہیں کل رُتبے میں کہلاتے ہیں عباس
کونین پیادہ ہیں، سوار آتے ہیں عباس

چمکاکے مہ وخور، زرونقرہ کے عصا کو
سرکاتے ہیں پیر فلک پشت دوتا کو
عدل آگے بڑھا، حکم یہ دیتا ہے قضا کو
ہاں باندھ لے ظلم وستم و جور و جفا کو
گھر لوٹ لے، بغض وحسد وکذب وریا کا
سرکاٹ لے حرص وطمع ومکر و دغا کا

راحت کے محلوں کو بلا پوچھ رہی ہے
ہستی کے مکانوں کو فنا پوچھ رہی ہے
تقدیر سے عمر اپنی قضا پوچھ رہی ہے
دوزخ کا پتہ فوج جفا پوچھ رہی ہے

غفلت کا تو دل چونک پڑا خوف سے ہل کر
فتنے نے کیا خواب ، گلے کفر سے مل کر

روکش ہے اِس اک تن کا نہ بہمن ، نہ تہمتن — سہراب وزریمان وپشن ، بے سرو بے تن
قاروں کی طرح تحتِ زمیں غرق ہے قارن — ہر عاشق دُنیا کو ہے دُنیا ، چہ بیژن
سب بھول گئے اپنا حسب اورنسب آج
آتا ہے جگر گوشۂ قتّالِ عرب آج

ہے شور فلک کا کہ یہ خورشید عرب ہے — انصاف یہ کہتا ہے کہ چپ، ترک ادب ہے
خورشید فلک ، پرتو عارض کا لقب ہے — یہ قدرت رب،قدرت رب،قدرت رب ہے
ہر ایک کب اس کے شرف وجاہ کو سمجھے
اس بندے کو وہ سمجھے ، جو اللہ کو سمجھے

یوسف ہے یہ کنعاں میں،سلیماں ہے سبا میں — عیسیٰ ہے مسیحائی میں ، موسیٰ ہے دُعا میں
ایوب ہے یہ صبر میں، یحیٰ ہے بُکا میں — شبیر ہے مظلومی میں ، حیدر ہے وغا میں
کیا غم جو نہ مادر نہ پدر رکھتے ہیں آدم
عباس سا دُنیا میں پسر رکھتے ہیں آدم

قربان ہو اے علم شاہِ اُمم کے — سب خار ہرے ہوکے، بنے سرو ارم کے
ہیں راز عیاں خالق ذو الفضل وکرم کے — جبریل نے پر کھولے ہیں دامن میں علم کے
پرچم کا جہاں عکس گرا، صاعقہ چمکا
پرچم کہیں دیکھا نہ سنا ، اس چم وخم کا

قرنا میں نہ دم ہے، نہ جلا جل میں صدا ہے — بوق و دہل و کوس کی بھی سانس ہوا ہے
ہردل کے دھڑکنے کا مگر شور بپا ہے — باجا جو سلامی کا اُسے کہیے، بجا ہے

سکتے میں جو آواز ہے نقارہ و دَف کی
نوبت ہے ورود خلف شاہ نجف کی

مدّاح کو اب تازگی نظم میں کد ہے یا حضرتِ عبّاس علی ! وقتِ مدد ہے
مولا کی مدد سے جو سخن ہو، وہ سند ہے اِس نظم کا جو ہو نہ مُقراس کو حسد ہے
حاسد سے صلہ بھی نہیں درکار ہے مُجھ کو
سرکارِ حُسینی سے سروکار ہے مجھ کو

گُل زار ہے یہ نظم وبیاں ، بیشہ نہیں ہے باغی کو بھی گلگشت میں اندیشہ نہیں ہے
ہرمصرع برجستہ ہے پھل ، تیشہ نہیں ہے یاں مغزِ سخن کا ہے، رگ وریشہ نہیں ہے
صحت مری تشخیص سے ہے نظم کے فن کی
مانند قلم ہاتھ میں ہے نبض سخن کی

گر کاہ ملے ، فائدہ کیا کوہ کنی سے میں کاہ کو گُل کرتا ہوں رنگیں سخنی سے
خوش رنگ ہیں الفاظ، عقیق یمنی سے یہ ساز ہے، سوزِ غم شاہِ مدنی سے
آہن کو کروں نرم تو آئینہ بنالوں
پتھر کو کروں گرم تو میں عطر نکالوں

گو خلعت تحسیں مجھے حاصل ہے سراپا پروصف سراپا کا تو مشکل ہے سراپا
ہرعضوتن اِک قدرتِ کامل ہے سراپا یہ روح ہے سرتابہ قدم دل ہے سراپا
کیا ملتا ہے گر کوئی جھگڑتا ہے کسی سے
مضمون بھی اپنا نہیں لڑتا ہے کسی سے

سورج کو چھپاتا ہے گہن، آئینے کو زنگ داغی ہے قمر ، سوختہ دل لالہ خوش رنگ
کیا اصل دُر ولعل کی، وہ پانی ہے، یہ سنگ دیکھو گل وغنچہ، وہ پریشاں ہے، یہ دل تنگ

اس چہرے کو داور ہی نے لاریب بنایا
بے عیب تھا خود، نقش بھی بے عیب بنایا

انساں کہے اس چہرے کو کب چشمۂ حیواں
یہ نور وہ ظلمت، یہ نمودار وہ پنہاں
برسوں سے ہے آزار برص میں مہ تاباں
کب سے یرقاں مہر کو ہے اور نہیں درماں
آئینہ ہے گھر زنگ کا، یہ رنگ نہیں ہے
اس آئینے میں رنگ ہے اور زنگ نہیں ہے

آئینہ کہا رُخ کو تو کچھ بھی نہ ثنا کی
صنعت وہ سکندر کی ، یہ صنعت ہے خدا کی
واں خاک نے صیقل، یہاں قدرت نے جلا کی
طالع نے کس آئینے کو خوبی یہ عطا کی
ہر آئینے میں چہرۂ انساں نظر آیا
اس رُخ میں جمال شہ مرداں نظر آیا

بے مثل جبیں ہے نگہ اہل یقیں میں
بس ایک یہ خورشید ہے افلاک وزمیں میں
جلوہ ہے عجب ابروؤں کا قرب جبیں میں
دو مچھلیاں ہیں چشمۂ خورشید مبیں میں
مردم کو اشارہ ہے یہ ابرو کا، جبیں پر
ہیں دومہ نو جلوہ نما چرخ بریں پر

بینی کے تو مضموں پہ یہ دعوا ہے یقینی
اس نظم کے چہرے کی وہ ہوجائے گا بینی
منظور نگہ کو جو ہوئی عرش نشینی
کی سایۂ بینی نے فقط جلوہ گزینی
درکار اِسی بینی کی محبت کا عصا ہے
یہ راہ تو ایماں سے بھی باریک سوا ہے

بینی کو کہوں شمع تو لَو اس کی کہاں ہے؟
پرُ نور بھوؤں پر مجھے شعلے کا گماں ہے
دوشعلے اوراک شمع، یہ حیرت کا مکاں ہے
ہاں زُلفوں کے کوچوں سے ہوا تند رواں ہے

سمجھو نہ بھویں، بس کہ ہوا کا جو گذر ہے

یہ شمع کی لَو، گاہ اِدھر گاہ اُدھر ہے

گر آنکھ کو نرگس کہوں، ہے عین حقارت　　　نرگس میں نہ پلکیں ہیں نہ پُتلی، نہ بصارت

چہرے پہ مہ عید کی بے جا ہے اشارت　　　وہ عید کا مژدہ ہے، یہ حیدر کی بشارت

ابرو کے مہ نو میں نہ جنبش ہے، نہ ضو ہے

اک شب وہ مہ نَو ہے، یہ ہر شب مَہ نُو ہے

مُنھ غرقِ عرق دیکھ کے، خورشید ہوا تر　　　ابرو سے ٹپکتا ہے نرا تیغ کا جوہر

آنکھوں کا عرق، روغنِ بادام سے بہتر　　　عارض کا پسینا ہے، گلابِ گل احمر

قطرہ رُخ پرُنور پہ ڈھلتے ہوئے دیکھو

عطر گلِ خورشید نکلتے ہوئے دیکھو

تسبیح گُناں منھ میں زباں آٹھ پہر ہے　　　گویا دہن غنچہ میں برگ گل تر ہے

کب غنچہ وگل برگ میں، یہ نور مگر ہے　　　یہ برج میں خورشید کے، ماہی کا گزر ہے

تعریف میں ہونٹوں کی جو لب تر ہوا میرا

دُنیا ہی میں قابو لب کوثر ہوا میرا

یہ مُنہ جو ردیف لب خوش رنگ ہوا ہے　　　کیا قافیہ غنچے کا یہاں تنگ ہوا ہے

اب مدح دہن کا مجھے آہنگ ہوا ہے　　　پر غنچے کا نام اس کے لیے ننگ ہوا ہے

غنچہ کہا اُس منہ کو، حذر اہل سُخن سے

سونگھے کوئی، بُو آتی ہے غنچے کے دہن سے

جانِ فصحا، روحِ فصاحت ہے تو یہ ہے　　　ہر کلمہ ہے موقع پہ، بلاغت ہے تو یہ ہے

اعجاز مسیحا کی کرامت ہے تو یہ ہے　　　قائل ہے نزاکت کہ نزاکت ہے تو یہ ہے

یوں ہونٹھوں پہ تصویر سخن وقتِ بیاں ہے
یاقوت سے گویا رگ یاقوت عیاں ہے

وہ بات ٹھکانے کی کہوں اب کہ رہے یاد   دانتوں کی لڑی سے ، یہ لڑی عقل خدا داد
عباس و نجف ایک ہیں ، گنیے اگر اعداد   یہ گوہر عباس ہیں، پاک ان کی ہے بنیاد

معدن کے شرف ہیں، یہ جواہر کے شرف ہیں
دنداں دُرعباس ہیں، تو در نجف ہیں

دس انگلیاں ہیں مثل علم ان میں صف آرا   اثنا عشری اب کریں ہاتھوں کا نظارا
اے مومنو! عشرے میں علم رکھنا ہمارا   ہر پنجے کا ہے پنج تنی کو یہ اشارا

پہلے مرے آقا، مرے سالار کو رونا
پھر زیر علم اُن کے علم دار کو رونا

فکر ایک طرف، وہم بھی حاشا نہیں جاتا   تا موے کمر فکر کا رشتا نہیں جاتا
مضمون یہ نازک ہے کہ باندھا نہیں جاتا   پرفکر رسا کا مری دعوا نہیں جاتا

اب زیبِ کمر تیغِ شرر بار جو کی ہے
عباس نے شعلے کو گرہ بال سے دی ہے

در پیش ہے مضمون علم دار کے قدکا   مشتاق ہوں اب عالم بالا کی مدد کا
یا سایہ مجسم ہوا اللہ احد کا   یہ ہے قدبالا پسر شیر صمد کا

اس قد پہ دوابرو کی کشش کیا کوئی جانے
کھینچے ہیں دو مد ایک الف پر یہ خدانے

دیتا ہے سدا عمر رواں کو یہ بھلاوا   نے چرخ کے سودورے، نہ اک رخش کا کاوا
اللہ کی قدرت ہے ، نہ چھل بل ، نہ چھلاوا   یہ قسم ہے ترکیب عناصر کے علاوہ

چلتا ہے غضب چال، قدم شل ہے قضا کا
توسن نہ کہوں ، رنگ اُڑا ہے یہ ہوا کا
گردش میں ہر اک آنکھ ہے فانوس خیالی   بندش میں ہیں نعل اُس کے رباعی ہلالی
روشن ہے کہ جوزانے عناں دوش پہ ڈالی   بھرتی سے ہے مضمون رکابوں کا بھی خالی
سُرعت ہے اندھیرے اور اُجالے میں غضب کی
اندھیاری، اسے چاندنی ہے چودھویں شب کی
ٹھہرے، تو فلک سب کو زمیں پر نظر آئے   دوڑے تو زمیں، چرخ بریں پر نظر آئے
شہباز ہوا کا نہ کہیں پر نظر آئے   راکب ہی فقط دامن زیں پر نظر آئے
اس راکب و مرکب کی برابر جو ثنا کی
یہ علم خدا کا، وہ مشیت ہے خدا کی
شوخی میں پری، حسن میں ہے حور بہشتی   طوفان میں راکب کے لئے نوح کی کشتی
کب ابلق دوراں میں ہے یہ نیک سرشتی   یہ خیر ہے، وہ شر ہے، یہ خوبی ہے، وہ زشتی
صحرا میں چمن، فصل بہاری ہے چمن میں
رہ وار ہے اصطبل میں، تلوار ہے رَن میں
اس رخش کو عباس اڑاتے ہوئے آئے   کوس لمن الملک بجاتے ہوئے آئے
تکبیر سے سوتوں کو جگاتے ہوئے آئے   اک تیغ نگہ سب پہ لگاتے ہوئے آئے
بے چلّے کے، کھینچے ہوئے ابرو کی کماں کو
بے ہاتھ کے، تانے ہوئے پلکوں کی سناں کو
لکھا ہے مورخ نے کہ اک گبر دِلاور   ہفتم سے فروکش تھا میان صف لشکر
روئیں تن و سنگیں دل و بدباطن و بدبر   سرکر کے مہم، نیزوں پہ لایا تھا کئی سر

ہم راہِ شقی فوج تھی، ڈنکا تھا، نشاں کا
جا گیر کے لینے کو سوئے شام رواں تھا

تقدیر جو رَن میں شب ہفتم اُسے لائی
خلوت میں اسے بات عمر نے یہ سنائی
درپیش ہے سادات سے ہم کو بھی لڑائی
واں پنج تنی چند ہیں، یاں ساری خدائی
اکبر کا، نہ قاسم کا، نہ شبیر کا ڈر ہے
دولاکھ کو ، اللہ کی شمشیر کا ڈر ہے

بولا وہ لرز کر کہ ہو مجھ کو بھی وسواس
شمشیر خدا کون ؟ عمر بولا کہ عباس
اس نے کہا، پھر فتح کی کیوں کرہے تجھے آس
بولا کہ کئی روز سے اس شیر کو ہے پیاس
ہم بھی ہیں بہادر، نہیں ڈرتے ہیں کسی سے
پر روح نکلتی ہے تو عباس علی سے

تشریف علم دار جری رن میں جولایا
اس گبر کو چپکے سے عمر نے یہ سنایا
اندیشہ تھا جس شیر کے آنے کا، وہ آیا
سر اس نے پرے سے سوئے عباس اٹھایا
دیکھا تو کہا کانپ کے، یہ فوج وغا سے
روبا ہو! لڑاتے ہو مجھے شیر خدا سے

مانا کہ خدا یہ نہیں، قدرت ہے خدا کی
مجھ میں ہے نرا زور، یہ قوت ہے خدا کی
کی خوب ضیافت مری، رحمت ہے خدا کی
سب نے کہا تجھ پر بھی عنایت ہے خدا کی
جا عذر نہ کر، نام ہے مردوں کا اِسی سے
تو دبدبہ و زور میں کیا کم ہے کسی سے

بادل کی طرح سے وہ گرجتا ہوا نکلا
جلدی میں سلح جنگ کے سجتا ہوا نکلا
ہر گام رہ عمر کو تجتا ہوا نکلا
اورسامنے نقارہ بھی بجتا ہوا نکلا

غالب تھا تہمتن کی طرح اہل جہاں پر
دھنستی تھی زمیں، پاؤں وہ رکھتا تھا جہاں پر

تیار کمر کس کے ہوا جنگ پہ خوں خوار — اور پیک اجل آیا ہے کہ ہے قبر بھی تیار
خنجر لیا منھ دیکھنے کو اور کبھی تلوار — مثل ورم مرگ، چڑھا گھوڑے پہ اک بار
وہ رخش پہ، یادیودنی تخت زری پر
غل رن میں اٹھا، کوہ چڑھا کبک دری پر

اس ہیبت وہیبت سے وہ نخوت سیر آیا — آسیب کو بھی سایے سے اس کے حذر آیا
میداں میں قیامت کو بھی محشر نظر آیا — گرد اپنے لیے نیزوں پہ کشتوں کے سر آیا
زندہ ہی پے سیر نہ ہر اک صف سے بڑھے تھے
سر مردوں کے نیزوں پہ تماشے کو چڑھے تھے

سیدھا کبھی نیزے کو ہلایا، کبھی آڑا — پڑھ پڑھ کے رجز، باغ فصاحت کو اجاڑا
ظالم نے کئی پشت کے مردوں کو اُکھاڑا — بولا، مری ہیبت نے جگر شیروں کا پھاڑا
ہم پنجہ نہ رستم ہے، نہ سہراب ہے میرا
مرحب بن عبدالقمر، القاب ہے میرا

فتراک میں سر باندھتا ہوں پیل دماں کا — پنجہ میں سدا پھیرتا ہوں شیرژیاں کا
نظارہ ذرا کیجئے ہر شاخ سناں کا — اس نیزے پہ وہ سر ہے فلاں ابن فلاں کا
جو جو تھے یلان کہن، اس دورۂ نو میں
تن اُن کے تہ خاک ہیں، سر میرے جلو میں

یاں سیف زباں، سیف الٰہی نے علم کی — فرمایا، میرے آگے یہ تقریر ستم کی
اب منھ سے کہا کچھ تو زباں میں نے قلم کی — کونین نے گردن میرے دروازے پہ خم کی

طاقت ہے ہماری، اسد اللہ کی طاقت

پنجے میں ہمارے ہے یداللہ کی طاقت

عبدالقمر نحس کا تو داغ جگر ہے　　میں چاند علی کا ہوں،ارے یہ بھی خبر ہے

خورشید پرستی سے تری کیا مجھے ڈر ہے　　قبضے میں طناب فلک وشمس وقمر ہے

مقدور رہا شمس کی رجعت کا پدر کو

دو ٹکڑے چچا نے کیا انگلی سے قمر کو

خورشید درخشاں میں بتا نور ہے کس کا　　کلمہ ورق ماہ پہ مسطور ہے کس کا

اور سورۂ والشّمس میں مذکور ہے کس کا　　ذرے کو کرے مہر، یہ مقدور ہے کس کا

یہ صاحب مقدور نبی اور علی ہیں

یا ہم کہ غلام خلفُ الصّدق نبی ہیں

دو، چاند کو کرتی ہے، اک انگشت ہماری　　ہے مہر نبوت سے ملی پشت ہماری

ہے تیغ ظفر، وقت زد و کشت ہماری　　سوگُرز قضا، ضربت یک مشت ہماری

قدرت کے نیستان کے ہم شیر ہیں، ظالم!

ہم شیر ہیں اور صاحب شمشیر ہیں، ظالم!

احمد ہے چچا میرا، پدر حیدر صف در　　وہ کل کا پیمبر ہے، یہ کونین کا رہبر

اور مادرِ زینب کی ہے لونڈی ، مری مادر　　بھائی مرا اک عثمان، دو عبداللہ و جعفر

اور شبّر وشبیّر ہیں سردار ہمارے

ہم ان کے غلام ، اور وہ مختار ہمارے

قاسم کا عزادار ہوں، اکبر کا میں غم خوار　　لشکر کا علم دار ہوں، سرور کا جلودار

میں کرتا ہوں پردہ، تو حرم ہوتے ہیں اسوار　　تھا شب کو نگہ بان خیام شہ ابرار

اب تازہ یہ بخشش ہے خداے ازلی کی
سقا بھی بنا اُس کا جو پوتی ہے علی کی

اس کے قدم پاک کا فدیہ ہے سراپنا   قربان کیا جس پہ نبی نے پسر اپنا
نذر سر اکبر ہے دل اپنا، جگر اپنا   بیتُ الشّرف شاہ پہ صدقے ہے گھر اپنا
مشہور جو عباس، زمانے کا شرف ہے
شبیر کی نعلین اُٹھانے کا شرف ہے

ناری کو، بہشتی کے رجز پر حسد آیا   یوں جل کے پئے حملہ وہ ملعون بدآیا
گویا کہ سقر سے عمر عبدود آیا   اور لرزے میں مرحب بھی میان لحد آیا
نفریں کی خدا نے اسے، تحسین کی عمر نے
مجرا کیا عباس کو یاں فتح وظفر نے

شبیر کو بڑھ بڑھ کے نقیبوں نے پکارا   لو، ٹوٹتا ہے دست زبردست تمھارا
ہے مرحب عبد القمر اب معرکہ آرا   شبیر! یقیں جانو کہ عباس کو مارا
یہ گرگ، وہ یوسف، یہ خزاں ہے، وہ چمن ہے
وہ چاند، یہ عقرب ہے، وہ سورج، یہ گہن ہے

اس شور نے تڑپا دیا حضرت کے جگر کو   اکبر سے کہا ، جاؤ تو عمو کی خبر کو
اکبر بڑھے اورمڑ کے پکارے یہ پدر کو   گھیرا ہے کئی نحس ستاروں نے قمر کو
اک فوج نئی گرد علم دار ہے رن میں
لو ماہِ بنی ہاشمی آتا ہے گہن میں

اک گبر قوی آیا ہے کھینچے ہوئے تلوار   کہتا ہے کہ اک حملے میں ہے فیصلۂ کار
سرکشتوں کے نیزوں پہ ہیں گرد اِس کے نمودار   یاں دست بہ قبضہ متبسم ہیں علم دار

اللہ کرے خیر کہ ہے قصد شر اس کو
سب کہتے ہیں ، مرحب بن عبدالقمراس کو

غل ہے کہ دل آل عبا توڑے گا مرحب   اب بازوے شاہ شہدا توڑے گا مرحب
بند کمر شیر خدا توڑے گا مرحب   گوہر کو تہ سنگ جفا توڑے گا مرحب

مرحب کا، نہ کچھ اس کی توانائی کا ڈر ہے
فدوی کو چچا جان کی تنہائی کا ڈر ہے

شہ نے کہا ، کیا روح علی آئی نہ ہوگی   نانا نے مرے کیا یہ خبر پائی نہ ہوگی
کیا فاطمہ فردوس میں گھبرائی نہ ہوگی   سرننگے وہ تشریف یہاں لائی نہ ہوگی

بندوں پہ عیاں زورخدا کرتے ہیں عباس
پیارے مرے!دیکھوتو کہ کیا کرتے ہیں عباس

اس عرصے میں حملے کیے مرحب نے وہاں چار   پر ایک بھی اس پنج تنی پر نہ چلاوار
مانند دل و چشم، ہر اک عضو تھا ہشیار   عاری ہوئی تلوار، مخالف ہوا ناچار

جب تیغ کو جھنجلا کے رُخ پاک پہ کھینچا
تلوار نے اُنگلی سے الف خاک پہ کھینچا

غازی نے کہا، بس اسی فن پر تھا تجھے ناز   سیکھا نہ یداللہیوں سے ضرب کا انداز
پھر کھینچی اس انداز سے تیغ شرر انداز   جو میان کے بھی منھ سے ذرا نکلی نہ آواز

یاں خوف سے قالب کو کیا میان نے خالی
واں قالب اعدا کو کیا جان نے خالی

یہ تیغ سراپا جو برہنہ نظر آئی   پھر جامۂ تن میں نہ کوئی روح سمائی
ہستی نے کہا توبہ ، قضا بولی دُہائی   انصاف پکارا کہ ہے قبضے میں خدائی

لو، فتح مجسم کا وہ سر جیب سے نکلا
نصرت کے فلک کا مہ نوغیب سے نکلا

بجلی گری بجلی پہ، اجل ڈر کے اجل پر — اک زلزلہ طاری ہوا گردوں کے محل پر
سیّارے ہٹے ،کرکے نظر تیغ کے پھل پر — خورشید تھا مریخ پہ، مریخ زُحل پر
یہ ہول دیا تیغ درخشاں کی چمک نے
جوتاروں کےدانتوں سےزمیں پکڑی فلک نے

مرحب سے مخاطب ہوئے عباس دِلاور — شمشیر کے مانند سراپا ہوں میں جوہر
ممکن ہے کہ اک ضرب میں دو ہوتو سراسر — پراس سے عیاں ہوں گے نہ جوہر مرے تجھ پر
لے روک مرے وار، ترے پاس سپر ہے
زخمی نہ کروں گا، ابھی اظہار ہنر ہے

کاندھے پہ سپر لے کے، مقابل ہوادشمن — بتلانے لگے تیغ سے یہ ضرب کا ہرفن
یہ سینہ ، یہ بازو ، یہ کمر اور یہ گردن — یہ خود، یہ چار آئینہ ، یہ ڈھال، یہ جوشن
کس وار کو وہ روکتا ، تلوار کہاں تھی
آنکھوں میں تو پھرتی تھی،نگاہوں سےنہاں تھی

مرحب نے نہ پھر ڈھال نہ تلوار سنبھالی — اک ہاتھ سے سر، ایک سے دستار سنبھالی
ظالم نے سناں غصے سے اِک بار سنبھالی — اس شیر نے شمشیر شرر بار سنبھالی
تانی جو سناں اُس نےعلم دار کےاوپر
نیزہ یہ اُڑالے گئے تلوار کے اوپر

جو چال چلا وہ ، ہوا گم راہ وپریشاں — پھر زائچہ کھینچا جو کماں کا سرِمیداں
تیروں کی لڑائی پہ پڑا قرعۂ پیکاں — تیروں کو قلم کرنے لگی تیغ درخشاں

جو ہر سے، نہ تیروں ہی کے پھل داغ بہ دل تھے

گرشست کے تھے ساٹھ، تو چلّے کے چھل تھے

اس تیغ نے سرکش کے جوترکش میں کیا گھر   غل تھا کہ نیستاں میں گری برق چمک کر

پر تیروں کے کٹ کٹ کے اڑے مثل کبوتر   مرحب ہوا مضطر، صفت طائر بے پر

بڑھ کر کہا غازی نے، بتا کس کی ظفر ہے؟

اب مرگ ہے اور تو ہے، یہ تیغ اور یہ سر ہے

نامرد نے پوشیدہ کیا رُخ کو سپر سے   اور کھینچ لیا خنجر ہندی کو کمر سے

خنجر تو اُدھر سے چلا اور تیغ ادھر سے   اُس وقت ہَوا چل نہ سکی بیچ میں ڈر سے

اللہ رہے شمشیر علم دار کے جوہر

جوہر کیے اُس خنجر خوں خوار کے جوہر

خنجر کو جو کاٹا تو وہ ٹھہری نہ سپر پر   ٹھہری نہ سپر پر تو وہ سیدھی گئی سر پر

سیدھی گئی سر پر تو وہ تھی صدر وکمر پر   تھی صدر وکمر پر تو وہ تھی قلب وجگر پر

تھی قلب وجگر پر تو وہ تھی دامن زیں پر

تھی دامن زیں پر تو وہ راکب تھا زمیں پر

ایماں نے اُچھل کر کہا ، وہ کفر کو مارا   قدرت نے پُکارا کہ یہ ہے زور ہمارا

حیدر سے نبی بولے ، یہ ہے فخر تمہارا   حیدر نے کہا، یہ مری پتلی کا ہے تارا

پروانۂ شمع رُخ تاباں ہوئیں زہرا

محسن کو لیے گود میں قرباں ہوئیں زہرا

ہنگامہ ہوا گرم، یہ ناری جو ہوا سرد   واں فوج نے لی باگ، بڑھایاں یہ جواں مرد

ٹاپوں کی صدا سے سرقاروں میں ہوا درد   رنگ رُخ اعدا کی طرح اڑنے لگی گرد

قاروں کا زر گنج نہانی نکل آیا
یہ خاک اڑی رن سے کہ پانی نکل آیا

جو زندہ تھے ، العظمتہ للہ پکارے
سرمردوں کے نیزوں پہ جو تھے، واہ پکارے
ڈر کر عمر سعد کو گم راہ پکارے
خوش ہو کے علم دار سوئے شاہ پکارے
یاں تو ہوا یا حضرت شبیر کا نعرہ
شبیر نے ہنس کر کیا تکبیر کا نعرہ

پردے کے قریب آ کے بہن شہ کی پکاری
دشمن پہ ہوئی فتح، مبارک ہو، میں واری
اب کہتی ہوں میں دیکھتی تھی جنگ یہ ساری
عباس کی اک ضرب میں ٹھنڈا ہوا ناری
مرحب کو تو خیبر میں یداللہ نے مارا
ہم نام کو ابن اسداللہ نے مارا

تم دونوں کا ہر وقت نگہبان خدا ہو
دیکھے جو بری آنکھ سے، غارت ہو، فنا ہو
دونوں کی بلا لے کے یہ ماں جائی فدا ہو
رو کر کہا حضرت نے بہن! دیکھیے کیا ہو؟
منھ چاند سا مجھ کو جو دکھائیں تو میں جانوں
دریا سے سلامت جو پھر آئیں تو میں جانوں

زینب سے بہ حسرت یہ بیاں کرتے تھے مولا
ناگاہ سکینہ نے سنا فتح کا مژدا
چلاّئی میں صدقے ترے، اچھی مری فِضا
جا جلد بلائیں مرے عمو کی تو لے آ
دُکھ پیاس کا کہہ کر، انہیں مدہوش نہ کرنا
پر یاد دلانا کہ فراموش نہ کرنا

لینے کو بلائیں گئی فضہ سوے جنگاہ
عباس نے آتے ہوئے دیکھا اُسے ناگاہ
چلاّئے کہ پھر جا، میں ہوا آنے سے آگاہ
کہہ دینا سکینہ سے، ہمیں یاد ہے واللہ

دل پیاس سے بی بی کا ہوا جاتا ہے پانی
لے کر ترے بابا کا غلام آتا ہے پانی

دریا کو چلے ابر صفت ساتھ لیے برق	مرحب کے شریکوں کا جدا کرتے ہوئے فرق
سردار میں اور فوج میں باقی نہ رہا فرق	مرحب کی طرح سب چہ ہب ہب میں ہوئے غرق
تلوار کی اک موج نے طوفان اٹھایا
طوفان نے سر پر وہ بیابان اٹھایا

پانی ہوئی ہر موج زرہ فوج کے تن میں	ملبوس میں زندے تھے کہ مردے تھے کفن میں
خنجر کی زبانوں کو قلم کرکے دَہن میں	اِک تیغ سے تلواروں کو عاری کیا رَن میں
حیدر کا اسد، قلزمِ لشکر میں در آیا
اڈے ہوئے بادل کی طرح نہر پر آیا

دریا کے نگہبان بڑھے ہونے کو چورنگ	پہنے ہوئے مچھلی کی طرح بر میں زرہ تنگ
کھینچے ہوئے موجوں کی طرح خنجر بے زنگ	شقے نے کہا، پانی پہ جائز ہے کہاں جنگ
دریا کے نگہ بان ہو، پر غفلت دیں ہے
مانند حباب آنکھ میں بینائی نہیں ہے

پانی مجھے اک مشک ہے اس نہر سے درکار	پھر لینے دو مجھ کو، نہ کرو حُجت وتکرار
چلائے ستم گر، ہے گزر نہر پہ دشوار	غازی نے کہا ، ہاں یہ ارادہ ہے، تو ہشیار
لو، سیل کو اور برق شرربار کو روکو
رہ وار کو روکو ، مری تلوار کو روکو

یہ کہہ کے، کیا اَسپ سُبک تاز کو مہمیز	بجلی کی طرح کوند کے چمکا فرس تیز
اشرار کے سر پر ہوا نعلوں سے شرر ریز	سیلاب فنا تھا کہ وہ طوفان بلا خیز

جھپکی پلک، اس رخش کو جب قہر میں دیکھا
پھر آنکھ کھلی جب، تو رواں نہر میں دیکھا

دریا میں ہوا غل کہ وہ درِنجف آیا   الیاس و خضر بولے ، ہمارا شرف آیا
عباس، شہنشاہ نجف کا خلف آیا   پابوس کو موتی لیے دست صدف آیا

یاد آ گئی پیاسوں کی جو حیدر کے خلف کو
دل خون ہوا دیکھ کے دریا کی طرف کو

سوکھے ہوئے مشکیزے کا پھر کھولا دہانہ   بھرنے لگا خم ہو کے وہ سرتاج زمانہ
اعدا نے کیا دور سے تیروں کا نشانہ   اور چوم لیا روح یداللہ نے شانہ

فرمایا کہ کیا کیا مجھے خوش کرتے ہو بیٹا!
پانی مری پوتی کے لئے بھرتے ہو بیٹا!

دریا سے جو نکلا اسد اللہ کا جانی   تھا شور کہ وہ شیر لیے جاتا ہے پانی
پھر راہ میں حائل ہوئے سب ظلم کے بانی   سقّاے سکینہ کی یہ کی مرتبہ دانی

قبریں نبی و حیدر و زہرا کی ہلا دیں
برچھوں کی جو نوکیں تھیں کلیجے سے ملا دیں

وہ کون سا تھا تیر جو دل پر نہ لگایا   مشکیزے کے پانی سے سوا خون بہایا
وہ نرغہ تھا جو شمر نے حیلے سے سنایا   عباس بچو! غول کمیں گاہ سے آیا

مُڑ کر جو نظر کی خلف شیر خدا نے
شانوں کو تہ تیغ کیا اہل جفا نے

لکھا ہے کہ اک نخل رُطب تھا سر میداں   ابن ورقہ زید لعیں اس میں تھا پنہاں
پہنچا جو وہاں سرو روان شہ مرداں   جو شانہ تھا مشک و علم و تیغ کے شایاں

وار اس پہ کیا زید نے شمشیر اجل سے
یہ پھولی پھلی شاخ، کٹی تیغ کے پھل سے

مشک و علم و تیغ کو بائیں پہ سنبھالا　　اور جلد چلا عاشق روے شہ والا
پر ابن طفیل آگے بڑھا تان کے بھالا　　برچھے کی انی سے تو کیا دل تہ و بالا
اور تیغ کی ضربت سے جگر شاہ کا کاٹا
اور ہاتھ بھی فرزند یدُاللہ کا کاٹا

سقّے نے کٹی بانہوں پہ مشکیزے کو رکھ کر　　مانند زباں منھ میں لیا تسمہ سراسر
ناگاہ کئی تیر لگے آکے برابر　　اک مشک پہ، اک آنکھ پہ اور ایک دہن پر
مشکیزے سے پانی بہا اور خوں بہا تن سے
عباس گرے گھوڑے سے، اور مشک دہن سے

گر کر لب زخمی سے علم دار پکارا　　کہہ دے کوئی پیاسوں سے کہ سقا گیا مارا
سن لی یہ صدا شاہ شہیداں نے قضارا　　زینب سے کہا، لو نہ رہا کوئی ہمارا
اصغر کا گلا چھد گیا، اکبر کا جگر بھی
بازو بھی مرے ٹوٹ گئے اور کمر بھی

زینب نے کہا، سچ ہے سبھی مر گئے بھائی!　　سب کنبے کو عباس فنا کر گئے بھائی!
آفاق سے اب حمزہ و حیدر گئے بھائی!　　ہم مجلس حاکم میں کھلے سر گئے بھائی!
میں جان چکی، قید مصیبت میں پڑی ہوں
اب گھر میں نہیں، بلوے میں سر ننگے کھڑی ہوں

ناگاہ صدا آئی کہ اے فاطمہ کے لال　　جلد آؤ کہ اب لاشہ مرا ہوتا ہے پامال
زینب نے کہا، زندہ ہیں عباس خوش اقبال　　تم جاؤ میں یاں بہر شفا کھولتی ہوں بال

شہ بولے، لب گور سکینہ کا چچا ہے

اس فوج کا مارا ہوا کوئی بھی بچا ہے

اکبر کے سہارے سے چلے نہر پہ آقا گہ ہوش تھا، گہ غش ، کبھی سکتہ، کبھی نوحا

لکھا ہے کہ ٹکڑے ہوئے یوں سقے کے اعضا اِک ہاتھ تو مقتل میں ملا اک لبِ دریا

زہرا کا پسر رن میں جو زیر شجر آیا

اِک ہاتھ تڑپتا ہوا شہ کو نظر آیا

گِرکر شہ والا نے یہ اکبر سے کہی بات اے لال اٹھا لو، مرے بازو کا ہے یہ ہاتھ

یہ ہاتھ رکھے سینے پہ، وہ وارث سادات پہنچا جو سر لاشۂ عباس خوش اوقات

ہیہات، قلم تیغوں سے شانے نظر آئے

سرننگے ید اللہ سِرہانے نظر آئے

بے ساختہ ماتھے پہ رکھا شاہ نے ماتھا لب رکھ کے لبوں پر کہا ، واحسرت و دردا!

یہ تیر، یہ آنکھ اور یہ نیزہ، یہ کلیجا وا قُرۃ عینا مرے، وا ہجتہ قلبا

کچھ منھ سے تو بولو، مرے غم خوار برادر!

عباس ابوالفضل ، علم دار بردار!

اس جاں شکنی میں جو سنا شیون مولا تعظیم کی نیت میں کٹے شانوں کو ٹیکا

پھر پاؤں سمیٹے کہ نہ ہوں پائینتی آقا شہ بولے ، نہ تکلیف کرو اے مرے شیدا

کی عرض، میں پھیلائے ہوئے پاؤں پڑا ہوں

حضرت نے یہ فرمایا، سِرہانے میں کھڑا ہوں

یاں تھی یہ قیامت ، وہاں خیمے میں یہ محشر در پر تھیں نبی زادیاں سب کھولے ہوئے سر

تشویش تھی کیوں لاش کو لے آئے نہ سرور عباس کا فرزند، سراسیمہ تھا باہر

تن رعشے میں خورشید درخشاں کی طرح تھا
دل ٹکڑے یتیموں کے گریباں کی طرح تھا

یہ غل تھا، جو مولا لیے مشک وعلم آئے　　خیمے میں کمر پکڑے امام اُمم آئے
اور گرد علم بال بکھیرے حرم آئے　　زینب سے کہا شہ نے، بہن لٹ کے ہم آئے
بھائی کے یتیموں کی پرستار ہو زینب!
تم مہتم سوگ علم دار ہو زینب!

خاموش دبیؔر اب کہ نہیں نظم کا یارا　　مداح کا دل خنجر غم سے ہے دوپارا
کافی پے بخشش یہ وسیلہ ہے ہمارا　　اک ہفتے میں تصنیف کیا مرثیہ سارا
تجھ پر کرم خاص ہے یہ حق کے ولی کا
یہ فیض ہے سب مدح جگر بند علی کا

14.2.1:متن کی تدریس

تمہید:۔مرزا اسلامت علی دبیؔر جن کی پیدائش ۱۸۰۳ء میں دہلی کے محلّہ بلّی ماران میں ہوئی اور ۱۸۷۵ء میں محلّہ نخاس (کوچہ دبیؔر) میں وفات پائی کا یہ ایک مشہور مرثیہ ہے۔ادبی اور فنی اعتبار سے یہ ایک مکمل مرثیہ ہے جسے تمام نقادوں نے بے حد سراہا ہے۔مرزا دبیؔر نے یہ مرثیہ علمدار کربلا عباسؑ بن علیؑ ،جنہیں کمال حسنؔ کی وجہ سے ''قمر نبی ہاشمی'' بھی کہا جاتا ہے کی تعریف میں قلمبند کیا ہے۔حضرت عباسؑ کو کربلا کے میدان میں جنگ کی اجازت نہیں دی گئی تھی صرف سکینہؓ (حضرت امام حسینؑ کی بیٹی) کے لئے پانی لانے کا حکم دیا گیا تھا آپ مشکیزہ اور علم لے کر پانی کے لئے دریائے فرات پر گئے اور کارہائے نمایاں کر کے پانی کی جدوجہد میں شہید ہو گئے۔مرزا دبیؔر نے زیر بحث مرثیے میں ان تمام واقعات کی بھرپور عکاسی کی ہے۔تخیل آرائی، بلاغت، مبالغہ آرائی، مشکل وباریک تشبیہات واستعارات، نامعلوم تلمیحات، مشکل الفاظ وتراکیب، معنی آفرینی، صنعتوں کا استعمال، واقعہ وجذبات نگاری، عالمانہ وفطری اسلوب وغیرہ خصوصیات زیر نظر مرثیے میں پائی جاتی ہیں۔نصاب میں شامل اس مرثیے کے مطالعے سے نہ صرف حضرت عباسؑ کی جنگی صلاحیتوں کا ثبوت فراہم ہوتا ہے بلکہ مرزا دبیؔر کی مرثیہ گوئی کا بخوبی اندازہ بھی لگایا

جاسکتا ہے۔طوالت کے پیش نظر اس مرثیے کے چند بندوں کی فرداً تشریح کرتے ہوئے ہر بند کا پہلا مصرعہ اسارے کے طور پر اس لئے دیا گیا ہے تا کہ اس بند کو اسی مصرعے سے سمجھا جائے۔

بند نمبر ۱:۔کس شیر کی آمد ہے کہ رَن کانپ رہا ہے

شاعر فرماتے ہیں کہ ایسا کون سا بہادر تشریف لا رہا ہے جس کے خوف سے ایک طرف نہ صرف میدان جنگ لرز رہا ہے بلکہ قبر میں دفن رستم کے جیسے مشہور پہلوان کا دب کفن کے نیچے دھڑکنے کے ساتھ ساتھ زمانے کے بادشاہوں کے محلوں پر بھی دہشت طاری ہورہی ہے۔اور دوسری جانب بوڑھا آسمان بھی خوف زدہ ہے۔حضرت حیدرؑ کے بیٹے یعنی حضرت عباسؑ کو ہاتھ میں تلوار لئے دیکھ کر پیغمبر کے پاس خدا کی طرف سے پیغام لے جانے والا فرشتہ یعنی حضرس جبرائیل بھی اپنے پنکھ سُکیڑے ہوئے تھرتھرا رہا ہے۔

بند نمبر ۲:۔ہیبت سے ہیں نہُ قلعہٴ افلاک کے در بند

یہاں تک کہ دہشت سے نو آسمانوں کے قلعوں کے دروازے بھی بند ہو گئے ہیں۔اور سیارہ مریخ (علم نجوم کے مطابق ساتویں آسمان پر سرخ ستارے کے مانند دہکتا نظر آتا ہے) بھی قیدی کی طرح نظر آتا ہے۔گویا کہ سرخ ستارے کی مانندُ دہکتا نظر نہیں آتا۔آسمان کے وسط یعنی پشت سے تیسرے آسمانی برج کا ازار بند بھی کھلا ہوا ہے۔سیارے خوف کے مارے بے بس (قیدی) پرندے کی مانند ہیں۔منگل سیارہ (منشی فلک) یعنی تقدیر لکھنے والا سیارہ اس قدر خوف زدہ ہے کہ اس کے ہاتھ سے قلم کنارہ کشی کر گیا ہے اور ڈر کے مارے سورج کے قبضے سے جھنڈا چھٹکارا پا گیا ہے یعنی سورج کی کرنیں روشنی بکھرنے سے معذور ہیں۔

بند نمبر ۳:۔خود فتنہٴ و شر پڑھ رہے ہیں فاتحہٴ خیر

حضرت عباسؑ کے خوف سے کرکش (دشمن کے سپاہی) بھی دعائے خیر پڑھ رہے ہیں اور مندر کا بت بھی کہہ رہا ہے کہ میں بھی بندہ ہوں۔یہاں تک کہ جان وجسم کا آپسی ناطہ ٹوٹ گیا ہے۔اب نہ تو آسمان گردش میں ہے اور نہ ہی سیارے گھوم رہے ہیں۔دہشت سے آسمان زمین کی طرح پست ہے اور اب یزید کی تقدیر کا کوئی بھی حصہ حرکت میں نہیں ہے گویا قسمت نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔

بند نمبر ۴:۔بے ہوش ہے بجلی، پہ سمندان کا ہے ہشیار

ان (حضرت عباسؑ) کے گھوڑے کی چوکسی اور چمک کو دیکھ کر بجلی اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھی ہے۔تمام سوئے ہوئے ہیں یعنی ان کی

بدبختی ہے صرف ایک حضرت عباسؑ کی تقدیر جاگی ہوئی ہے گویا قسمت اس کا ساتھ دے رہی ہے۔خوف سے سورج چھپ گیا ہے لیکن حضرت عباسؑ کا جھنڈا سامنے ہے اور چاند کے رخ سے روشنی غائب ہوگئی ہے لیکن ان (حضرت عباسؑ) کا چہرہ روشنی پھیلا رہا ہے۔گویا ان تمام خوبیوں (حصوں) کی وجہ سے حضرت عباسؑ کا مرتبہ بلند ہے اور وہ گھوڑے پر تشریف آور ہیں جب کہ دونوں جہاں (دین اور دنیا) پیدل سفر کر رہے ہیں۔

بند نمبر ۵:۔ چمکا کے مہ وخور، زرونقرہ کے عصا کو

ساعر فرماتے ہیں کہ اس خوف سے بوڑھے آسمان کی پیٹھ کبڑی (ٹیڑھی) ہوگئی ہے وہ چاند وسورج اور سونے وچاندی کی طرح چمکنے والی لاٹھی کے سہارے اپنے کبڑے پن کو چھپا رہا ہے۔انصاف سامنے آکر موت کو ہدایت دے رہا ہے کہ بے انصافی و بے رحمی ور بردستی پر بندش لگا دے۔یہاں تک کہ تفرت وجھوٹ، خواہش ولالچ اور فریب ودھوکا کو نیست ونابود کر دے یعنی ان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دے۔

بند نمبر ۶:۔ راحت کے محلوں کو بلا پوچھ رہی ہے

شاعر فرماتے ہیں کہ حضرت عباسؑ کے ڈر سے آرام کے ایوانوں کو مصیبت تلاش کر رہی ہے اور زندہ جسموں کو موت دریافت کر رہی ہے۔یہاں تک کہ آیۂ (عمر) قسمت سے اپنی موت کی خبر لے رہی ہے اور ظلم ڈھانے والی فوج (سرکش) جہنم کے بارے میں چھان بین کر رہی ہے۔دہشت سے گھبرا کر بےخبر (غلطی) کا دل بھول میں پڑ گیا ہے اور باغی اپنی ہٹ دھرمی کے سبب وہم (خیال) میں کھو گیا ہے۔

بند نمبر ۷:۔ روکش ہے اِس اک تن کا نہ بہمن، نہ تہمتن

بہمن، تہمتن، سہراب، نریمان اور پشن جیسے ایران کے نامور بہادر اس ایک جسم یعنی حضرت عباسؑ کے مقابل کیا، بلکہ اس کے سامنے مردے ہیں گویا ان پہلوانوں کی اوقات عباسؑ کے سامنے بے بنیاد ہے۔اسی طرح عرب کا مشہور رسورما یعنی قارنؔ خوف کے مارے قارون سمیت مال کی طرح زمین میں دھنس گیا اور دنیا کی چاہت رکھنے والا اب دنیا کو بھول چکا ہے۔حضرت عباسؑ کے ڈر سے تمام اپنا خاندانی سلسلہ بھول گئے ہیں۔یہاں تک کہ عرب کے قتّال (ظالم یزید) کو کلیجہ منہ کو آیا ہے یعنی دہشت سے اس کا دل گھبرا گیا ہے۔

بند نمبر ۸:۔ ہے شور فلک کا کہ یہ خورشید عرب ہے

حضرت عباسؑ کو دیکھ کر آسمام یہ چرچا کر رہا ہے کہ عرب کا سورج ہے۔لیکن عدل یہ کہتا ہے کہ خاموش! یہ بے ادبی ہے۔دراصل آسمان

کا سورج حضرت عباسؑ کے گالوں (رخساروں) کے عکس کا لقب ہے۔ یہ خدا کی فطرت ہے اس لئے ہر ایک اس (حضرت عباسؑ) کی حشمت وعظمت اور شان وشوکت کو نہیں سمجھ سکتا۔ اس کو وہ انسان سمجھ سکتا ہے جو خدا کی ذات سے واقف ہو یعنی مرد مومن ہی اس مرتبے کو پہچان سکتا ہے۔

بند نمبر ۹:۔ یوسف ہے یہ کنعاں میں، سلیماں ہے سبا میں

اس بند میں شاعر تلمیحات کی روشنی میں حضرت عباسؑ کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ خوبصورتی میں یہ کنعان کا یوسف ہے اور دولت وانشوری کے اعتبار سے سبا کا سلیمان، معجزے یعنی کرامات میں حضرت عیسیٰؑ ہے جب کہ عبادت میں حضری موسیٰؑ، صبر میں حضرت ایوب ہے اور فریاد میں یحییٰ ہے۔ اسی طرح مظلومیت میں شبیر (حضرت امام حسینؑ) ہے اور لڑائی میں حیدر (حضرت علیؑ)۔ کس لئے دکھ ہو کہ حضرت آدم کی نہ کوئی ماں ہے اور نہ کوئی باپ۔ بلکہ فخر کی بات تو یہ ہے کہ حضرت عباسؑ جیسا بیٹا حضرت آدمؑ نے دنیا میں مقرر کیا ہے۔

بند نمبر ۱۰:۔ قربان ہوائے علم شاہِ اُمم کے

اے جھنڈے جماعت کے بادشاہ (حضرت امام حسینؑ) پر فدا ہو۔ تمام کانٹے سبز ہو کر جنت کے سرو بن جائیں کرم وفضل کرنے والے خدا کا بھید کھلا ہوا ہے کہ حضرت عباسؑ جھنڈے کے آنچل میں اس طرں دکھائی دے رہے ہیں گویا حضرت جبرائیل پنکھ کھولے (ظاہر) ہوئے ہیں۔ حضرت عباسؑ کے ہاتھ میں جو جھنڈا تھا اس کا جس جگہ بھی سایہ پڑتا گویا بجلی چمک رہی تھی۔ اس چمک دھمک والا جھنڈا نہ تو کہیں آنکھوں کے مسافروں نے دیکھا تھا اور نہ ہی کہیں کانوں کے جاسوسوں نے سنا تھا۔

بند نمبر ۱۱:۔ قرنا میں نہ دم ہے، نہ جلاجل میں صدا ہے

شاعر فرماتے ہیں کہ نہ بگل میں طاقت ہے اور نہ ہی جھانجھ میں وہ آواز۔ یہاں تک کہ نرسنگا وڈھول ونقارے کی پھونک (دم) بھی معدوم ہو گئی ہے یعنی حضرت عباسؑ کی دہشت سے میدان جنگ میں ان تمام باجوں کی گھن گرج نہ کے برابر ہے اور صرف مغرور (باغی) کے دلوں کی دھڑکنوں کا شور برپا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ نذرانہ کا باجا بھی بج رہا ہے۔ کوس اور ڈفلی کی دھیمی آواز سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ نجف کے بادشاہ (حضرت علیؑ) کا جانشین (فرزند) وارد ہو رہا ہے۔

بند نمبر ۱۲:۔ مدّاح کو اب تازگی نظم میں کد ہے

شاعر فرماتے ہیں کہ تعریف کرنے والے یعنی خود شاعر کو تازہ کلام کہنے میں دقت آرہی ہے۔ لہٰذا اے علیؑ کے حضرت عباسؑ یہ مدد کرنے

کا وقت ہے۔ چونکہ بادشاہ کی امداد سے جو کلام تخلیق ہوگا، اس قدر قابل اعتبار ہوگا کہ ماسوائے دشمن کے باقی تمام اسے تسلیم کریں گے۔ مجھے دشمن سے انعام مطلوب نہیں۔ میرا واسطہ تو حسینؑ کی بادشاہت سے ہے یعنی میں اپنی شاعری کا صلہ ان سے چاہتا ہوں۔

بند نمبر ۱۳:۔ گُل زار ہے یہ نظم و بیاں، بیشہ نہیں ہے

شاعر اپنے فن کی سراہانہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میری شاعری گلشن ہے یعنی جس طرح باغ میں رنگ برنگے پھول کھلتے ہیں ٹھیک اسی طرح میں نے بھی اپنے کلام میں تشبیہہ، استعارہ، مجاز اور کنایہ وغیرہ کا بروقت استعمال کیا ہے۔ میرا سخن جنگل نہیں ہے یعنی میرا کلام خامیوں سے پاک ہے۔ میری شاعری کے باغ میں سرکش بھی بے فکر و خوف سیر کرسکتا ہے یعنی لطف اٹھا سکتا ہے۔ میرا ہر مصرعہ انعام کا حق رکھتا ہے یہ کوئی پتھر توڑنے والا اوزار نہیں ہے۔ یہ کلام میری ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہے کوئی گوشت پوشت کا ٹکڑا نہیں۔ میری شناخت اسی اعلیٰ پایہ کی شاعری سے ہے۔ میرے ہاتھ میں قلم اس طرح ہے گویا جیسے شاعری کی نبض میرے قبضے میں ہے۔

بند نمبر ۱۴:۔ گر کاہ ملے، فائدہ کیا کوہ کنی سے

شاعر فرماتے ہیں اگر پہاڑ کھودنے سے سوکھی کٹی گھاس حاصل ہو تو پھر اتنی محنت و مشقت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں اپنی رنگین شاعری سے سوکھی کٹی گھاس کو بھی پھول بنا دیتا ہوں یعنی ناچیز کو اعلیٰ مرتبہ پر پہنچاتا ہوں۔ میرے الفاظ ملک یمن کے عقیق سے قیمتی ہیں گویا اعلیٰ پایہ کے ہیں۔ لوہے کو ملائم (سخت چیز کو نرم) کر کے حیران کردوں گا اور پتھر کو جلا کر اس سے خوشبو نکال دوں گا۔ میرے پاس یہ تمام اثاثہ مدینہ کے بادشاہ (حضرت امام حسینؑ) کے دکھ میں مرثیہ خوانی کی وجہ سے ہے۔

بند نمبر ۱۵:۔ گو خلعتِ تحسیں مجھے حاصل ہے سراپا

اگرچہ بادشاہ کی طرف سے مجھے انعام کی تحسین حاصل ہے لیکن اس کے باوجود تمام بدن کی تعریف کرنا مشکل ہے۔ چونکہ اس بدن (حضرت عباسؑ) کا ہر جز (حصہ) بے انتہا طاقت رکھتا ہے۔ دراصل یہ وجان ہے جس میں از سرتا پا جوش و حوصلہ ہے اگر کہیں کسی بات سے تکرار بھی ہو تو اس سے حاصل کچھ نہیں ہونے والا کیونکہ ہماری تحریر کسی اور کے مضمون مطابقت نہیں رکھتی۔

بند نمبر ۱۶:۔ سورج کو چھپاتا ہے گہن، آئینے کو زنگ

سورج کو گرہن لگ جاتا ہے اور آئینہ کو رنگ پڑ جاتا ہے۔ چاند بھی داغ دار ہے اور اچھے رنگ والا لالہ (سرخ رنگ کا پھول) بھی افسردہ

ہے۔موتی اور لعل کی اصلیت یہ ہے کہ موتی پانی ہے جب کہ لال پتھر ہوتا ہے۔ پھول اور کلی کو بھی اگر دیکھو تو دونوں پریشان ہیں غرض یہ کہ سورج ،چاند، لالہ، موتی لعل، پھول اور کلی غرض یہ سب اللہ میاں کی تخلیقات ہیں۔اس صورت (حضرت عباسؑ) کو بھی گناہوں سے پاک رکھا۔

بند نمبر ۱۷:۔انساں کہے اس چہرے کو کب چشمۂ حیواں

آدمی اس مکھڑے (حضرت عباسؑ) کو کیسے چشمہ خضر کہہ سکتا ہے۔چونکہ یہ (حضرت عباسؑ) اجالا ہے اور وہ (چشمہ خضر) اندھیرا، یہ سامنے ہے اور وہ پوشیدہ۔اگر اسے (حضرت عباسؑ کو) چاند،سورج اور شیشے سے تشبیہ وستعارہ بھی دیا جائے تو وہ بھی درست نہ ہوگا کیونکہ ایک طویل عرصے سے روشن چاند کوڑھ کی بیماری میں مبتلا ہے اور ایک زمانے سے سورج کو بھی جانڈس ہے لہٰذا ان کا کوئی علاج نہیں۔اسی طرح اگر اسے (عباسؑ) شیشہ کہا جائے تو تب بھی بات نہیں بنتی، کیونکہ شیشے میں زنگ پڑھنے سے چمک کم ہو جاتی ہے اس کے برعکس اس میں ہر وقت نور ہے یعنی اس پر زنگ اثر کر ہی نہیں سکتا۔

بند نمبر ۱۸:۔آئینہ کہا رُخ کو تو کچھ بھی نہ ثنا کی

اگر اس کے رخسار (حضرت عباسؑ) کو شیشہ کہا جائے تو ذرا بھی تعریف نہیں ہوئی چونکہ شیشہ سکندر کی کاری گری ہے یعنی اس کو بنانے والا انسان ہے جب کہ اس رخ (حضرت عباسؑ) کا کاری گر خدا ہے۔شیشے پر چمک مٹی کے ذرّوں سے ہے اور اسے (حضرت عباسؑ) فطرت نے روشن کیا ہے۔غرض یہ کہ ایسا کوئی شیشہ نہیں جس کو تقدیر نے اس (حضرت عباسؑ) کا جیسی چمک دی ہو، کیونکہ ہر شیشے میں انسانی صورت دکھائی دیت ہے لیکن اس رخسار (حضرت عباسؑ) میں حضرت علیؑ کا حسن نظر آتا ہے۔

بند نمبر ۱۹:۔بے مثل جبیں ہے نگہ اہل یقیں میں

اس (حضرت عباسؑ) کا ماتھا بے مثال اور نظر بھروسے والی ہے۔القصہ آسمانوں اور زمین پر یہ ایک ایسا سورج ہے جس کے ماتھے کے نزدیک بھوؤں کی چمک بھی انوکھی ہے۔ایسا لگتا ہے کہ روشن سورج میں دو مچھلیاں ہیں۔شاعر نے یہاں بھوؤں کو مچھلیوں سے استعارہ دیا ہے۔ماتھے پر بھوؤں کا آنکھ کی پتلیوں واسطے رمز (کنایہ) ہے کہ بلند آسماں پر دو نئے چاند (ہلال) جلوہ افروز ہیں۔

بند نمبر ۲۰:۔بینی کے تو مضموں پہ یہ دعوا ہے یقینی

شاعر فرماتے ہے کہ ناک کی تعریف میں جو تحریر کر رہا ہوں یقیناً میرا ارادہ ہے کہ یہ (تحریر) اس کلام کے خدوخال کی آبرو ہوگی۔چونکہ

عرش نشینی (آسمان پر بیٹھنا) نظر کو پسند تھا اس لئے محض نور (تجلی) نے ہی دیکھنے کے عکس کو دلچسپ بنایا۔ دراصل مجھے سہارا اسی ناک کی محبت کا ہے ورنہ جس راستے پر میں قدم رکھا ہے وہ ایمان کے راستے سے بھی بڑھ کر ہے یعنی مشکل و نازک کام کو میں نے ہاتھ میں لیا ہے۔

بند نمبر ۲۱:۔ بینی کو کہوں شمع تو لَو اس کی کہاں ہے؟

اگر اس کے نام کو چراغ سے تشبیہ دوں، تو چراغ میں اس جیسی لو نہیں ہے لیکن اس کی چمکدار بھوؤں پر مجھے شعلے کا گماں ضرور ہوتا ہے۔ یہ بھی انوکھی بات ہے کہ ایک چراغ اور دو شعلے یعنی ناک چراغ کی مانند ہے اور ناک کے اوپر دو بھویں گویا شعلے ہیں، مگر معلوم ہو گیا کہ بالوں کے شعلوں سے تیز ہوا رواں ہے۔ پس انہیں بھویں مت سمجھو بلکہ یہ مان لینا چاہئے کہ ہوا کی وجہ سے چراغ کی یہ لو کبھی ادھر ہے اور کبھی اُدھر۔

بند نمبر ۲۲:۔ گر آنکھ کو نرگس کہوں، ہے عین حقارت

اگر اس کی آنکھ کو نرگس کے پھول سے تشبیہ دی جائے تو یہ بھی بے عزتی کا مقام ہے چونکہ نرگس کے پھول میں نہ تو مژہ ہے نہ پھپھوٹا، اور نہ ہی دیکھنے کی قوت ہے۔ اس کے چہرے پر ہلال (نیا چاند) کا اشارہ درست ہے۔ چونکہ نیا چاند عید کی خوشخبری لاتا ہے اور یہ (عباسؑ) حضرت حیدر کا مژدہ ہے۔ عباسؑ کی بھوؤں میں جو نور و حرکت ہے وہ ہلال (نیا چاند) میں نہیں ہے کیونکہ نیا چاند صرف ایک رات نیا ہوتا ہے جب کہ یہ (عباسؑ) چاند ہر رات نیا ہے۔

بند نمبر ۲۳:۔ مُنھ غرقِ عرق دیکھ کے، خورشید ہوا تر

حضرت عباسؑ کا چہرہ پسینے میں اس طرح ڈوبا ہوا ہے گویا سورج نم آلود ہے اور اس کی بھوؤں سے خالص تلوار کی خوبی نظر آ رہی ہے یعنی اس کی بھویں تلوار کی طرح چمک رہی ہیں۔ اس کی آنکھوں کا پسینہ بادام کے تیل سے زیادہ چمکدار ہے، جب کہ رخسار کا عرق گلاب کے سرخ پھول جیسا ہے۔ سورج مکھی کے پھول جس طرح خوشبو بکھرتی ہے اسی طرح عباسؑ کے نورانی چہرے سے پسینے کی بوند ٹپک رہی ہے۔

بند نمبر ۲۴:۔ تسبیح گُناں منھ میں زباں آٹھ پہر ہے

ہر وقت خدا کی پاکیزگی بیان کرنے والی زبان اس (عباسؑ) کے منہ میں اگرچہ سرسبز شگوفے کے بیچ میں پھول کی تازہ پتی کی مانند ہے لیکن جو آب و تاب اس کی زبان میں ہے وہ شگوفے و گلاب کے پھول کی پتی میں نہیں ہے۔ گویا اس کے منہ میں زبان سورج کے گنبد کے بیچ میں مچھلی کی طرح ہے۔ عباسؑ کے ہونٹوں کی تعریف کرتے وقت میرا ہونٹ اس قدر نم آلود ہوا گویا دنیا ہی میں جنت کی نہر کا پانی میرے ہونٹ کے

قبضے میں آ گیا ہے یعنی جس قدر میرے ہونٹ لطف اندوز ہوئے ہیں وہ بیان سے باہر ہے۔

بند نمبر ۲۵:۔ یہ مُنہ جو ردیف لب خوش رنگ ہوا ہے

ہونٹ کے اخیر میں خوش رنگ (پسندیدہ رنگ والا) منہ جس کو دیکھ کلی بھی شرما گئی ہے مجھے فوراً اس کی تعریف کا اگر چہ ارادہ ہوا ہے لیکن اس خوش رنگ منہ کو شگوفہ کہنا اس لئے بدنامی کا باعث ہے کیونکہ شگوفے سے نہ تو خوشبو آتی ہے اور نہ ہی اہل زبان اسے تسلیم کرتے ہیں گویا اہل زبان حضرات منہ کو شگوفے سے تشبیہ دینے سے پرہیز کرتے ہیں۔

بند نمبر ۲۶:۔ جانِ فصحا، روحِ فصاحت ہے تو یہ ہے

شریں زبان سے روح کی خوش کلامی اور فصیح کلام کی نشانی یہی ہے کہ ہر لفظ برمحل آئے۔خوبی اس نازک مزاجی کے سامنے لاجواب ہے گویا اس کی زبان میں حضرت عیسیٰ جیسا معجزہ ہے کہ جن کے دم سے بیمار تندرست اور مردے زندہ ہو جاتے تھے۔زبان کی نفاست پر گفتگو کرتے وقت میرے ہونٹوں پر الفاظ شعر میں اس طرح ڈھل رہے ہیں گویا لعل سے عرق نکل رہا ہے۔

بند نمبر ۲۷:۔ دانتوں کی لڑی سے، یہ لڑی عقل خدا داد

شاعر فرماتے ہیں کہ چمکدار دانتوں کی قطار جو خدا کی دانائی کا نتیجہ ہے کی تعریف میں اب میں وہ بات کہنے کی جرأت کر رہا ہوں جو آپ کو ہمیشہ یاد رہے گی۔حضرت عباسؑ کے دانت اگر چہ گویا وُہر کی مانند صاف و چمکدار ہیں اور ابجد کے اعداد میں شمار کرنے سے عباسؑ اور نجف کا جوڑ بھی برابر آتا ہے یعنی ۔(ع+ب+ا+س=ن+ج+ف)(۷۰+۲+۱+۶۰=۱۳۳=۵۰+۳+۸۰=۱۳۳) لیکن اس کے باوجود عباسؑ کے دانتوں کو کان سے نکالنے والے گوہر سے برتری حاصل ہے لہٰذا یہ دانت اس موتی کی مانند ہے جو نجف میں پایا جاتا ہے گویا یہ عمدہ قسم کے موتی مانند ہیں۔

بند نمبر ۲۸:۔ اثنا عشری اب کریں ہاتھوں کا نظارا

حضرت عباسؑ کا تعلق چونکہ شعیہ مسلمانوں کے اس فرقہ سے تھا جو بارہ اماموں کو مانتا ہے لہٰذا اس نسبت سے شاعر نے یہاں اثنا عشری کا استعمال کیا ہے۔اثنا عشری یعنی بارہ والے کے ہاتھوں کی تعریف کرتے ہوئے شاعر فرماتے ہیں کہ اس کی دس انگلیوں (دونوں ہاتھوں) کے بیچ میں جھنڈا گویا جنگ میں مقابلہ کرنے والا ہے۔عباسؑ واسطے ہر ہاتھ (سپاہی) کا یہ اشارہ ہے کہ اے ایمان والو! یوم عاشور میں یہ نشان رکھنا یعنی

اوّل میں بادشاہ وسردار کا ماتم کرنا،اس کے بعد جھنڈے کے نیچے اس کے علم دار یعنی حضرت عباسؑ کو آنسوں بہانا۔

بندنمبر۲۹:۔تا موے کمرِ فکر کا رشتا نہیں جاتا

مرتے دم تک فکر کی کمر کا دھاگا نہیں ٹوٹتا یعنی جب تک آدمی زندہ ہے تب تک فکر کی قرابت رہتی ہے اور شک بھی بالکل نہیں جاتا،لیکن اعلیٰ فکر پر میرادعویٰ ہے جس مضمون کو میں تحریر کررہاہوں اسے شعر میں باندھنا اس لئے آسان نہیں کیونکہ عباسؑ نے کمر میں جوشرربار(چنگاریاں برسانے والی تلوار)سجائی ہے اس کو دیکھ کر یوں لگ رہا ہے کہ جیسے شعلے کو بال سے گانٹھا ہے،یعنی ناممکن کام کیا ہے۔

بندنمبر۳۰:۔مشتاق ہوں اب عالم بالا کی مدد کا

شاعرفرماتے ہیں کہ حضرت عباسؑ کے قامت کا کلام زیربحث ہونے کے ناطے میں آسمان کی مدد کا منتظر ہوں۔حضرت علیؑ کے فرزند کا قد اس قدر اونچا ہے گویا خدا کی حمد کرنے والے(حضرت محمدؐ)کے عکس کا مجسمہ ہے۔اس قامت پر دوبھوؤں کی دل ربائی(کشش)کون جان سکتا ہے۔اس کا نام الف کی مانند ہے اور بھویں دومد کی طرح ہیں یعنی خدا نے ایک الف پر دومد کھینچے ہیں۔

بندنمبر۳۱:۔نے چرخ کے سودورے،نہ اک رخش کا کاوا

گھوڑے کی تعریف کرتے ہوئے شاعرفرماتے ہیں کہ گھوڑے کو چکر دینے سے اس کے سموں سے جودائرہ زمین میں پیدا ہوتا ہے وہ آسمان کے سوچکروں کے برابر ہے اور بہتے ہوئے وقت کو بھی فریب دیتا ہے۔بناوٹ کے علاوہ یہ سلیقہ وطرز ہے۔یہ نہ شوخی ہے نہ آسیب (پریت)بلکہ اللہ کی فطرت ہے یہ گھوڑا عجیب چال سے چلتا ہے جس کے سامنے موت کا قدم بھی بے حس ہے۔اسے گھوڑا مت کہو بلکہ یوں کہو کہ اس نے ہوا کا طرز سیکھ لیا ہے یعنی ہوا کی طرح تیز رفتار ہے۔

بندنمبر۳۲:۔گردش میں ہراک آنکھ ہے فانوسِ خیالی

حرکت میں ایک ایک آنکھ کاغذی چراغ دان کی مانند ہے اور اس کے سم میں جو آہنی حلقے جڑے ہوئے ہیں وہ بھی مخصوص ہلالی کی طرح ہیں۔اس کی چمک دمک سے ایسا لگتا ہے کہ تیسرے آسمانی برج نے لگام کندھے پرڈالی ہے۔اسی طرح رکابوں کی تعریف جو کی ہے وہ مبالغہ آرائی نہیں بلکہ سچائی ہے۔اس کی حرکت وقت بے وقت انوکھی ہے اور چودھویں رات کی چاندنی کی مانند اس گھوڑے کی آنکھوں میں باندھا جھالر چمک رہا ہے۔

بند نمبر ۳۳:۔ ٹھہرے، تو فلک سب کوز میں پر نظر آئے

جب یہ گھوڑا رکتا ہے تو ہر کسی کو یہ لگتا ہے کہ زمین پر آسمان ہے یعنی اتنا اونچا ہے اور جب دوڑتا ہے تو لگتا ہے کہ زمین اونچے آسمان پر ہے۔ گویا یہ گھوڑا شاہین ہے جو ہوا میں کہیں نظر نہیں آتا، صرف سوار ہی کاٹھی کے دامن میں نظر آتا ہے۔ اس سوار اور گھوڑے کی اگر ایک ساتھ تعریف کی جائے تو گویا یہ خدا کی دانائی اور وہ خدا کی مرقی کا کرشمہ ہے۔

بند نمبر ۳۴:۔ شوخی میں پری، حسن میں ہے حور بہشتی

یہ گھوڑا شرارت (اچھل کود) میں پری (پرستان کی عورت) جیسا ہے۔ اور جنت کی عورت (حور) کی طرح خوبصورت ہے۔ جب کہ مصیبت میں سوار کے لئے نجات کا ذریعہ ہے گویا اس کشتی کی مانند ہے جو حضرت نوح نے طوفان سے محفوظ رہنے کے لئے تیار کی تھی۔ جو پاک سیرتی اس گھوڑے میں ہے ویسی سلسلہ شب وروز میں نہیں ہے کیونکہ یہ (گھوڑا) نیکی و بھلائی ہے اور وہ (سلسلہ شب وروز) بدی و بدشکلی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جنگل میں باغ ہے اور باغ موسم بہار ہے۔ گھوڑا تھان پر ہے اور میدان جنگ میں تلوار ہے۔

بند نمبر ۳۵:۔ اس رخش کو عباس اڑاتے ہوئے آئے

اس قسم کے گھوڑے پر سوار ہو کر حضرت عباسؑ بڑائی کا ڈنکا بجاتے ہوئے تشریف لائے اور تکبیر کا نعرہ اس طرح بلند کیا گویا گہری نیند میں سونے والے بھی جاگ اٹھے۔ ہر ایک پر تیغ نگہہ (تیز نظر) لگاتے ہوئے نمودار ہوئے۔ انہوں نے بغیر چلّے کے اپنی بھوؤں کی کمان کو تانا ہوا تھا اور بغیر ہاتھ کے اپنی پلکوں کی نیزوں کو کھینچا ہوا تھا یعنی ان کے تیور چڑھے ہوئے تھے اور آنکھ کی پلکیں نیزوں کی طرح تنی ہوئی تھی۔

بند نمبر ۳۶:۔ لکھا ہے مورخ نے کہ اک گبر دِلاور

تاریخ دان لکھتا ہے کہ ایک بہادر مغرور جو لگاتار سات دنوں سے میدان جنگ کے بیچ قیام زاہ تھا۔ دھات کے جسم سے بنا وہ سرکش بے رحم اور برے دل والا تھا یعنی اس کی نیت اچھی نہیں تھی۔ اس نے بڑے بڑے بہادروں کو موت کے گھاٹ اتار کر کئی جنگیں فتح کیں تھی۔ اس ظالم کے ساتھ فوج بھی تھی اور شہرت و دبدبہ بھی تھا۔ وہ شام کے ملک کی جاگیر حاصل کرنے کے لئے پہل قدمی کر رہا تھا۔

بند نمبر ۳۷:۔ تقدیر جو رَن میں شب ہفتم اُسے لائی

تقدیر نے اسے سات راتوں سے جو میدان جنگ میں ٹھہرایا تھا تنہائی میں عمر بن سعد نے اس کو یہ بات سنائی تھی کہ لڑائی میں ہمارا سامنا

سید خاندان سے ہے۔ان کی فوج میں صرف چند ہاشمی جوان ہیں جب کہ ہماری طرفداری پوری دنیا کر رہی ہے۔ہمیں نہ تو علی اکبرؑ کا، نہ حضرت قاسمؑ کا اور نہ ہی حضرت امام حسینؑ کا ڈر ہے ہماری بے شمار فوج کو اگر کسی کا خوف ہے تو وہ صرف شمشیر خدا (حضرت عباسؑ) کا۔

بند نمبر ۳۸:۔بولا وہ لرز کر کہ ہو مجھ کو بھی وسواس

وہ بدبخت جو ایک ہفتے سے میدان جنگ میں قیام زدہ تھا کانپ کر کہنے لگا کہ مجھے بھی یقین ہو کہ شمشیر خدا کون ہے؟ عمر بن سعد نے جواب دیا کہ عباسؑ۔عمر بن سعد کا جواب سن کر رہ سرکش کہنے لگا کہ پھر تجھے کامیابی کی امید کیسے ہے؟ اس پر عمر بن سعد کہنے لگا کہ کئی دنوں سے وہ بہادر پیاسا ہے۔اگر چہ ہم بھی دلیر و نڈر ہیں لیکن اگر جان نکلتی ہے تو عباسؑ سے یعنی ہمیں ڈر اسی کا ہے۔

بند نمبر ۳۹:۔تشریف علم دار جری رن میں جو لایا

جوں ہی بہادر عباسؑ نے میدان جنگ میں تشریف لائی تو اس سرکش کو عمر بن سعد نے خاموشی سے یہ کہا کہ جس بہادر کے آنے کا شک تھا وہی میدان جنگ میں آیا ہے۔عمر بن سعد کی بات سن کر اس (سرکش) نے دور سے عباسؑ کی طرف سر اٹھایا اور کانپتے ہوئے لڑنے والی فوج سے کہا کہ خود بزدل ہو اور مجھے حضرت عباسؑ سے لڑوا رہے ہو۔

بند نمبر ۴۰:۔مانا کہ خدا یہ نہیں، قدرت ہے خدا کی

میں مانتا ہوں کہ اگر چہ یہ خدا نہیں ہے لیکن خدا کی قدرت کا کرشمہ ضرور ہے۔مجھ میں محض فریب و ظلم ہے لیکن اس میں خدا کی طاقت ہے۔خدا کا کرم ہے کہ میری اچھی مہمانوازی کی۔سرکش کی بات سن کر تمام کہنے لگے کہ تجھ پر بھی خدا کی بخشش ہے لہٰذا ٹال مٹول نہ کر بلکہ فوراً میدان جنگ کا رخ کر، چونکہ بہادروں کا نام اسی سے ہے۔پھر رعب و داب اور طاقت میں تو بھی کسی سے کم نہیں ہے

بند نمبر ۴۱:۔بادل کی طرح سے وہ گرجتا ہوا نکلا

جنگی ہتھیاروں سے لیس وہ مغرور بادلوں کی طرح کڑکتا ہوا اچانک سامنے آیا۔ہر قدم پر عمر بن سعد کو پیچھے چھوڑتے ہوئے وہ مغرور کوس بجاتا ہوا نمودار ہوا۔وہ دنیا کے لوگوں پر تہمتن کی طرح (ایران کا ایک بہادر) زور آور تھا۔جس جگہ پر بھی وہ قدم رکھتا تھا اس جگہ زمین ولدل بن جاتی تھی۔

بند نمبر ۴۲:۔تیار کمر کس کے ہوا جنگ پہ خوں خوار

وہ ظالم اس طرح جنگ کے لئے کمر بستہ تھا کہ گویا کہ موت کا قاصد قبر کے لئے پیغام لے کر آ رہا ہے۔کبھی بھالہ اور کبھی تلوار میں اپنا چہرہ

دیکھ ہاتھا۔یکا یک وہ کمینہ موت کی سوجن کی طرح گھوڑے پرسوار ہوا۔وہ گھوڑے پراس طرح لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی سنہری تاروالے تخت پر براجمان ہے۔اس کودیکھ کر میدان جنگ میں شوراٹھا کہ پہاڑی چکّو رپر پہاڑ سوار ہے۔

بندنمبر۴۳:۔اس ہیبت وہیبت سے وہ نخوت سیر آیا

وہ گھمنڈی اس دہشت کے ساتھ سامنے آیا کہ جس کے سائے سے دیو(پریت) بھی خوف کھانے لگے اور میدان جنگ میں محشرکو بھی ہنگامہ نظر آنے لگا۔اپنے واسطے اس نے نیزوں پر لاشوں کے گول سرلائے تھے۔وہ اس طرح ہرقطار سے آگے بڑھ رہا تھا کہ جیسے کوئی تروتازہ سیر کے واسطے نکلا ہواور دکھاوے کے طور پر ہتھیاروں کی نوکوں پر مردہ لاشوں کے سر چڑھائے ہوئے تھے۔

بندنمبر۴۴:۔سیدھا کبھی نیزے کو ہلایا، کبھی آڑا

بھالے کو وہ کبھی سیدھا ہلاتا تھا اور کبھی ٹیڑھا۔وہ اس طرح فخریہ اشعار میدان جنگ میں پڑھ رہا تھا کہ گویا خوش بیانی کی دھجیا اڑادی تھیں اور شقی نے کئی خاندانوں کو زیرخاک کیا ہوا تھا۔اس کا دعویٰ تھا کہ میری دہشت نے کئی بہادروں کے جگر پھاڑ دیے ہیں۔میرا مقابلہ نہ تورستم کرسکتا ہے اور نہ ہی سہراب۔مجھے مرحب بن عبدالقمر کے لقب سے جانا جاتا ہے یعنی میں عبدالقمر کا فرزند مرحب ہوں۔

بندنمبر۴۵:۔فتراک میں سر باندھتا ہوں پیل دماں کا

میں طاقت ور ہاتھی کا سر(گردن) شکار باندھنے والی رسی میں باندھ دیتا ہوں۔اور غصے سے بھرے ہوئے شیرکو بھی قابو میں کرلیتا ہوں۔براہ مہربانی برچھی کی ہرنوک کو دیکھیے جس پر نہ معلوم شخص کے بیٹے کا سر چڑھا ہوا ہے۔اس زمانے میں جتنے بھی پرانے پہلوان تھے ان کے جسم زمین کے نیچے دفن اور سر میری زینت میں ہیں یعنی ان کو تہہ خاک کرکے ان کے سر نیزوں پر چڑھائے۔

بندنمبر۴۶:۔یاں سیف زباں، سیف الٰہی نے علم کی

اس سرکش کا کلام سن کر حضرت عباسؑ بولے کہ میری تیز زبان اللہ کی عظمت کا کرشمہ ہے یعنی میری زبان سے نکلی ہر بات خدا کے دربار میں اثر کرتی ہے۔گویا میری دعا قبول ہوتی ہے لہٰذا اب زیادہ منہ کھولا تو زبان کاٹ دوں گا۔دونوں جہاں میرے دروازے پر سر جھکاتے ہیں یعنی دونوں جہاں سکہ مانتے ہیں۔حضرت علیؑ کی طرح ہم بھی طاقت ور ہیں گویا ہماری مٹھی میں خدا کے ہاتھ (حضرت علیؑ) کی طاقت ہے۔

بند نمبر ۴۷:۔ عبدالقمر نحس کا تو داغ جگر ہے

تو عبدالقمر بد بخت کا فرزند ہے۔ارے تجھے یہ معلوم ہے کہ میں حضرت علیؑ کا تاج (چندیا) ہوں۔تیری خورشید پرستی (سورج کی پوجا کرنے والا) سے مجھے کوئی خوف نہیں ہے کیونکہ آسمان، سورج اور چاند کی ڈوری میرے قابو میں ہے۔میرے والد سورج کو واپس کرنے کی قدرت رکھتے تھے یعنی سورج کا اپنی معمولی گردش سے پھرنا ان کے اختیار میں تھا، جب کہ چاچا (حضرت محمدؐ) نے انگلی سے چاند کے دو ٹکڑے کئے تھے۔

بند نمبر ۴۸:۔ خورشید درخشاں میں بتا نور ہے کس کا

تو مجھے یہ بتا کہ چمکتے ہوئے سورج میں روشنی کس کی ہے؟ کس کا چاند کے ٹکڑے پر اوپر لکھا گیا خدا کا نام ہے اور سورج میں جو قرآن مجید کا باب رقم ہے اس میں کس کا ذکر ہے؟ اور ذرّے کو سورج بنانے کی قدرت کون رکھتا ہے؟ غرض اس دولت کے مالک یعنی یہ مالدار یا تو حضرت محمدؐ اور حضرت علیؑ ہیں یا پھر ہم (عباسؑ)، جو نبی پر قربان ہونے والے جانشین کے غلام ہیں۔

بند نمبر ۴۹:۔ دو، چاند کو کرتی ہے، اک انگشت ہماری

چاند کو دو ٹکڑوں میں کرنے کی طاقت ہماری انگلی میں ہے کیونکہ ہمارا تعلق مہر نبوت (نقش نبوت جو رسولؐ کے دونوں مونڈھوں کے درمیان تھا) کی نسل سے ہے۔ ہماری تلوار مصیبت کے وقت ایسی کامیاب کاٹ کرتی ہے کہ ایک ہی وار میں سو گرز (ایک ہتھیار جو اوپر سے گول اور نیچے سے پتلا ہوتا ہے) کے برابر چوٹ مارتی ہے۔اے ظالم قدرت نے سرکنڈوں کا جو جنگل بنایا ہے ہم اس کے شیر ہیں یعنی ہم وہ شیر ہیں جو سرکنڈے کے جنگل میں قیام کرتے ہیں۔اے بد بخت ہمارا شمار ان بہادروں میں ہوتا ہے جو تلوار چلانے کی مہارت رکھتے ہیں۔

بند نمبر ۵۰:۔ احمد ہے چچا میرا، پدر حیدر صف در

حضرت محمدؐ میرے چچا ہیں جو پوری کائنات کے پیغمبر ہیں اور حضرت علیؑ میرا والد ہے جو دونوں جہاں کا پہرے دار ہے۔ جب کہ میری ماں (ام لبنین)، ماں زینبؑ کی نوکرانی ہے۔ بھائی ایک میرا عثمانؑ، دو عبداللہؑ اور جعفرؑ ہیں۔حضرت حسنؑ اور حضر امام حسینؑ ہمارے سپہ سالار ہیں ہم ان کے غلام ہیں اور وہ ہمارے آقا ہیں۔

14.3 سرگرمی۔ آؤ اپنی معلومات جانچیں

سرگرمی (معروضی سوالات)

درج ذیل سوالات کے صحیح جواب پر نشان لگائیے:

1۔ " کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے" کے شاعر کون ہیں؟

الف۔ میر انیس　　ب۔ مرزا سلامت علی دبیر　　ج۔ الطاف حسین حالی　　د۔ علامہ اقبال

2۔ اس مرثیے کا مرکزی کردار کون ہے؟

الف۔ حضرت علی اکبرؑ　　ب۔ حضرت قاسمؑ　　ج۔ حضرت عباسؑ　　د۔ حضرت حرؒ

3۔ اس مرثیے کا بنیادی موضوع کیا ہے؟

الف۔ غزل　　ب۔ قصیدہ　　ج۔ حضرت عباسؑ کی شجاعت اور وفاداری　　د۔ مثنوی

4۔ حضرت عباسؑ کو مرثیے میں کس لقب سے یاد کیا گیا ہے؟

الف۔ ساقیِ کوثر　　ب۔ علمدار　　ج۔ فاتحِ خیبر　　د۔ سیف اللہ

5۔ مرثیے میں حضرت عباسؑ کس مقصد کے لیے فرات کی طرف جاتے ہیں؟

الف۔ جنگ سے واپس آنے کے لیے　　ب۔ پانی لانے کے لیے

ج۔ دشمن سے صلح کرنے کے لیے　　د۔ لشکر جمع کرنے کے لیے

6۔ دبیر کا تعلق اردو شاعری کی کس صنف سے زیادہ مشہور ہے؟

الف۔ غزل　　ب۔ نظم　　ج۔ مرثیہ　　د۔ رباعی

7۔ اس مرثیے میں کس واقعے کی منظر کشی کی گئی ہے؟

الف۔ جنگِ بدر　　ب۔ جنگِ اُحد　　ج۔ واقعہ کربلا　　د۔ فتحِ مکہ

8۔ مرثیے میں حضرت عباسؑ کی کون سی صفت سب سے نمایاں ہے؟

الف۔ سخاوت　　ب۔ وفاداری اور شجاعت　　ج۔ ظرافت　　د۔ سیاحت

14.4 عمومی جائزہ

مرزا سلامت علی دبیؔر کا مرثیہ " کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے" اردو مرثیہ نگاری کی ایک بلند پایہ تخلیق ہے۔اس مرثیے میں واقعہ کربلا کے عظیم کرداروں کی شجاعت، دلیری، ایثار، وفاداری اور دینی حمیت کو نہایت مؤثر اور دل نشین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔دبیؔر نے اپنی غیر معمولی شاعرانہ صلاحیت کے ذریعے میدانِ کربلا کے مناظر کو اس انداز سے مجسم کیا ہے کہ قاری خود کو گویا اسی میدان میں موجود محسوس کرتا ہے۔ان کے الفاظ میں ایسی تاثیر، روانی اور فنی مہارت پائی جاتی ہے جو مرثیے کو صرف ایک ادبی تخلیق ہی نہیں بلکہ ایک تاریخی اور اخلاقی دستاویز بھی بنا دیتی ہے۔اس سبق کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مرثیہ صرف غم واندوہ کا اظہار نہیں بلکہ اسلامی تاریخ، انسانی اقدار، اخلاقی تعلیمات اور حق و باطل کی کشمکش کا آئینہ دار بھی ہے۔دبیؔر نے اپنے اس مرثیے میں واقعہ کربلا کو محض تاریخی واقعہ کے طور پر بیان نہیں کیا بلکہ اس کے پس منظر، کرداروں کے اوصاف، جنگی ماحول اور جذباتی کیفیت کو اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ ہر منظر زندہ اور مؤثر محسوس ہوتا ہے۔یہی دبیؔر کے فن کا امتیاز ہے کہ وہ قاری کے دل میں کرداروں کی عظمت اور ان کے مقصد کی سچائی کو راسخ کر دیتے ہیں۔

مرثیے کا مرکزی تصور حق کی سربلندی اور باطل کی شکست ہے۔شاعر نے میدانِ جنگ میں اہلِ بیتؑ کے جانبازوں کی بے مثال شجاعت، استقامت اور قربانی کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ ان کے کردار تاریخ کے عظیم ترین نمونوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔مرثیے میں بہادری محض جسمانی قوت کا نام نہیں بلکہ ایمان، یقین، صبر اور حق پر ثابت قدم رہنے کا استعارہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس مرثیے کا ہر بند قاری کے اندر دینی جذبہ، اخلاقی قوت اور حق پسندی کا احساس پیدا کرتا ہے۔دبیؔر کی منظر نگاری اس مرثیے کا سب سے نمایاں وصف ہے۔انہوں نے جنگ کی تیاری، لشکروں کی صف بندی، گھوڑوں کی ٹاپوں، تلواروں کی چمک، نیزوں کی یلغار اور میدانِ کارزار کی ہیبت کو نہایت فنی انداز میں پیش کیا ہے۔ان کی تصویر کشی اتنی جاندار ہے کہ ہر منظر آنکھوں کے سامنے چلتی ہوئی تصویر کی مانند محسوس ہوتا ہے۔اسی وجہ سے دبیؔر کا شمار اردو کے بہترین منظر نگار شعرا میں کیا جاتا ہے۔۔

14.5 فرہنگ

آسیب	:	بھوت، آسیب
آصفلاک	:	آسمان

آہن : لوہا

ابلق : دورنگا گھوڑا

ابرو : بھنویں

اعجاز : معجزہ

اعدا : دشمن

اعضا : جسم کے حصے

افلاک : آسمان

اکرام : عزت واحترام

الصور : صور پھونکنے کی آواز

الحشر : قیامت

الہجر : جدائی

الوصل : ملاپ

اموات : مردے

انی : نوک

اندیشہ : خوف،فکر

انگشت : انگلی

اہلِ سقر : دوزخی

اسلحہ : ہتھیار

اشرار : شریر لوگ

اطاعت : فرمانبرداری

افق : کنارہ آسمان

بکف : ہاتھ میں لیے ہوئے

بکا : گریہ، رونا

بلا : مصیبت

بلاغت : مؤثر اندازِ بیان

بصارت : بینائی

بغض : دشمنی

بیشہ : جنگل

بہمن : ایران کا مشہور پہلوان

بوق : جنگی باجا

بنی : ناک

تجلی : نورانی جلوہ

تحسین : تعریف

تدبیر : حکمت

ترکش : تیر رکھنے کا تھیلا

تعذیر : سزا

تقدیر : قسمت

تکبیر : اللہ اکبر کا نعرہ

تمثیل : مثال

تہمتن : رستم کا لقب

تیشہ	:	کلہاڑی
تیغ	:	تلوار
جفا	:	ظلم، بے وفائی
جلاجل	:	گھنٹیاں
جلودار	:	آگے چلنے والا
جلوہ	:	نورانی شان
جوشن	:	زرہ
جور	:	ظلم
جوزا	:	ایک آسمانی برج
حسب	:	خاندان
حجاب	:	پردہ
حباب	:	پانی کا بلبلہ
حاسد	:	حسد کرنے والا
حشر	:	قیامت
حقارت	:	معمولی سمجھنا
حیواں	:	آبِ حیات
حیلہ	:	چال
خورشید	:	سورج
خشم	:	غصہ
خلف	:	جانشین، بیٹا

خنجر : چھری

خوابیدہ : سویا ہوا

خود : خود،فولادی ٹوپی

دبدبہ : رعب وجلال

در بند : بند دروازہ

دربار : شاہی مجلس

درکار : ضروری

دہن : منہ

دنداں : دانت

دغا : فریب

دلاور : بہادر

رجز : جنگی اشعار

رحمت : مہربانی

رخش : تیز رفتار گھوڑا

رخسار : چہرہ

رگ وریشہ: جڑ

رہوار : تیز رفتار گھوڑا

رباعی : گھوڑے کی چوکڑی

رعب : ہیبت

رن : میدانِ جنگ

رواں	:	جاری، چلتا ہوا
رستم	:	ایران کا مشہور پہلوان
زرہ	:	جنگی لباس
زری	:	سونے کا
زوال	:	خاتمہ
زنگ	:	میل
زیں	:	زین
سجدہ	:	عبادت میں جھکنا
سحر	:	صبح
سراپا	:	سر سے پاؤں تک
سرور	:	سردار
سلاطین	:	بادشاہ
سمند	:	گھوڑا
سناں	:	نیزے کی نوک
سند	:	معتبر دلیل
سقا	:	پانی پلانے والا
سقر	:	جہنم
سکتہ	:	بے ہوشی
سیارہ	:	گردش کرنے والا فلکی جسم
شاہ	:	بادشاہ

شاہکار	:	بہترین نمونہ
شاہِ امم	:	امتوں کا سردار
شرف	:	عزت
شریعت	:	دین کا قانون
شقی	:	بدبخت
شمشیر	:	تلوار
شمع	:	چراغ
شہباز	:	باز
شہادت	:	راہِ حق میں جان دینا
شیدا	:	عاشق
شیرژیاں	:	بہادر شیر
شیرینی	:	مٹھاس
شور	:	ہنگامہ
شورش	:	ہلچل
شبیر	:	امام حسینؑ
شبر	:	امام حسنؑ
صاعقہ	:	بجلی
صنم	:	بت
صنمِ دیر	:	بت خانے کا بت
صفحہ	:	ورق

ضیابار : روشنی بکھیرنے والا

طائر : پرندہ

طمع : لالچ

طنطنہ : دبدبہ

طور : کوہِ طور

ظفر : فتح

ظلم : زیادتی

عارض : رخسار

عاشق : محبت کرنے والا

عاشقان : محبت کرنے والے

عقیق : قیمتی پتھر

عقدہ : گرہ

علمدار : پرچم بردار

عناں : لگام

عنایت : مہربانی

عرق : پسینہ

عصا : لاٹھی

عطا : بخشش

غارت : تباہ

غش : بے ہوشی

غلطاں : لڑھکتا ہوا

غمخوار : غم بانٹنے والا

غنچہ : کلی

غول : خوفناک مخلوق

فاتحہ : دعا

فدیہ : قربانی

فرات : دریائے فرات

فرش : بچھونا

فروکش : نیچے اترا ہوا

فصاحت : عمدہ زبان

فتراک : زین کا تسمہ

فتنہ : فساد

فغاں : آہ وزاری

فنا : نابودی

فوج : لشکر

قالب : جسم

قارن : ایران کا مشہور پہلوان

قضا : موت، تقدیر

قضارا : اچانک

قرنا : جنگی باجا

قصر : محل

قلزم : سمندر

قمر : چاند

کمیں گاہ : گھات لگانے کی جگہ

کذب : جھوٹ

کفن : مردے کا لباس

کلہ : خود

کونین : دونوں جہان

کہن : پرانا

کوس : جنگی ڈھول

کوہکن : پہاڑ کاٹنے والا

گبر : آتش پرست

گردوں : آسمان

گلزار : باغ

گلگشت : سیر

گماں : خیال

گور : قبر

گوشہ : کنارہ

لاریب : بے شک

لب : ہونٹ

لباس	:	پوشاک
لعیں	:	ملعون
لرزاں	:	کانپتا ہوا
ماتم	:	سوگ
مادر	:	ماں
مداح	:	تعریف کرنے والا
مدح	:	تعریف
مددگار	:	معاون
مرکب	:	سواری
مرحب	:	ایک مشہور جنگجو
مرغزار	:	سبزہ زار
مروت	:	رحم دلی
مژدہ	:	خوشخبری
مسیحا	:	حضرت عیسیٰ
مشرب	:	طریقہ
مشکیزہ	:	پانی کی مشک
مشیت	:	خدا کی مرضی
مضطر	:	بے قرار
معرکہ	:	جنگ
مقرر	:	تسلیم کرنے والا

مقدور : طاقت

مقصد : غرض

مکیں : رہنے والا

ملک : فرشتہ

محشر : قیامت کا میدان

مہتمم : منتظم

مہمیز : ایڑ

میخ : کیل

ناوک : تیر

نسب : نسل

نرغہ : چاروں طرف سے گھیراؤ

نرگس : ایک پھول

نشاں : علامت

نقارہ : جنگی ڈھول

نمودار : ظاہر

نور : روشنی

نیزہ : برچھا

ورود : آمد

وسواس : شک

وغا : جنگ

وصال	:	ملاپ
وقار	:	عظمت
ہستی	:	وجود
ہشیار	:	چوکنا
ہلال	:	چاند
ہیبت	:	رعب
ہما	:	ایک مبارک پرندہ
یارا	:	طاقت
یاقوت	:	قیمتی سرخ پتھر
یداللہ	:	حضرت علیؑ کا لقب
یرقاں	:	ایک بیماری
یلان	:	بہادر جنگجو

14.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

مرزا سلامت علی دبیرؔ کے مرثیہ نگاری کے فن پر تفصیل سے روشنی ڈالیں۔

" کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے " کے مرکزی خیال کی وضاحت کریں۔

مرثیے میں پیش کیے گئے جنگی مناظر کا جائزہ لیں۔

اس مرثیے میں شجاعت اور ایثار کے عناصر پر بحث کریں۔

دبیرؔ کی زبان و بیان اور فنی خصوصیات بیان کریں۔

مرثیے میں کردار نگاری کے فن کا جائزہ لیں۔

واقعہ کربلا کی عکاسی میں دبیرؔ کی کامیابی پر اظہارِ خیال کریں۔

اس مرثیے کے ادبی اور اخلاقی پہلوؤں کی وضاحت کریں۔

14.7 مشقی سوالات

1۔ مرزا سلامت علی دبیر کب پیدا ہوئے۔

2۔ مرثیہ " کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے" کا مرکزی موضوع بیان کیجیے۔

3۔ اس مرثیے میں حضرت عباسؑ کے کردار کی نمایاں خصوصیات بیان کیجیے۔

4۔ مرثیے میں شجاعت اور وفاداری کی عکاسی کس انداز میں کی گئی ہے؟

5۔ اس مرثیے کی زبان و بیان کی اہم خصوصیات تحریر کیجیے۔

6۔ مرثیے میں منظر نگاری کی چند نمایاں مثالیں بیان کیجیے۔

7۔ اس مرثیے میں صنعتِ تشبیہ اور استعارہ کے استعمال پر مختصر نوٹ لکھیے۔

8۔ واقعہ کربلا کے کس پہلو کو دبیر نے اس مرثیے میں زیادہ اہمیت دی ہے؟

9۔ اس مرثیے کی ادبی اور فنی اہمیت پر مختصر روشنی ڈالیے۔

10۔ اس مرثیے سے حاصل ہونے والے اخلاقی اور عملی اسباق بیان کیجیے۔

14.8 مشقی سوالات کے جوابات / جوابات سرگرمی

جوابات سرگرمی

1۔ ب۔ مرزا سلامت علی دبیر

2۔ ج۔ حضرت عباسؑ

3۔ ج۔ حضرت عباسؑ کی شجاعت اور وفاداری

4۔ ب۔ علمدار

5۔ ب۔پانی لانے کے لیے

6۔ ج۔مرثیہ

7۔ ج۔واقعہ کربلا

8۔ ب۔وفاداری اور شجاعت

مشقی سوالات کے جوابات

1۔ مرزا سلامت علی دبیر ۱۸۰۲۔دہلی میں پیدا ہوئے۔

2۔ اس مرثیے کا مرکزی موضوع حضرت عباسؑ کی شجاعت، وفاداری، ایثار اور واقعہ کربلا میں ان کی عظیم قربانی ہے۔

3۔ حضرت عباسؑ کے کردار میں بہادری، وفاداری، صبر، ایثار، اعلیٰ اخلاق اور حضرت امام حسینؑ سے بے مثال محبت نمایاں نظر آتی ہے۔

4۔ شاعر نے جنگی مناظر، رجز، تلوار، علم، گھوڑے اور دشمن کے خوف کی منظرکشی کے ذریعے حضرت عباسؑ کی شجاعت اور وفاداری کو مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔

5۔ اس مرثیے کی زبان فصیح، بلیغ، پرشکوہ، پراثر اور عربی و فارسی الفاظ سے مزین ہے، جبکہ اسلوب نہایت مؤثر اور خطیبانہ ہے۔

6۔ میدانِ کربلا، حضرت عباسؑ کی آمد، معرکہ جنگ، دریائے فرات، علم اور شہادت کے مناظر اس مرثیے کی بہترین منظرنگاری کی مثالیں ہیں۔

7۔ شاعر نے تشبیہ، استعارہ، تلمیح، مبالغہ اور پیکر تراشی جیسے ادبی محاسن کا نہایت خوبصورت استعمال کیا ہے، جس سے مرثیے کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔

8۔ دبیر نے حضرت عباسؑ کی وفاداری، علمداری، شجاعت، سقائی اور شہادت کو اس مرثیے میں خصوصی اہمیت دی ہے۔

9۔ یہ مرثیہ اردو مرثیہ نگاری کا ایک شاہکار ہے جس میں فنی مہارت، بلند تخیل، مؤثر منظرنگاری اور جذبات نگاری اپنی معراج پر نظر آتی ہے۔

10۔ اس مرثیے سے حق پر ثابت قدمی، وفاداری، ایثار، صبر، شجاعت، دین کی خاطر قربانی اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کا درس ملتا ہے۔

14.9 امدادی کُتب

ا۔ انتخابِ مراثی) انیس و دبیر (۔مرتبہ رشید حسن خان۔از مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔دہلی

۲۔ انتخابِ قصائدِ اُردو۔از ڈاکٹر ابومحمد سحر)مُرتّبہ

۳۔ انتخابِ قصائدومراثی۔سودا،ذوق،انیس اور دبیر۔ڈاکٹر چمن لعل بھگت۔قاسمی کتب خانہ جموں

۴۔ اُردو میں قصیدہ نگاری۔از ابومحمد سحر

۵۔ اُردو میں قصیدہ نگاری کی روایت۔ازمحمود الٰہی

۶۔ موازانہ انیس و بیر از شبلی نعمانی

۷۔ اردو مرثیہ کا ارتقا۔از ڈاکٹر مسیح الزمان۔

۸۔ اُردو قصیدہ نگاری۔اُم ہانی اشرف

۹۔ اُردو مرثیہ نگاری۔اُم ہانی اشرف

۱۰۔ انتخاب قصائدومراثی مع فرہنگ) سودا،ذوق،انیس،دبیر(۔ڈاکٹر چمن لال

Course Contributors and Content Editing:

1. **Dr. Chaman Lal**
Associate Professor,
Department of Urdu, University of Jammu

2. **Dr. Parshotam Paul Singh**
Assistant Professor in Urdu.
CDOE, Jammu

Content Editing/ Proof reading:

Dr. Parshotam Paul Singh
Assistant Professor in Urdu. CDOE, Jammu
CDOE, University of Jammu, Jammu 2025

© Centre for Distance & online Education, University of Jammu, 2026

* All rights reserved. No part of this work may be reproduced in any form, by mimeograph or any other means, without permission in writing from the CDOE, University of Jammu.
* The script writer shall be responsible for the lesson/script submitted to the CDOE and any plagiarism shall be his/her entire responsibility.

Printed By : Classic Printers/ 2026/50

CENTRE FOR DISTANCE & ONLINE EDUCATION
UNIVERSITY OF JAMMU

SELF LEARNING MATERIAL
FOR
M.A. URDU
SEMESTER - I
SESSION - 2025 ON WARDS

SUBJECT: QASIDA AND MARSIA	UNIT I-IV
COURSE CODE URD - 104	LESSON: 1-14

PROF. (DR.) SHOHAB INAYAT MALIK
COORDINATOR P.G. URDU

DR. PARSHOTAM PAUL SINGH
TEACHER INCHARGE

http:/www.distanceeducationju.in
Printed and published on behalf of the centre for Distance & Online Education, University of Jammu by the Director, CDOE, University of Jammu.